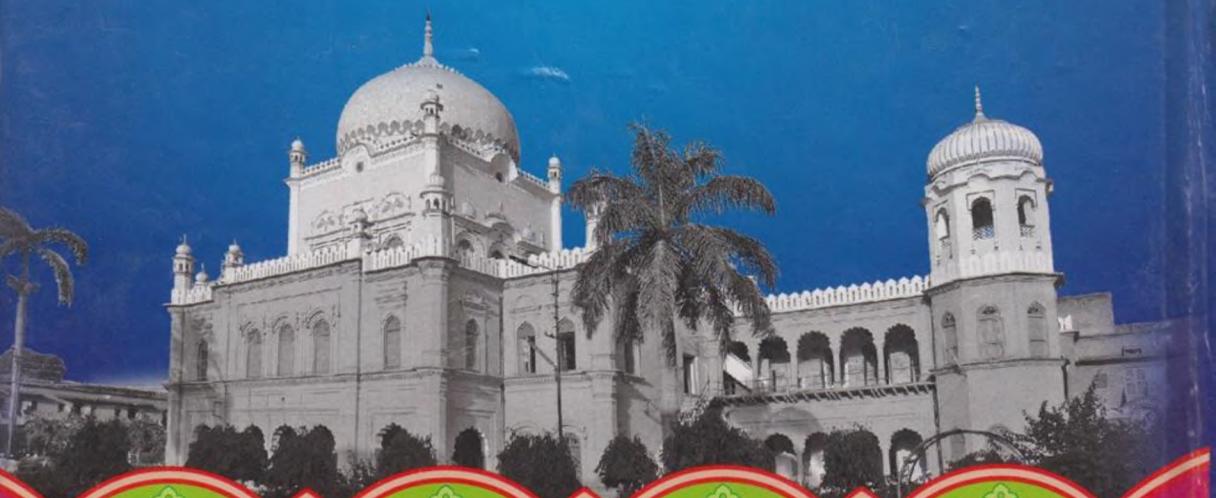




وَمِنْهُمْ شُوَّدَّىٰ بَلِينَهُمْ

سُوریٰ کی شرعی حیثیت



تألیف

حجت‌الملأ ناریائست می احمد بن جنوری

شیخ‌الہند کیدمی دار العلوم دیوبند

حضرت مولانا ریاست علی ظفر بجنوری قدس سرہ ایک نظر میں

مرتبہ: مولانا محمد مرتضی اسعدی (ناظم شعبہ اوقاف دارالعلوم دیوبند)

نام	: ریاست علی
والد کا نام	: منتی فراست علی
وطن	: قصبه جبیب والا، ضلع بجنور، یوپی
ولادت	: ۹ مارچ ۱۹۲۰ء مطابق ۲۸ محرم ۱۳۵۹ھ شنبہ، مقام محلہ حکیم سرائے علی گڑھ
ابتدائی تعلیم	: حبیب والا میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۵۲ء میں حبیب والا کے پرانگری اسکول سے درج چہارم پاس کیا۔
دارالعلوم میں آمد	: ۱۹۵۳ء مطابق ۱۳۷۳ھ عمر ۶ چودہ سال
فراغت	: ۱۹۵۸ء مطابق ۱۳۷۸ھ
متاز اسنادہ کرام	: حضرت مولانا فخر الدین صاحب مراد آبادی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، حضرت مولانا سید فخر الحسن صاحب امروہی، مولانا بشیر احمد خاں صاحب بلند شہری، حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب، حضرت مولانا ظہور احمد صاحب، حضرت مولانا سید حسن صاحب دیوبند قدس سرہم وغیرہ
دارالعلوم میں تقرر	: ۱۹۷۱ء مطابق ۱۳۹۱ھ میں درجہ ابتدائی میں تقرر ہوا۔ ۱۹۷۶ء مطابق ۱۳۹۶ھ میں وسطی ب میں ترقی ملی، ۱۹۸۲ء مطابق ۱۴۰۲ھ میں وسطی الف میں ترقی پائی، ۱۹۸۳ء مطابق ۱۴۰۳ھ میں درجہ علیا میں ترقی دی گئی۔
مناصب	: نبیجر الجمیعہ پریس دہلی، ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کی ادارت، نائب ناظم مجلس تعلیمی پھر ناظم مجلس تعلیمی، ڈائریکٹر شیخ الہندا کیڈیمی، بنیات اہتمام، رکن مجلس عالمہ جمیعۃ علماء ہند، نائب صدر جمیعۃ علماء ہند
تصانیف و تالیفات	: ایضاً الحخاری، شوریٰ کی شرعی حیثیت نگہہ سحر (مجموعہ کلام)
وفات	: ۲۰ ربیعی ۱۴۰۱ء مطابق ۲۲ ربیعہ شعبان ۱۳۳۸ھ شنبہ
تدفین	: قبرستان قاسمی میں مدفن عمل میں آئی
پسماندگان	: تین صاحزادگان (۱) مولانا محمد سفیان قاسمی (۲) مولانا محمد عدنان قاسمی (۳) مولانا محمد سعدان قاسمی



وَإِنْ هُوَ إِلَّا بِهِ يَرْجَى
وَإِنْ هُوَ إِلَّا بِهِ يَرْجَى

شوریٰ کی شرعی حیثیت

جس میں شوریٰ کی شرعی حیثیت کے خلافہ سلاطین اور دیگر امرا کے ساتھ شوریٰ کی نسبت کثرت رائے کے ذریعہ فیصلے، مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، و جمیعتین اور وقف کے موضوع نیز دیگر ضمنی مسائل پر معتبر حوالوں پر ساتھ مدلل اور سییر چال بحث کی گئی۔

حضرت مولانا ریاستی صاحب بخنزوری

مکتبہ خلیلیت
راجہپور مارکیٹ، اردو بازار 〇 لاہور



نام کتاب شورایہ کی شرعی حیثیت
 مؤلف مولانا ریاست علی بخوری استاذ حدیث و
 ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند
 صفحات چار سو آٹھ
 سن اشاعت مارچ ۱۹۸۷ء
 تعداد اشاعت گیارہ سو

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری

اور ان کی کتاب 'شوری کی شرعی حیثیت' کا ایک جائزہ

محمد اللہ خلیل قاسمی

حضرت مولانا ریاست علی صاحب بجنوری رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین، نکتہ رس محدث، باصلاحیت استاذ، بے مثال ادیب و شاعر اور گوگول خوییوں کے مالک تھے۔ تقویٰ و دیانت داری، رافت و رحمت، ذکاوت و ذہانت، اصابت رائے و معاملہ بخی، مہمان نوازی و غریب پروری اور حسن اخلاق و تواضع آپ کی نمایاں خصوصیات تھیں۔ آپ کے انتقال سے دارالعلوم کی علمی و فکری تاریخ کا ایک باب بند ہو گیا۔

حضرت مولانا کی تدریسی زندگی پینٹا لیس برسوں پر محیط ہے۔ آپ نے ہزاروں طالبان علوم اسلامیہ کی علوم ثبوت کی روشنی سے منور کیا۔ آپ کا درس بہت مریوط، عام فہم، سبک رفتار اور مقبول ہوتا تھا۔ تدریس کے ساتھ ساتھ ماہنامہ دارالعلوم کی ادارت کی ذمہ داری بھی انجام دی اور شیخ الہند اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی مقرر کیے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں آپ کو مجلس شوریٰ نے مجلس تعلیمی کا ناظم (ناظم تعلیمات) مقرر کیا، اس منصب پر آپ پانچ سال تک فائز رہے۔ دارالعلوم میں آپ کا دور نظامت بہت مشاہی تھا۔ نازک حالات میں دارالعلوم کے تعلیمی نظام کو سنبھالا دیتا اور اسے ترقی کی بلندیوں پر پہنچانا آپ کا تاریخی کارنامہ ہے۔ حضرت مہتمم صاحب وغیرہ ذمہ دار ان کی غیر موجودگی میں اکثر آپ کو تاقم مقامی یا نیابت اہتمام کے فرائض انجام دینے پڑتے۔ مجلس شوریٰ نے آپ کو مستقل طور پر نائب مہتمم کے عہدہ کی پیش کی لیکن انہوں نے معدتر طاہر کی۔ گزشتہ چالیس سالوں کے دوران انہوں نے دارالعلوم کی انتظامیہ کو اپنے صائب مشوروں اور بروقت رہنمائی سے بڑی طاقت بخشی۔ اسی لیے بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ آپ جدید دارالعلوم کے معماروں میں تھے۔

حضرت مولانا ریاست علی بجنوری کا تصنیفی یادگاریں

تدریسی و انتظامی ذمہ داریوں کے ساتھ آپ نے اہم علمی و تصنیفی سرمایہ بھی چھوڑا۔ ایضاً الحماری آپ کے اعلیٰ ولی وادیٰ ذوق کا شاہ کارہے اور اردو کی شروع بخاری میں متاز حیثیت رکھتی ہے۔ آپ نے اصول فقہ کے موضوع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ مشترک طور پر 'تسہیل الاصول' لکھی جو دارالعلوم میں سال چاراں میں داخل درس ہے۔ اسی طرح 'مقدمہ تفسیر اقرآن کا تحقیقی و تقدیمی جائزہ' مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہو چکی ہے۔ اخیر زمانے میں حضرت مولانا علام محمد اعلیٰ الحناوی کی مشہور آفاق کتاب 'کشف اصطلاحات الفنون' پر مولانا عارف جیل صاحب مبارک پوری کے ساتھ تحقیقی کام بھی کیا جو پایہ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح ہونہار شاگردوں کی مدد سے خلاصۃ التفاسیر (مؤلف مولانا فتح محمد تابع لکھنؤی، متوفی ۱۳۲۷ھ/۱۹۰۹ء) کی تدوین و تحقیق کام انجام دیا۔ یہ دونوں اہم کتابیں عقربیب مظفر عالم پر آنے والی ہیں۔

آپ علم و عمل میں بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ شعرو ادب میں اعلیٰ ذوق کے حوال تھے جس کا زندہ ثبوت دارالعلوم دیوبند کا شہرہ آفاق ترانہ ہے جو ایک لازوال ادبی شہبہ پارہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ شاعری میں ظفر خاص فرماتے تھے۔ آپ کا مجموعہ کلام 'نغمہ سحر' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ آپ کا کلام ضمانت اور قامت میں کہتر ہونے کے باوجود قدر و قیمت کے اعتبار سے بہت بہتر ہے۔ کوش و تنسیم سے دھلی ہوئی زبان اور سلیس و روائیں کلام کا یہ مختصر مجموعہ بھی آپ کو منتد شعراء کی صفائح میں شمار کرنے کے لیے کافی ہے۔ اسی طرح مولانا محمد عثمان کا شف الباشی کا شعری مجموعہ بھی آپ کی کاوشوں سے مظہر عام پر آیا۔

”شوری کی شرعی حیثیت، شاندار تحقیقی کارنامہ“

”شوری کی شرعی حیثیت، حضرت مولانا کی نہایت اہم تصنیف ہے جو اپنے موضوع پر اسی اچھوتی، بسیط اور مدلل کتاب ہے جس سے کتاب خانے خالی ہیں۔ یہ کتاب اول ۱۹۸۰ء مطابق ۱۴۰۰ھ میں حضرات اکابر (حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی، حضرت مولانا غوب الرحمن صاحب بجوری سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مسراج الحق صاحب سابق صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا نصیر احمد خان بلندشہری سابق شیخ الحدیث و صدر المدرسین دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا فاضلی اطہر مبارک پوری رحیم اللہ) کی تقریبات و تصدیقات کے ساتھ شائع ہوئی اور اب بھی مکتبہ دارالعلوم سے شائع ہو رہی ہے۔ اس وقت میرے سامنے محرم الحرام ۱۴۲۵ھ مطابق نومبر ۲۰۱۳ء کا ایڈیشن موجود ہے جو چار سو آٹھ (صفحات) پر مشتمل ہے۔

حضرت مولانا کی یہ کتاب مدارس عربیہ کے نظام کار، ان کے دستور اساسی، رجڑیش، وقف اور دینگر تمام امور و معاملات میں شوری کی شرعی حیثیت کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں مدارس اسلامیہ کی مجالس شوری، اہتمام، مالیت اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں شرعی احکام مفصل اور محقق طور پر بیان کیے گئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند میں ۱۹۸۰ء کے بعد مہتمم اور مجلس شوری کے درمیان شدید اختلاف پیدا ہوا، جس کی وجہ سے بعض حلقوں کی طرف سے ایک نیا مسئلہ بروی شدت کے ساتھ اٹھایا گیا کہ ان مدارس کی مجلس شوری اور ان کے مہتمم کی باہمی حیثیت کیا ہے؟ نیز مدرسہ کے مہتمم اور مدرسہ کی مجلس شوری کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے، ان میں سے کون حاکم ہے اور کون حکوم، بعض جگتو شوری نے مہتمم کو اتنا پابند کر دیا ہے کہ وہ کوئی کام شوری سے پوچھے بغیر نہیں کر سکتا، اور نہ شوری اس کے لیے کوئی ضابطہ بناتی ہے کہ جس کے تحت مہتمم کام کر لیا کرے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔ بعض جگہ مہتمم نے شوری کو بالکل ہی بے حیثیت کر دیا ہے اور خود مختاری کا پورا پورا اعلان کر دیا ہے کہ کسی کام میں شوری سے پوچھنے اور معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ شوری ہی پرکار اور کا عدم ہے۔ دارالعلوم کے اختلاف کے پس مختصر میں حضرت مولانا نسیح اللہ علیہ نے ایک رسالہ رحمۃ اللہ علیہ اہتمام و شوری کلکھا جس میں مہتمم کو اصل اور شوری کو تابع قرار دیا گیا اور دارالعلوم کے دستور اساسی کو غیر شرعی بتایا گیا۔

چنان چہ دارالعلوم دیوبند نے صورت حال کی زناکت پیش نظر اس موضوع کی تحقیق و تفییق کے لیے حضرت مولانا کا انتخاب کیا۔ حضرت مولانا نے نہایت تحقیق و تلاش سے ان مسائل پر کتاب و سنت، فقہ و فتاویٰ اور علمائے کرام آراء و اقوال کے قدیم و جدید مأخذ کو خنکھاں کر نہایت سنجیدہ اور باوقار کتاب مرتب کی۔ مولانا نے موضوع کے متعلق تمام گوشوں کو فتحی عبارات سے مدل کیا اور ہر جگہ ایسی دل نشیں گنگوہی کی ہے کہ مسئلہ پر شرح صدر ہو جاتا ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مؤلف کو مضامین کی ترتیب اور بسط دلائل میں خصوصی درک حاصل تھا۔ پوری کتاب اتنی ممتاز اور سنجیدگی سے کامی گئی ہے کہ کہیں مجادلانہ یا ادعائی تھی کہ جیسا نہ اندراز بھی نہیں اپنایا گیا، بلکہ زیر بحث مسئلہ کا صرف معرضی جائزہ لیا گیا۔

اس کتاب میں اولاً مدارس عربیہ کے نظام کار کی تشریع کی گئی ہے اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں یہ واضح کیا گیا ہے مدارس عربیہ کے عہدہ داروں میں کس منصب کی کیا شرعی حیثیت ہے۔ پھر شوری کا شرعی مقام واضح کیا گیا ہے۔ شوری کا مسئلہ چوں کہ اس تحریر کا بنیادی نقطہ بحث تھا اس لیے اس موضوع کے تمام پہلوؤں کا مبسوط جائزہ لیا گیا ہے اور بتالیا گیا ہے کہ عبد رسالت اور خلافت راشدہ میں شوری کا طرز عمل اور دائرہ کار کیا تھا۔ پھر قرآن و حدیث اور فقہ اسلامی میں شوری کے لیے پائی جانے والی حقیقتوں کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بات پوری طرح واضح اور ثابت کردی گئی ہے کہ مدارس عربیہ میں شوری کی بالادستی شہبے بالادست ہے۔ ان خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے درمیان، شوری کی بالادستی کا انکار کرنے والے نقطہ نظر کے دلائل کا بھی پوری سنجیدگی سے جائزہ لیا گیا گیا ہے جس سے غلط فہمیوں کے ازالہ میں پوری مدد ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ مدارس کے دستور اساسی اور سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجڑیش کے مسئلہ کو بھی متعین کیا گیا ہے۔ رجڑیش پر کیے جانے والے اعتراضات جائزہ لیا گیا ہے۔

ای سلسلہ کا دوسرا اہم مسئلہ یہ تھا کہ یہ مدارس فقہائے کرام کی اصطلاح کے مطابق وقف میں یا وقف نہیں ہیں۔ حضرت مولانا نے اس کتاب میں مسئلہ وقف کو خوب وضاحت سے بیان کیا ہے کہ کن شرائط کے ساتھ وقف صحیح ہوتا ہے؛ مدرسہ کی ہر چیز کو وقف کہا جاسکتا ہے اور نہ ہر چیز کے وقف ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ جو جائز وغیرہ فقہی ضابط کے تحت وقف ہے اس پر وقف کے احکام لاگو ہوں گے کہیج وغیرہ کے ذریعہ اس کی ملکیت کی کو منتقل نہیں کی جاسکتی اور ان کی حفاظت پوری طرح واجب ہوگی۔ لیکن جو اشیاء فقہی قاعدہ کے تحت وقف نہیں، بلکہ ملک مدرسہ میں داخل ہیں، ان پر وقف کے احکام نافذ نہیں ہوں گے، البتہ مدرسہ کی ضروری ایسی کسی چیز کو اپنی ذاتی ملک قرار دینے کا مجاز نہیں۔ اس کتاب سے آپ کی فقیہانہ شان نمایاں ہوتی ہے جو عمومی طور پر لوگوں کو پر اشکار نہیں تھی۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضرت مولانا فتحی محمود حسن گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ بالاستیغاب پڑھ کر سنائی اور ان حضرات اکابر کے مشوروں کے مطابق اس میں حکم و فکر کیا۔ اس کے بعد اس کتاب کی نقول کو متعدد اہل علم (حضرت مولانا منظور احمد نجمانی و حضرت مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی رحمہما اللہ تعالیٰ ارائیں مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند) اور اساتذہ دارالعلوم (حضرت مولانا فتحی، حضرت مولانا سید احمد پالن پوری اور حضرت مولانا جیب الرحمن اعظمی تاسی مدظلہم العالی) کو پیش کی جس کو ان حضرات نے ملاحظہ فرمایا پہنچنے تو نوٹس لکھے۔ اس کے بعد مجلس مناقشہ منعقد کی گئی اور بتاؤلہ خیالات کے بعد اصلاحات کی گئیں۔ حضرت مولانا محمد عثمان کاشف الباطشی اور حضرت مولانا حکیم عزیز الرضا عظی رحمہما اللہ تعالیٰ اس کتاب کی کاپی پیش کی گئی اور انھوں نے بھی اس پر کمل اعتناد کا اظہار فرمایا۔ حضرت مولانا ناریاست علی بجوری رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں ان تمام حضرات کا ذکر کیا ہے جن سے انھوں نے اس کتاب کی ترتیب کے دوران استفادہ، بتاؤلہ خیالات یا اور کسی طرح کی مددی، حتیٰ کہ انھوں نے خوردوں کے تعاون کا بھی بہت فراخ دلی کے ساتھ کا اظہار کیا ہے جو آپ کے اعلیٰ اخلاق کی واضح دلیل ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں حضرت نے جہاں فقیر و حدیث اور فقہ اسلامی کے اہم اکتب سے استفادہ کیا ہے وہیں کچھ معاصر اور ماضی قریب کے اہل علم کتابوں سے بھی استفادہ کیا ہے جیسے حضرت مولانا عبدی اللہ سنہ ۱۹۷۳ رحمۃ اللہ علیہ کی التہمید الائمه، التجدیدیہ اور موافق المترشدین، شیخ عبدالواہب خلاف کی اصول الفقہ، شیخ محمد حضری بک کی اصول الفقہ اور تاریخ المتصارع لیل الاسلامی، شیخ ابو زہرہ مصری کی اصول الفقہ اور تاریخ المذاہب الاسلامیہ اور قدیم تأخذ میں لا حکام السلطانیہ (مؤلف شیخ ابو الحسن علی بن جیب الریاضی المادروی متوفی ۹۰۵ھ)، لا حکام السلطانیہ (مؤلف قاضی ابو یحیی الفراء، متوفی ۹۲۵ھ)، املاقات اور الاعظام (شیخ ابو سحاق الشاذلی الغزنی ایل التوفی ۹۰۷ھ)، جامع الرموز (مؤلف شیخ شمس الدین محمد خراسانی فہمانی متوفی ۹۶۹ھ)، کشف الاسماء (مؤلف علامہ عبد العزیز بخاری متوفی ۹۳۰ھ) وغیرہ۔ مراجع کی فہرست میں ۹۵ (چنانے) کتابوں کا ذکر موجود ہے۔

شوریٰ کے نظام کی اہمیت اور اس کی عصری معنویت

خیر القرون میں منصب خلافت سے لے کر ماتحت امارتوں تک مناصب کی تسمیہ، امور کی تنفیذ و تحلیل کا معاملہ و امر ہم شوریٰ یعنیہم کی اساس پر قائم رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بنیاد کمزور ہوتی چل گئی اور اسلامی حکومت میں شورائیت اور الہیت کی جگہ دراثت کا عمل جاری ہو گیا۔ خیارات اور علمائے کرام نے روز اول ہی سے اس غلطی کا ادراک کر لیا تھا، انھوں نے اس کی اصلاح کی کوششیں بھی کیں، لیکن اسلامی حکومتیں دراثت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ بہر حال علمائے کرام مسلمانین کے خلاف کام کرنے کے بجائے شورائیت کے واجب کلایا کو پہنچنے علم و حکمت کے بستاؤں میں لا گوکیا اور شوریٰ کی بالادستی و سرپرستی کا عمل جاری کیا۔ حضرات علمائے کرام نے شوریٰ کی زیر کرداری میں علوم و فنون کی جوگراں قادر خدمات انجام دی ہیں وہ اسلامی کتب خانے کی صورت میں موجود ہیں۔ جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم رہیں علمائے کرام اپنی پسندیدہ روشن پر قائم رہے، انھوں نے مسلمانین سے کوئی سروکار نہیں رکھا اور شوریٰ کے ذریعہ

کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے غیر منصوص مسائل کے شرعی احکام کو مدد و ان کرتے گئے اور علوم اسلامی کا ایک قابل قدر زخیرہ جمع کر دیا۔

ہندوستان میں مسلم حکومت کی تحلیل کے بعد جب مدارس اور دینی مرکز سے اقتدار اسلامی کی سرپرستی ختم ہو گئی تو انہوں نے ملت اسلامی کی بنا تو تحفظ کی خاطر مدارس اسلامیہ کا نظام مرتب کیا۔ اکابرین نے اس نظام کو شوریٰ کی بنیاد پر استوار کیا۔ یہ دیدہ و روزگار نگاہ اکابر اسلامی تعلیمیات، اس کے مزان و مناق اور مقاصد شریعت کے سلسلہ میں خدا وادی بصیرت اور زہد و تقویٰ کی صفات سے مزین تھے۔ انہوں نے اس نظام میں شوریٰ کو دینی مقام دیا جس کی وجہ تھی۔

یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کی تاریخ میں ایسا بھی نازک موقع آج ہب سرپرست دارالعلوم (حکیم الامت حضرت مولانا شرف تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) اور مجلس شوریٰ کے درمیان اس طرح کا مسئلہ پیش آیا اور دیانت و امانت کے اس عبد زریں میں اکابر نے عملی طور پر اس قضیہ کو اس طرح حل کر دیا کہ سرپرست نے شوریٰ کے سامنے اپنا استعفای پیش کر دیا جو شوریٰ کی بالادستی کے اعتراض کے ساتھ اختلاف کو ختم کرنے کا ایک نہایت کامیاب اور قابل تقلید حل تھا۔ کاش کر اسی عملی نمونہ کی دیگر موقع پر بھی پیروی کی گئی ہوتی تھی دارالعلوم بہت بڑی آزمائش سے پیٹ گیا ہوتا، لیکن ماشاء اللہ کان و مالام یشا لم یکن و ہو الحکیم الخیر۔

دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کے طالب علم کو صاف طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ دارالعلوم کی نمایاں خصوصیات میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں؛ ایک دارالعلوم کا عوامی چندہ کاظم قائم کرنا، اس کو شکم اور منظم کرنا، دوسرا مدرسہ کو مجلس شوریٰ کے تحت قائم کرنا۔ جمیع الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصول ہستگانہ میں بھی یہ دونوں خصوصیات بہت نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ یہ دونوں عناصر در اصل تحریک مدارس کی روح ہیں اور ان بنیادوں میں کمزوری دور سے یہ نظام کمزوری اور لا تأونیت کی نذر ہو جائے گا۔ ان خصوصیات سے بانیان دارالعلوم کی دور بینی و تشریف نگاہی کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ بنیادوں میں جمیوری دور کی آمد کی آہت انہوں نے کتنی پہلی بھروسہ کر لی تھی اور جمیوری بنیادوں پر اسلامی اداروں کو قائم کر کے دنیا کے سامنے بہترین نمونہ بھی پیش کر دیا تھا۔

شوریٰ کا یہ نظام ہندوستان جیسے ملک میں مسلمانوں کے لیے کی نعمت عظیٰ سے کم نہیں۔ یہ کتاب اہل مدارس کے لیے بہت کام کی ہے، اگر ارکان شوریٰ اور نظماء و مہتممین حضرات شرعی حدود میں رہ کر مدارس کے نظم و نسق کو چلا کیسی تو ان کے مابین ناگوار و اتعاب نہیں پیش آئیں گے۔ آج کے پرفت اور ہوا نے نفسانی کے غلبہ کے دور میں اداروں اور جماعتوں کو شخص واحد کی امارت و فیض میں دینے اور بڑی بڑی جماعتوں اور ظیم الشان اداروں میں عملی طور پر وراثت کی روایت پڑنے کی صورت میں با اختیار اور بیعت حاکم کی حیثیت رکھنے والی مجلس شوریٰ قیام اور اس کے ذریعہ طے شدہ بدلایات پر عمل بہت سے قتوں اور مکر و بہات سے حفاظت کی ضمانت ہے۔

اگرچہ یہ کتاب ایک وقتی ضرورت اور عارضی حالات کے پس منظر میں لکھی گئی، لیکن اس کے مضامین میں بڑی آفاقیت اور وسعت ہے۔ یہ موضوع اس وقت جتنا اہم اور ضروری تھا، آج اس کی ضرورت و اہمیت دوچند ہو گئی ہے؛ کیوں کہ ایک طرف مدارس کو خارجی قتوں کا سامنا ہے اور دوسری طرف بہت سی داخلی کمزوریاں اس نظام میں درآئی ہیں:

فرد را بیرونی جماعت رحمت است	جو بہر او را کمال از ملت است
تاتوانی با جماعت یار باش	رونقِ ہنگامہ احرار باش
حرزِ جان کن گفتہ خیر البشر	بہت شیطان از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینہ یک دیگر ند	سلک و گوہر کہکشان و اخترند
فرد می گیرد ز ملت احترام	ملت از افراد می یابد نظام (رموز بے خودی، علامہ اقبال)

فہرست مَضَا میں

صفحہ	مضَا میں	نمبر شمار
۲۲	فہرست، تصدیقات اکابر، پیش نفظ، مقدمہ	۱
۲۸	پندوستان اقتدار اسلامی کے زوال کے بعد	۲
۳۲	دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت	۳
۳۵	مجلس شوریٰ کی تشکیل دارالعلوم سے پہلے ہے۔	۴
۳۹	چندہ پر چلنے والے مدارس میں شوریٰ کی اہمیت	۵
۴۵	مجلس شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں جماعت اسلام حضرنا نوتوی کی تحریر	۶
۴۸	حضرت مولانا رفیع الدین حبہ، مہتمم دوم کی تحریر	۷
۵۱	حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کی تحریر	۸
۵۳	شیعہ اسلام حضرت مولانا سید جین احمد صنادلی کی تحریر	۹
۵۶	دستور اساسی کی تدوین کا طریقہ	۱۰
۵۹	زیر بحث موضوع کے تجزیہ کی صحیح بنیاد میں	۱۱
۶۳	آیت پاک میں اولو الامر سے کیا مراد ہے۔	۱۲
۷۰	اولو الامر کا مصدق فرد جماعت دونوں ہو سکتے ہیں۔	۱۳
	خلاصہ بحث	۱۴
۸۳	اولو الامر کے درمیان فرق مراتب کی تفصیل۔	۱۵

نمبر شمار	مضامین	مکالمہ
۱۶	الاحکام السلطانیہ کے پہلے باب کا خلاصہ	۸۲
۱۷	تمام امراء پر نگرانی قائم کرنے کی صراحت	۹۶
۱۸	خلاصہ بحث	۹۸
۱۹	اسلام میں شوری کا مقام	۱۰۲
۲۰	شوری کے لغوی معنی	۱۰۳
۲۱	مشورہ کی اہمیت عقل ان کی نظر میں	۱۰۴
۲۲	مشورہ شریعت کی نظر میں	۱۰۵
۲۳	قرآن کریم میں شوری کا حکم تفصیل پر مشتمل نہیں۔	۱۰۸
۲۴	اجمالی احکام کی چند نظریں۔	۱۱۰
۲۵	شوری کے احکام بھی تفصیل نہیں ہیں۔	۱۱۲
۲۶	حضرت بریرہؓ کا واقعہ	۱۱۷
۲۷	شوری پر اجسامی تبصرہ	۱۲۲
۲۸	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم۔	۱۲۷
۲۹	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کے مقاصد۔	۱۳۰
۳۰	حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کے مزید فائدے۔	۱۳۳
۳۱	عزم کے بازے میں علماء تفسیر کے ارشادات	۱۳۷
۳۲	اصول فقہ کی روشنی میں۔	۱۵۳
۳۳	آیت پر اصول کا اجزا اور پہلے مضمون پر استدلال	۱۵۷

نمبر شمار	صفحہ	مصنف این
۳۴	۱۵۹	دوسرے مضمون پر استدلال۔
۳۵	۱۶۰	تیسرا اور چوتھے مضمون پر استدلال۔
۳۶	۱۶۲	حاصل کلام۔
۳۷	۱۶۴	رسول کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق۔
۳۸	۱۶۳	عہد رسانی میں مشورہ طلب سائل اور فیصلہ کا طریقہ۔
۳۹	۱۶۹	زیر بحث موضوع سے متعلق امام بخاری کا ترجمۃ الباب۔
۴۰	۱۹۰	کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا طریقہ۔
۴۱	۱۹۱	امام ابو بکر جصاص کا ارشاد۔
۴۲	۱۹۳	مفہیم قرآن قاضی بیضاوی کا ارشاد
۴۳	۱۹۶	علامہ شاطبی کے ارشادات
۴۴	۲۰۱	کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے قابل اعتماد طریقے
۴۵	۲۰۳	خلافتِ راشدہ میں مشورہ کی نوعیت
۴۶	۲۰۴	حضرت ابو بکر صدیق کا عہد خلافت
۴۷	۲۰۸	حضرت ابو بکر کے عہد خلافت کے چند واقعات کی صحیح تصوری
۴۸	۲۱۶	حضرت عمرؓ کا عہد خلافت
۴۹	۲۲۰	خطیفہ کے انتخاب کیلئے حضرت عمرؓ کی سات نفری مجلس شوریٰ۔
۵۰	۲۲۶	سلطین پر شوریٰ کی بالادستی قرآن میں۔
۵۱	۲۳۲	سلطین پر شوریٰ کی بالادستی حدیث میں

نمبر شمار	صفا میں	صف
۵۲	سلاطین پر مجلس شوریٰ کی بالادستی کی مزید تصریحات	۲۳۸
۵۳	ماتحت امرار کے حق میں مجلس شوریٰ کی بالادستی	۲۴۲
۵۴	ایک ہی شخص کے امیر اور مامور ہونے کی وضاحت	۲۴۸
۵۵	مشورہ طلب مسائل کیا ہیں؟	۲۵۰
۵۶	ایک کام کیلئے ایک سے زائد افراد کی ہدایت مجموعی کا حکم	۲۵۶
۵۷	اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا طریقہ	۲۵۹
۵۸	کثرت رائے بھی فیصلے کا ایک طریقہ ہے۔	۲۶۲
۵۹	کثرت رائے قرآن میں	۲۶۲
۶۰	کثرت رائے حدیث میں	۲۶۴
۶۱	ایک غلط فہمی کا ازالہ	۲۶۴
۶۲	مشورہ کے باب میں عہد رسالت کے طریقہ کاری و نہادت	۲۶۹
۶۳	کثرت رائے خلافتِ راشدہ میں	۲۸۲
۶۴	کثرت رائے نقیباء کی نظر میں	۲۹۲
۶۵	مجلس شوریٰ میں امیر کی رائے کا درجہ	۲۹۵
۶۶	حضرت حکیم الامم کے نقطہ نظر کی وضاحت	۲۹۸
۶۷	دستور اساسی	۳۰۹
۶۸	عدالتی مرافوں میں حبسریشن کی اہمیت	۳۱۲
۶۹	حبسریشن پر کئے گئے اغترافات کا جائزہ	۳۱۹

مضامین

نمبر شمار

صفحہ

۳۱۹	سوسائٹی ایکٹ کی بعض و فعات کا ترجمہ	۷۰
۳۲۸	وقف اور دیگر املاک	۷۱
۳۲۸	وقف کی تعریف	۷۲
۳۲۹	وقف میں مالک کی ملکیت کے ازالہ کی شرطیں	۷۳
۳۳۲	وقف کی شرائط	۷۴
۳۳۶	وقف کے الفاظ	۷۵
۳۴۵	مدرسہ یا مسجد کی ملکیت	۷۶
۳۴۸	مدرسہ اشرف العلوم کا پنور کی جائیدار کے سلسلے میں علماء کے قتوں کی سداد طین کی جانب سے دی جانیوالی جائیداریں وقف نہیں۔	۷۷
۳۵۲	ہندوستان کے مدارس غربیہ	۷۸
۳۶۰	مدرسہ کی املاک کا حکم	۷۹
۳۶۶	ضیمہ — از حضرت مولانا مفتی محمد بن حمادہ ترظیۃ	۸۰
۳۶۹	ما خذ و مراجع	۸۱
۳۷۳		۸۲

تصدیقات اکابر

فقیہ العصر حضرت مولانا فقیٰ محمود حسن ضالنگوہی امانت ہم
 خلیفہ خاص شیخ الحلة حضرت مولانا محمد ذکریا صاحب قادر ترہ
 مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند
 نَحْمَدُهُ وَنُصَيِّلُ عَلَى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

پچھی دست سے بعض دینی مدارس میں ایک مسئلہ پیدا ہوا ہے کہ مدرس کے مہتمم اور
 مدرس کی شوریٰ کے درمیان کس نوع کا تعلق ہے ان میں سے کون حاکم ہے کون مکوم
 بعض جگہ تو شوریٰ نے مہتمم کو آتنا پابند کر دیا ہے کہ وہ کوئی کام شوریٰ سے پوچھے بغیر
 نہیں کر سکتا چھوٹی بھیزی میں بھی اس کو سخت و شواری پیش آتی ہے شوریٰ نہ
 اس کیلئے کوئی ضابطہ بناتی ہے جس کے تحت مہتمم کام کر لیا کرے نہ ہر ضرورت کی
 وقت پر منظوری دیتی ہے۔

بعض جگہ مہتمم نے شوریٰ کو بالکل ہی بے حیثیت کر دیا ہے اور خود مختاری
 کا پورا پورا اعلان کر دیا ہے کہ کسی کام میں شوریٰ سے پوچھنے اور معلوم کرنے کی
 ضرورت ہی نہیں بلکہ شوریٰ ہی بیکار اور کالعدم ہے۔ آئئے دن اس کے متعلق
 سوالات آتے رہتے ہیں اور حسب سوال جواب بھی تحریر کر دیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ
 حضرت مولانا ریاست علی صاحب مدرس و ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کو جزاً غیر عطا فرمائے

کر انہوں نے اس موضوع کے ہر گوشے کو واضح فرمادیا اور فقہی عبارات سے مدد تسلی بھی کر دیا ہے۔ جس سے علماء بھی پوری طرح مستفید ہو سکتے ہیں نیز مسئلہ وقف کو بھی خوب وضاحت سے بیان فرمادیا ہے۔ کہ کن شرائط کے ساتھ وقف صحیح ہوتا ہے۔ مدرس کی ہر چیز کو ز وقف کہا جاسکتا ہے نہ ہر چیز کے وقف ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ جو جایزاد وغیرہ فقہی ضابط کے تحت وقف ہے اس پر وقف کے احکام جاری ہوں گے کہ اس کو زیع وغیرہ کے ذریعہ کسی کی ملک قرار نہیں دیا جاتے گا۔ اس کی حفاظت پوری طرح واجب ہوگی۔ اور جو اشیاء فقہی قاعدہ کے ماتحت وقف نہیں ملک مدرسہ ضرور ہیں۔ ان پر وقف کے احکام نافذ نہیں ہوں گے۔ البتہ مدرسہ کی ضروریات ان سے پوری کی جائیں گے مہترم یا شوریٰ کوئی بھی ایسی اشیاء کو اپنی ذاتی ملک قرار دینے کا مجاز نہیں۔ اس طرح اور بھی اہم امور اس تحریر میں آگئے۔ احقر نے پورا مضمون سن لیا ہے اور کہیں کہیں مشورہ بھی دیا ہے۔ مؤلف زید مجده نے اسکو قبول بھی فرمایا ہے۔ خدا نے پاک اس کو نافع بنائے اور اس کے ذریعہ دینی مدارس کی الجھنوں کو دور فرماتے۔ اور مؤلف مذکور کے علم و عمل میں اور اخلاق میں برکت عطا فرمائے

فقط

املہ العبد محمود غفرلہ

چھٹے مسجد وارالعلوم دیوبند

۲۱ صفر ۱۴۰۸ھ

اسْتَادُ الْعُلَمَاءِ حَضْرَتُ مَوْلَانَا مِعْرَاجُ الْحَقِّ صَادَقَتْ بِهِ كَاتِبُهُ صَدَارُ الْمُدْرِسَيْنَ دَارُ الْعُلُومَ دِيَوَنَبَدْ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله واصحابه الطيبين امتاً بعداً يه دنيا تغير پزیر ہے یہاں نت نے مسائل فوادنا پیدا ہوتے ہیں اور فقہائے امت قرآن و سنت اور انہر دین کی تصریحات کی روشنی میں ان کے احکام واضح کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح کے جدید مسائل میں سے ایک نیا مسئلہ مدارس دینیہ کے مسئلہ میں بعض حلقوں کی طرف سے بڑی قوت کے ساتھ اٹھایا گیا ہے کہ ان مدارس کی مجلس شوریٰ اور آن کے مہتمم کی باہمی حیثیت کیا ہے نیز یہ مدارس فقہاء کرام کی اصطلاح کے مطابق وقف ہیں یا وقف نہیں ہیں یہ دونوں مسئلے حضرات اکابر حبہم اشد کے زمانے میں علی اعتبارے تقریباً طشدہ تھے لیکن ان کی آج اس طرح سے تشریع کی جا رہی ہے کہ گویا اسکی طرف اب تک توجہ نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ معروضی طور پر ان مسائل کا جائزہ لیا جائے اور کتاب و سنت نیز فقہائے امت کی تصریحات کی روشنی میں علی اعتبارے ان کی توضیح و تفییع کر دی جائے

خدا جزا نے خیر دے مولانا ریاست علی حساب استاذ حدیث فاظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کو کرانخواں نے کثرت مشاغل اور عدم فرصت ہونے کے باوجود ان مسائل کو کتاب بست اور کتب فرقہ کی روشنی میں اس طرح منقح کر دیا ہے کہ اس پر اضافہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کتاب کے مطابعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مؤلف موصوف کو ترتیب و بسطِ دلائل میں خصوصی درکار حاصل رہ چکے ملا۔ پر۔

استاذ الائمه حضرت مولانا نصیر احمد خان صاحب گنلو ہم العالی شیخ الحدیث و نائب مفتخر دارالعلوّادیوبند

حامدًا ومصلیاً! "شوریٰ کی شرعی حیثیت" اور اس سے متعلق دیگر مباحثت کی تحقیق و تدقیق میں جو محنت کی گئی ہے، اکتاب کے مضامین خود اس کا ثبوت ہیں۔ مزید یہ اختیاط کی گئی کہ اکابر علماء کے علمی مناقشہ، یا ان کے بغور مطالعہ اور سماعت فرمانے کے بعد اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ تحریر جس میں کسی پہلو سے تشنجی محسوس نہیں ہوتی، مدارس عربیہ کے نظام کا، ان کے دستور اساسی، جبریشن، وقف اور دینی و دنیاوی تام معاشرات میں شوریٰ کی شرعی حیثیت کی تفصیلات پر مشتمل ہے اور ہر جگہ ایسی دلنشیں اور مدلل گفتگو کی گئی ہے کہ ہر مستند پر شرح صد ہو جاتا ہے۔

فقیر الامت جضرت مولانا مفتی محمود صاحب گنلو ہم زید مجدم نے بغور سماعت فرمانے کے بعد تمام مضامین کی صحت کی توثیق فرمادی ہے جس کے بعد کسی توثیق کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

دعا ہے کہ پروردگار عالم، اکتاب کو نفع بخش بنائے، اور مدارس عربیہ کے نظام کا کے ذمہ داروں کیلئے شوریٰ کی شرعی حیثیت کے مطابق استفادہ کی راہیں سنافر نہیں رہتے،

نصیر احمد غفرلہ ۱۲ صفر ۱۴۰۸ھ

(باقی متن گذشتہ) اکتاب اپنے موضوع پر جاسع اور پراز معلومات ہے اور میری معلومات کی صحت کی اس موضوع پر اتنی بسیط اور مدلل کتابی ہمارے کتب خانے خالی ہیں۔ دعا ہے کہ پروردگار اس خدمت کو نفع بخش اور مقبول فرمائے۔ فقط احقر براج الحق غفرلہ

رکھو مگر امُن

حضرت مولانا فاضل اطہر حنفی مبارکبوری زیدِ محمد بن
نگران اعزازی شیخ الہند اکیدی دارالعلوم دین

اسے حسنِ اتفاق ہی کہا جائے گا کہ "شوری کی شرعی حیثیت" کی عبّت
کا وقت آیا تو حضرت مولانا فاضل اطہر صاحب مبارکبوری زیدِ محمد بن دیوبند
تشریف لے آئے اور موصوف نے مسودہ دیکھ کر اپنی راتے رقم فرمادی۔
فاضل صاحب موصوف کو مجلس شوریٰ نے شیخ الہند اکیدی کے کاموں کی
نگرانی کا کام اعزازی طور پر سپرد کیا ہے وہ اسی غرض سے دیوبند تشریف
لاتے رہتے ہیں، اور مفید مشوروں سے نوازتے ہیں۔ (ادارہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نَحْمَدُهُ وَنَصْبِلِي عَلٰى رَسُولِهِ الْكَرِيمِ

زیر نظر کتاب ایسے مسائل و مباحث پر مشتمل ہے جن کا تعلق مدارسِ اسلامیہ
سے ہے اور جن کے جملہ امور و معاملات مجلس شوریٰ اور مسٹریم یا ناظم کے باہمی اشتراک
واستصواب سے انجام پاتے ہیں، اس سلسلہ میں مجلس شوریٰ اور ناظم و مسٹریم کیلئے
قواعد و ضوابط بھی ہوتے ہیں، یہ بات یقیناً جسارت بھی سمجھی جائے گی کہ ان اصول و

ضوابط میں شرعی احکام ذہنی ہوتے ہیں اور عملہ ان پر توجہ بہت کم ہوتی ہے۔ خاص طور سے مقامی اور علاقائی درسگاہوں میں یہ صورت زیادہ ہوتی ہے جس کے باعث بعض اوقات ناگوار حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

سخت ضرورت تھی کہ مدارس اسلامیہ کے شوری، اہتمام، مالیات، اور جائیداد وغیرہ کے بارے میں شرعی احکام مفصل و محقق طور سے یکجا بیان کردئے جائیں، یہ کتاب اسی انداز پر اس غرض سے مرتب کی گئی ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب مولانا ریاست علی صاحب بجنوری مدرسہ ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند نے نہایت تحقیق و تلاش سے ان سائل پر سیر حاصل بحث کی ہے، اور کتاب و سنت، فقہ و فتاویٰ اور علماء کے آراء و اقوال کے قدیم و جدید مأخذوں کو ٹھنگھاں کر ایک نہایت سمجھیدہ اور باوفاق کتاب مرتب کی ہے، شوری اور اہتمام سے متعلق حصہ خاص طور سے مصنف کی تلاش تحقیق کا شاہکار ہے۔

اس کتاب کی وجہ تصنیف اگرچا ان موضوعات پر بعض جدید تصنیفاً ہیں مگر اس میں کہیں مجادلانہ تو کیا مجیباً انداز بھی نظر نہیں آیا ہے۔ یہ اس کتاب کی خاص خوبی ہے جس کی وجہ سے عام مدارس اسلامیہ کیلئے بڑے کام کی ہے، اگر اکان شوری اور نظرaro و سہمتیں حضرات شرعی حدود میں رہ کر مدارس کے نظم و نسق کو چلایں تو کوئی ناگوار بات پیدا نہیں ہوگی بلکہ خیر و برکت کا ظہور ہوگا، حضرت مصنف اپنی اس علیؑ دینی کاوش میں کامیاب ہیں۔ اللہ کرے یہ کتاب ہمارے مدرسوں کے حق میں مفید اور باعث خیر ہو۔

قاضی اطہر مبارکبوری

۲۰ صفر ۱۴۰۷ھ

پیش لفظ

ام ریاست علیہ عنوری غفرانی

الحمد لله وکفی وسلام على عبادۃ الدین اصلحی! امّا بعد. آج سے چند سال پہلے تک مدارس عربیہ کے نظام کا میں شوری اور اہم کی شرعی حیثیت کوئی ایسا موضوع نہیں تھا جس پر کسی تایف کی ضرورت محسوس کی جائے، مہتمم کو ہر حال میں شوری کے کاماتخت بمحاجاتا تھا جیسا کہ واقع ہے اور اسی وجہ سے ماضی میں کبھی مجلس شوری کے مقابلہ میں مہتمم کی حیثیت زیر بحث نہیں آئی، نہ کبھی کسی مہتمم نے مجلس شوری کے مقابلہ بالادستی کا دعویٰ کیا۔

زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ ان مدارس عربیہ کی ایک صدی سے زائد کی تاریخ میں ایک موقع پر شوری اور سرپرست کے درمیان اس طرح کا موضوع زیر بحث آیا تھا اور دیانت و امانت کے اس نتیجے میں اس کا فیصلہ عملی طور پر اس طرح ہو گیا کہ سرپرست نے شوری کے سامنے اپنا استغفار پیش کر دیا جو شوری کی بالادستی کے اعتراض کے ساتھ، اختلاف کو ختم کرنے کا نہایت کامیاب اور قابل تقلید حل تھا۔

لیکن اب چند سالوں سے کچھ اہل علم اور ان کے حلقہ اثر کی جانب سے علمی اور عملی طور پر شوری کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرنے کی باتیں سامنے آ رہی ہیں کہ پہلے تو ان حضرات نے شوری کو تخلیل کرنے کی کوشش کی، پھر اس موقف کو مدل کرنے کیلئے

کچھ تحریریں مرتب کر کے شائع کی گئیں۔ دارالعلوم کا موقف چونکہ شوری کی بالادستی کے سلسلے میں ہمیشہ شک و شبہ سے بالاتر رہا ہے اس لئے ہندو بیرون ہند سے اس موضوع کا علمی تحقیق جائزہ لینے کی فرمائشیں تسلسل کے ساتھ وصول ہونے لگیں۔

ابتداءً اس صورتِ حال کو انگیز کیا جاتا رہا، لیکن جب یہ دیکھنے میں آیا کہ یہ موضوع علماء کرام کی مجلسوں میں زیر بحث آگیا ہے اور بعض اہل علم بھی مستد کا ایک ہی پہلو سامنے ہونے کے سبب غلط فہمی میں مبتلا ہو رہے ہیں تو حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مہتم زید مجدد ہم اور حضرت مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین دامت برکاتہم نے راقم الحروف کو اس موضوع پر محنت کرنے کا حکم دیا۔

راقم الحروف نے تعییل حکم میں جب اس موضوع پر مطالعہ اور اسائدہ دارالعلوم سے تبادلہ خیال کے بعد مضمون کے عناصر کو قلمبند کرنا شروع کیا تو اس کے اطراف کا سمیٹنا دشوار ہو گیا اور اندازہ ہوا کہ مضمون چھ سالات سو صفحات پر محیط ہو جائے گا۔ میں نے اس الحجمن کو اپنے خصوصی مرتبی حضرت مولانا سلطان الحق صاحب سابق ناظم کتب خانہ المتوفی ۱۲۶۰ھ کے سامنے رکھا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ صرف موضوع سے براہ راست مربوط مضافاً میں کوتین صفحات کے درمیان قلمبند کرنے کی کوشش موزوں معلوم ہوتی ہے، چنانچہ موصوف کے مقرر فرمودہ سلطیکی پابندی کرتے ہوئے بندہ نے مدارس عربیہ کے نظام کو شوری، دستور اساسی اور حیثیتیں سے متعلق مضافاً میں کی ترتیب پر محنت کی، اختصار کی رعایت میں سینکڑوں حوالوں کو ترک کرنا پڑا، بس اتنا اہتمام کیا کہ کوئی بات حوالہ کے بغیر اپنی جانب سے نہ کھمی جائے، اس وقت تک وقف کے موضوع پر لکھنے کا ارادہ نہیں تھا، اس کے بعد راقم فقیہ العصر حضرت مولانا فتحی محسن حسبہ مظلہ کی خدمت میں حاضر

ہوا، میں بے حد منون ہوں کہ قبلہ محترم حضرت مولانا نعمتی محمد حسن صاحب زید مجید ہم نے فوراً وقت مرحمت فرمادیا اور بالاستیعاب ایک ایک لفظ بغور سماعت فرمایا، دورانِ سماعتِ دعاۓ کلمات اور بہت افزائی بھی فرماتے رہے اور جگہ جگہ اصلاح بھی دیتے رہے اور آخر میں فرمایا کہ جب آئی محنت کی ہے تو مناسب علوم ہوتا ہے کہ وقف کا موضوع بھی اس تحریر میں شامل کر دیا جائے، چنانچہ حضرتِ مخدوم و محترم کے حکم کی تعمیل میں وقف کے موضوع پر مقابلہ کا اضافہ کیا۔ حضرتِ موصوف نے اس کی بھی سہاتھ اور اصلاح فرمائی، لیکن یہ ارشاد فرمایا کہ اگر عربی کی امہات کتب کے حوالوں کی بنیاد پر مضمون لکھا جاتا تو زیادہ بہتر تھا، چنانچہ پورا مضمون قلمزد کر دیا گیا اور دوبارہ اس موضوع پر محنت کی، پھر خدمتِ عالی میں پیش کیا، سماحت اور اصلاح کے بعد دعاۓ کلمات کے نوازا، فقیرِ الامم حضرت مولانا نعمتی محمد حسن صاحب کی نظر اصلاح کے بعد حضرتِ الاستاذ مولانا معراج الحق صاحب صدر المدرسین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرتِ الاستاذ نے بھی شفقت و عنایت کا مقابلہ فرماتے ہوئے چند ہی مجلسوں میں بالاستیعاب سماٹ فرمائی، دورانِ سماحت بعض مقامات پر تبدیلی کی گئی اور ان دونوں بزرگوں کی اصلاحات کو مناقشہ کے بغیر قبول کیا گیا۔

اس کے بعد یہ اختیاط برتو گئی کہ مسٹوہ صاف کرنے کے بعد اس کی متعدد فوٹو اسٹیٹ کا پیاس تیار کرائی گئیں، ایک ایک کاپی حضرت مولانا محمد منظور حسب تمامی زید مجید ہم اور حضرت مولانا قاضی زین العابدین صاحب زید مجید ہم کی خدمت میں روانہ کر دی گئی، اور تین کا پیاس حضرت مولانا نعمت الشر صاحب، حضرت مولانا سعید احمد صاحب پانپوری حضرت مولانا جیب الرحمن صاحب قاسمی کی خدمت میں پیش کی گئیں، اول الذکر ہر دو حضرت تو آپنے نصف و علالت کے سبب بالاستیعاب نہ دیکھ سکے لیکن موڑالذکر

تینوں اساتذہ دارالعلوم نے بالاستیعاب نظر ڈالی اور جگہ جگہ نوٹ لکھے، پھر ایک مجلس مناقشہ منعقد کی گئی اور تبادلہ خیالات کے بعد اصلاحات کی گئیں، ایک ایک کاپی حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کا شفہ الہائی اور حضرت مولانا حکیم عزیز الرحمن صاحب کی خدمت میں سپیش کی گئی، ان دونوں حضرات نے مکمل اعتماد کا اظہار فرمایا۔

اور اب اتنے مراحل سے گزرنے کے بعد کتاب نذر قارئین کی جا رہی ہے امکان کی حد تک اختیاط تو مکمل کی گئی ہے لیکن بشریت کے تقاضوں میں خامیوں کا رہ جانا مستبعد نہیں ہے اس لئے اہل علم اگر از راہ خیرخواہی مفید شوروں اور اصلاحات سے نوازیں گے تو شکریہ کے ساتھ دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کروی جائے گی۔

ناسپاسی ہو گی اگر ان حضرات علماء اور احباب کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جن سے س کتاب کی ترتیب کے دوران استفادہ، تبادلہ خیال یا کسی بھی طرح کی مدد لی گئی ہے، حضرت مولانا نعمت اللہ صاحب استاذحدیث دارالعلوم اور حضرت مولانا محمد عثمان صاحب کا شفہ الہائی سے ہرستلہ پر استفادہ یا تبادلہ خیال کیا گیا ہے، موقع ہر موقع جن حضرات سے مدد لی گئی ہے ان میں جانب مولانا حبیب الرحمن صاحب قائمی حضرت مولانا سعید الرحمن پالپنوری، حضرت مولانا حبیب الرحمن صفائی کیرانوی جانب مولانا بلاں اصغر صاحب جانب مولانا عبد الحق مدنی، جانب مولانا شہیر احمد صفائی، جانب مولانا مجتبی الرحمن صاحب، جانب مولانا سید ارشد صاحب مدینی، جانب مولانا شہیر احمد صفائی میر علی، جانب مولانا الحلاق حق صاحب فاروقی، جانب مولانا عبد الحق صاحب بنجلی جانب مولانا نسیم احمد صاحب، جانب مولانا قاری ابوالحسن صدیق اعلیٰ جانب مولانا جمال حمد صاحب، جانب مولانا عبد الرؤوف حمد صاحب افغانی اساتذہ دارالعلوم کے نام شامل ہیں۔

اس تہذہ دارالعلوم کے علاوہ جناب مولانا فتح ا الحق صاحب روڑکی، جناب مولانا محمد اسلام صاحب محترم دارالاقمار، جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب مدفنی اور جناب مولانا جمیل الرحمن صاحب پرستاگردی کا بھی تعاون شامل حال رہا ایک موضوع پر جناب مولانا مفتقی طفیل الدین صاحب اور جناب مولانا مفتقی حبیب الرحمن صاحب خیر آبادی سے بھی تبلور خیال کیا گیا۔

کتابوں کی فراہمی میں جناب مولانا محمد حنفی حسنار فیق کتب خانہ دارالعلوم، جناب حکیم عبد الحمید صاحب ناظم کتب خانہ دارالعلوم، جناب مولانا شیم احمد صاحب لکھیم پوری، جناب مولانا عتیق اشٹر صاحب سہر ساوی، مولوی اشتیاق احمد صاحب بہراچی، مولوی محمد سفیان عرشی اور مولوی محمد سعید صاحب سیتاپوری کی مدد شماریں حال رہیں۔

ترتیب کے بعد کتابت کا مرحلہ آیا تو جناب مولانا محمد اسماعیل صاحب فرمکاوی مولانا نیاز الدین صاحب اصلاحی اور جناب منشی محمود جاہست صدھ عثمانی نے بعلتِ ممکنہ اس ضرورت کی تکمیل فرمادی، رقم المکوف ان تمام ہی محسین و معافین کا تہذیل گئے منون ہے دعا ہے کہ پروردگار عالم اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو صراط مستقیم پر گامزن رکھے، لغزشوں کو معاف فرمائے اور اکابر کے حکم کی تعییں میں جو محنت کی گئی ہے اس کو حسین قبول سے نوازے ۵

می توانی کر دہی اشکف مرا حسن قبول اے کے در ساختہ ای قطرہ بارانی را
رَبَّنَا تَقْبِلُ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وَتَبُعُ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَابُ الرَّحِيمُ

ریاست علی بجھوری غفرنا

۱۹ صفر ۱۴۰۸ھ

نقد

حضرت مولانا مرغوب الرحمن صاحب مذکولہ

مُحَمَّمْد دَارِ الْعِلُومِ دَلْوِينِد

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله محمد وعلي آل وصحبه جميع

اما بعد! اسلام میں مناصب کی تقسیم کیلئے اہلیت کو معیار مقرر کیا گیا ہے
ارشاد خداوندی ہے۔

ان اللہ یا مرسیم ان تودُّوا
بے شک اشد تم کو یہ حکم دیتا ہے کہ تمام
امانتوں کو، ان کی اہلیت رکھنے والوں
الامانات الی اهلہها۔
رسورہ النصار آیت ۵۸

چنانچہ خیر القرون میں منصب خلافت سے لے کر، ماتحت امارتوں تک
مناقص کی تقسیم اہلیت کی بنیاد پر کی گئی اور اس اہلیت کی توثیق کا عمل امیرم
شوریٰ بینہم کے حکم کی تعییں میں شوریٰ کے سپرد رہا، لیکن رفتہ رفتہ یہ بنیاد کمزور
ہوتی چلی گئی۔ اور اسلامی حکومت میں شورائیت اور اہلیت کے بجائے وراشت
کا عمل چاری ہو گیا۔

علماء کرام اور اخیار امت نے روزاول ہی سلطین کے اس طرز عمل کی
غلظی کا ادراک کر لیا، کچھ حضرات نے ارباب حکومت کی توجہ بھی ادھر میڈول
کرائی اور درمیان میں ایسے حکمران بھی آتے رہے جنہوں نے اپانی حکومت

کو وراشت کے بجائے شوریٰ کی بنیادوں پر استوار کرنے کی کوشش کی لیکن ان نیک دل سلاطین کی کوششیں بار آور نہ ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی سلطنت، وراشت کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکی، علامہ طنطاویٰ ان حکمرانوں کے بارے میں اس طرح اظہار خیال فرماتے ہیں۔

فَهُنَّا أَصْبَحُوا شُورِيًّا مِّنْ
الْوَاجِبَاتِ وَإِذَا كَانَ صَاحِبُ
شَرِعِنَا صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَشِيرُ
قَوْمَهُ وَالْوَجْهُ يَنْزَلُ عَلَيْهِ فَيَنْزَلُ عَلَى
حُكْمِهِ وَيُسِيرُ بِأَمْرِهِمْ فِي الْأَيْمَانِ
شَعْرِيٌّ كَيْفَ اسْتَبَدَ مُلُوكُ
الْإِسْلَامِ وَكَيْفَ تَرَكُوا الشُّورِيَّ
فِي غَابِرِ الْأَيَّامِ۔ الْأَمَمُ الْقَوْمُ
كَانُوا نِيَاماً۔ وَاللَّهُ لَقَدْ عَجِبَتْ
الْعَجَبُ كُلُّهُ فَكَيْفَ تَرَكَ بَعْضُ
الْمُسْلِمِينَ الشُّورِيَّ وَاسْتَبَدَ وَ
بِأَمْرِهِمْ وَظَلَمُوا فِي حُكْمِهِمْ۔
الْأَسَاءُ مثْلًا الْقَوْمُ الظَّالِمُونَ۔
وَقَدْ أَنَّ أَنْ يَرْجِعُوا الْمَجْدَهُمْ
وَيَنْالُوا أَعْزَمُهُمْ وَيُوفِوا حَظَّهُمْ

اس سے معلوم ہوا کہ شوریٰ کا قیام واجبات
میں سے ہے، اور جبکہ ہمارے حقائق شریعت
حضورصلی اللہ علیہ وسلم مجھی اپنی قوم سے مشورہ
فرمایا کرتے تھے جبکہ وہی آپ پر نازل ہوتی
تھی اور آپ صحابہ کے فیصلہ کو قبول فرمائیتے
اور ان کے ساتھ ہو جاتے تھے، اس صورت
میں کوئی بتلانے کر سلاطین اسلام کو استبدال
بالراستے کا حق کیسے حاصل ہوا اور ماخنی میں
انھوں نے شوریٰ کو کیوں ترک کر دیا، تیری
کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان سور ہے تھے؛ مجھے
بخدا بہت ہی زیادہ حرمت ہے کہ ان چند
مسلمانوں نے شوریٰ کو کیسے ترک کر دیا اور
کیسے وہ امور مملکت میں مستبد بالراستے
ہو گئے اور کیسے انھوں نے اپنے فیصلے میں
ظلماً کو روا کھا، اس ظلم پیشہ قوم کی مثال

(تفسیر الجواہر للطنطاوی ص ۱۵۳)

بہت بڑی ہے اور اب وقت آگئی ہے کہ

مسلمان اپنی عظمتِ رفتہ کو داپس لائیں،

عزت حاصل کریں اور اس سلسلے میں

اپنا حصہ پورے طور پر وصول کریں۔

چنانچہ سلاطین کی اس غلط روشن کے نتیجہ میں ایوان حکومت شوریٰ کی سرسری سے محروم ہو گیا تو علماء کرام نے اپنے لئے مقرہ حدود کی پابندی کو لازم کرنے ہوئے محض اس کتابی کے سبب سلاطین کے خلاف کام کرنیکے بجائے علم و حکمت کے دبستانوں میں شوریٰ کی بالاکوتی اور سرسری کا عمل جاری کر دیا، حضرات علماء نے شوریٰ کی زیر سرکردگی علم و فتوح کی جو گرانقدر خدمات انجام دیں وہ اسلامی کتب خانہ کی صورت میں موجود ہیں اور جہاں جہاں اسلامی حکومتیں قائم ہیں علماء کرام وہاں اپنی پسندیدہ روشن پر قائم رہے کہ سلاطین سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے بلکہ شوریٰ کے ذریعہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے غیر منصوص مسائل کے شرعی احکام مدون کر دئے جائیں۔

اسی انداز پر صدیاں گزر گئیں، لیکن ہندوستان میں اسلامی حکومت کی تخلیل کے بعد یہاں کی امت اسلامیہ کو بالکل تازہ صورت حال سے دوچار ہونا پڑا، اس صورت میں اقتدار اسلامی کی بایزیابی کی جدوجہد کے ساتھ، جب دین و ملت کے بقاء و تحفظ کی خاطر مدارس عربیہ کا نظام کار مرتب کیا گیا تو اکابر، اسلام، اس کی تعلیمات، اس کے مزاج، اس کی روح اور احکام شرعیہ اور ان کے مقاصد کے سلسلے میں خداداد بصیرت کے ساتھ، زہد و تقویٰ اور پاکیازی میں اپنی نظر آچے

ان کے سامنے شوریٰ کے بارے میں قرآن و حدیث کی نصوص تھیں، قرآن کریم میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔

وشاورہ مر فی الامر آپ صاحبہ سے معاملات میں مشورہ کریں۔

(سورة الهمزة آیت ۱۵۹)

اور اس حکم ربانی کی تعمیل میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا پورا عہد، غیر منصوص معاملات میں مشورہ کرتے ہوئے گذارا۔

مشورہ کی اہمیت بیان کرنے کیلئے قرآن کریم میں صحابہ کرام کی صفات مدحیہ بیان کرتے ہوئے فرائض و واجبات کے درمیان یہ صفت بیان فرمائی گئی۔

والذین استجابوا لربهم و اقاموا اور جن لوگوں نے اپنے رب کے تمام احکام کو قبول کیا اور نمازوں کو قائم رکھا اور ان کے الصَّلَاة و امرهم شوریٰ بینہم تمام امور یا ہمیشہ مشورہ کے طبق ہوتے ہیں اور جو لوگ دمتاز قنہم ینفقون ۵

(سورة الشوریٰ آیت ۳۸) ہمارے ہوئے رزق میں کے خرچ کرتے ہیں۔

ایمانیات اور فرائض کے درمیان شوریٰ کا تذکرہ اس کی اہمیت کو بیان کرنے کیلئے کافی تھا، چنانچہ خیر القرون کے مسلمانوں نے اس کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا اور صحابہ کرام کا پورا زمانہ شوریٰ کی ملحوظتیں اپنے منور رہا کہ تمام غیر منصوص اور انتظامی معاملات کا فیصلہ اس طرح کیا جاتا رہا کہ ہر موقع پر شوریٰ طلب کی گئی اور اس نے ان تمام معاملات میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے اپنا فرضِ نصیبی باحسن وجود دادا کیا، کیونکہ ایسے تمام معاملات میں امت کو صرف یہی حکم دیا گیا تھا کہ

فان تنازع عن مر في شيءٍ فردوه

إلى الله والرسول -

رسُورَة النسَاءِ آيَة ۵۹

پھر اگر تمہارا (اولو الامر سے) کسی

معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو اسے

اور رسول کے حکم کی طرف مراجعت کرو،

ان احکام خداوندی کی روشنی میں، اکابر علماء نے مدارس عربیہ کا نظام کا مرتب فرمایا تو

شوریٰ کو وہ مقام دیا جس کی مستحقی تھی چنانچہ ہندوستان کے علمی قافلے عرصہ دراز تک اسی

شاہراہ پر گام زن رہے جو اکابر نے منتخب فرمائی تھی۔ لیکن جس طرح اسلامی سلطنت کو شوریٰ

سے ملوکیت و ولادت میں تبدیل کرنے کا عمل ترتیبی طور پر وجود میں آیا اور اس کی تلافی نہ ہو سکی

بالکل اب بھی ہر جملہ ہندوستان کے مدارس عربیہ کو درپیش ہے کہ شوریٰ کی بالادتی سے انکار کیجئے

رامیں تلاش کی جا رہی ہیں، اور جیلوں کو عنیمت قرار دینے کی جگہ وہد شروع کر دی گئی ہے۔

پھر چونکہ اس دور کا سب سے بڑا تھیار علم ہے اسلئے مدارس عربیہ سے شورائیت کو ختم کرنے کے

حاجی علماء کرام نے خواہ ان کی نیت بخیر ہو اپنے نقطہ نظر کو علمی طور پر مدل کرنے کا کام شروع

کر دیا ہے، اس لئے ضروری تھا کہ اس موضوع کا خالص علمی اور تحقیقی جائزہ لیا جائے۔ اور

واضح کیا جائے کہ ہندوستان کے مدارس عربیہ کا نظام کا مرتب کرنے والے اکابر علماء کے سامنے

کیا حقائق تھے جن کی بنیاد پر انہوں نے شوریٰ کو با اختیار رکھا اور تمام عہد دیدار ان مدارس

کیلئے شوریٰ کی ماتحتی میں کام کرنے کا لائے عمل مرتب فرمایا۔

زیر نظر کتاب اسی موضوع کا ایک مثبت اور معروضی جائزہ ہے جس میں سب سے پہلے مدارس

عربیہ کے نظام کا کی تشریح کی گئی ہے اور اکابر کے ارشادات کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے کہ

مدارس عربیہ کے عہدے داروں میں کس منصب کی کیا شرعی حیثیت ہے، پھر شوریٰ کا شرعی

مقام واضح کیا گیا ہے، شوریٰ کا مسئلہ چونکہ اس تحریر کا بنیادی نقطہ بحث تھا، اس لئے

اس موضوع کے تامہبلوں کا میسون طباجائزہ لیا گیا ہے، اور بتلا یا گیا ہے کہ عہد رسالت اور خلافت راشدہ میں شوری کا طرز عمل اور دائرہ کار کیا تھا، پھر قرآن و حدیث اور فقرہ اسلام میں شوری کیلئے پائی جانے والی حقیقتوں کو واضح کیا گیا ہے اور یہ بات پوری طرح واضح اور ثابت کردی گئی ہے کہ مدارس عربیہ میں شوری کی بالادستی شبہ سے بالاتر ہے ان خالص علمی اور تحقیقی مضامین کے درمیان، شوری کی بالادستی کا انکار کرنے والے نقطہ نظر کے دلائل کا جائزہ بھی آگیا ہے جس سے غلط فہیموں کے ازالہ میں پوری طرح مددی جاسکتی ہے۔ شوری کی بحث سے فارغ ہونے کے بعد مدارس عربیہ کے دستور اساسی اور اس کے حجہ لیشن کا مسئلہ بھی واضح کر دیا گیا ہے، اور سبے آخر میں مدارس عربیہ اور وقف کے موضوع کا قابل اعتماد تحریک کر کے واضح کر دیا گیا ہے کہ ان کی کتنی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مصنف نے ہر موضوع پر قرآن و سنت اور فقہاء امت کے فتاویٰ کی روشنی میں نہایت محققانہ بحث کی ہے اور ہر موضوع کو دلائل کی قوت سے مدلل کر دیا ہے۔ موصوف نے اس تحقیق و تدقیق میں کس قدر کوشش کی ہے اس کا اندازہ تأخذ ارجواں سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غالباً مبالغہ نہ ہو گا کہ موضوع زیر بحث پر اس سے زیادہ محنت و کاؤش نہیں کی جاسکتی۔ ائمہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

دعا ہے کہ خداوند عالم اس سعی کو مشکور فرماتے، اور خلوص و دیانت کے ساتھ جن تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے یہ خدمت انجام دی گئی ہے۔ اپنے فضل و کرم سے اس سلسلے میں اس کو نفع بخش فرمائے۔ آمین

مرغوب الرحمن عفی عن
بر صفر المظفر ۱۴۰۸ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله محمد وعلى آله وصحبه أجمعين ! امتابعد - رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو پروردگار عالم نے تمام انسانی کمالات کا جامع مرقع بنایا، جمال فطرت کی تمام نیز نگیاں اور کمال انسانیت کی ساری کائنات آپ کی شخصیت میں سمیٹ کر اعلان فرمادیا۔

لقد کانَ لِكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں
تَمَّارِيْدُ الْأَخْرَابِ آیت ۱۷ تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار محسنین میں ایک اہم کمال کمال علمی ہے، خداوند قدوس نے آپ کی تربیت اپنی صفت علم سے فرمائی اور کمال علمی آپ کی ذات پاک کا طفراۓ امتیاز بن گیا، چنانچہ آپ کی حیاتِ طیبہ کا ایک لیکھ لکھ اشاعت علم کیلئے وقف رہا۔ آپ کے ارشادات اور آپ کے افعال ہی نہیں بلکہ آپ کی موجودگی میں کئے جانے والے وہ کام بھی جن پر آپ نے سکوت فرمایا، ہلم قرار پائے۔

امّتُ مُسْلِمٍ كَوْنَتْ دُولَتْ سَمَاءَ مَالَامَ كَرْنَيْ كَيْلَيْ آپْ نَے سَجْدَوْيَ سَعْيَ
لِمَعْنَى اِيْكَ چِبُوْتَرَبُوْيَا جَسْعَ صَفَرَ كَنَامَ سَعْيَ يَادِكِيَا جَاتَاهَيْ اُورْ جَوَيْلَيْخَ انسانیت میں
طَالِبَانَ عَلِمَ دِيْنَ کَا پِهْلَا اجتماعی مدرَسَہ ہے، مسلمانوں میں علم کی صحیح ترتیب پیدا کرنے
کیلئے آپ نے علم کی طلب کو فریضہ قرار دیا۔

طلبِ العلم فَيَضْمَدْ عَلَى
علم کی طلب ہر مسلمان کے لئے
کل مُسْلِمٌ دِمْشَكَةَ كِتَابِ الْعِلْمِ
فرض ہے۔

طلب علم کے لئے سفر کرنے کی اہمیت کو قرآن کریم میں اس طرح بیان فرمایا گیا۔
فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فَرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ
سوکیوں نے نکلا ہر فرقہ میں سے ان کا ایک
حصہ، تاکہ سبھ پسیدا کریں دین میں اور
تاکہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو جب کوٹ کر
لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلَيَنذِرُوا
قومِهِمْ أَذْارِجُوا إِلَيْهِمْ
آئیں۔

رسویۃ التوبۃ آیۃ ۱۳۲

چنانچہ روز اول سے امت مسلمہ نے علم کے حصول اور اس کی ترویج و اشتاد
کیلئے وہ کارناامے انجام دئے جن کے اندر اجراج سے انسان کا قلم عاجز رہا اور شاید
ان کی سرگزشت کی تفصیل فرشتوں کے لکھنے ہوئے نامہ اعمال کے علاوہ کہیں
دستیاب نہ ہو سکے گی۔

مسلمانوں کی ان علمی سرگرمیوں کی تاریخ میں کتنی ہی صدیاں ایسی گذری ہیں
کہ حصول علم کے لئے باقاعدہ درس گاہوں کا نظم نہیں تھا بلکہ ہر عالم دین اور ہر صاحب
فن کی چوکھت، صحیح طلب رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز بندی رہتی تھی اور اسی طرح قرون
تک چراغ سے چراغ جلتے رہے اور ایک نسل سے دوسری نسل میں علمنتقل ہوتا
رہا، پھر ضرورت محسوس ہوئی اور ان انفرادی کوششوں کے ساتھ مدارس کا قیام
عمل میں آنے لگا، تاریخ اسلام میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں چھوٹے بڑے مدارس
قام ہوئے اور عموماً انفرادی یا اجتماعی طور پر علم کی ترویج و اشتادت کا فریضہ انجام دینے
والوں کو حکومت وقت یا صاحب شرودت علم دوست مسلمانوں کی سوچتی حاصل رہی

ہندوستان کی علمی سرگرمیوں کا حال بھی عالم اسلام سے کچھ مختلف نہیں رہا۔ یہ زمین بھی عالم اسلام کے دیگر علاقوں کی طرح علومِ بوت کے چراخوں اور میناروں سے جگنگاتی رہی، تاریخ میں ایسے ہزاروں علماء کے نام محفوظ ہیں جن کے دروازوں سے علم کے ساغرو مینا تقسیم ہوتے، ایسے ہزاروں مرکزی یادیں تاریخ کے سینے میں محفوظ ہیں جہاں اجتماعی طور پر میراثِ بوت میں سے علم، یا علم و عرفان کی دولت تقسیم ہوتی رہی، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ کی اقتدار میں اہل علم نے کتنی بھی مسجدوں سے عبادت گاہ کے ساتھ مدارس کا کام بھی لیا آج بھی ہزاروں مسجدوں کے قرب و جوار کے تعبیری نشانات یا صحن مسجد سے متعلق کروں کا انداز، زبان حال سے ترجمانی کر رہا کر رہا کبھی علمی قافلوں کا قیام رہا ہے، بلکہ ہندوستان کے بہت سے مقامات میں آج تک مسجدوں سے درسگاہوں کا کام تسلسل کے ساتھ لیا جا رہا ہے۔

ہندوستان، اقتدارِ اسلامی کے زوال کے بعد

علم دین کی ترویج و اشاعت کا یہ کام برابر ہوتا رہا۔ لیکن جب ہندوستان میں اسلامی اقتدار کا آفتاب غروب ہو گیا تو اسلام کو انسانیت کے حق میں خدا کی سب سے بڑی نعمت سمجھنے والوں کیلئے اس براعظم کاتاریکیوں میں ڈوب جانے کا حادثہ، ناقابل بڑا شدت صدمہ ثابت ہوا۔

ایک طرف ہندوستان میں غیر ملکیوں کا سلطنت اور دوسری طرف خدا کی سب سے بڑی نعمت کے تحفظ کی فکر، چنانچہ اکابر دارالعلوم نے ایک طرف تو اقتدار کی بازیابی کیلئے مسلح جدوجہد کی جسکی پوری تفصیلات اول تو محفوظ نہیں ہیں، دوسرے یہ کان کے

بیان کا یہ موقع نہیں تاہم حضرت مولانا عبد اللہ سنگی قدس سرہ کی التهیید لاکڑا الجدید
کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب ہے۔

دہلی کے قرب وجوار میں چار مہینے کی مدت
میں تقریباً ستر مرکے وقوع پذیر ہوئے
اور حیدر آباد و کابل وغیرہ کے حکمرانوں
کی جانب سے جو امداد بخیاض دری تھی
وہ نہیں پہنچ سکی، بلکہ ان حکمرانوں نے
علماء کو بے یار و مدد گار تھوڑا دیا اور دشمنوں کے
سازکری چنانچہ محرم ۱۲۷ھ میں شکست
واقع ہو گئی، پھر قتل، گرفتاری اور فرار
کے واقعات پیش آئے، پھر نہ پوچھئے کہ
یہ سال علماء پر کیسے گزرا۔

وقعت نحو سبعین معرکہ فی
اطراف دہلی فی مدة أربعۃ
أشهر فما وصل اليهم من كان
واجباً عليه نصرهم من ولاة
حیدر آباد و کابل بل ترکوهم
و خذ لهم وشارکوا الاعداء
فوق الفشل فی محرم ۱۲۷ھ ثم
القتل والاسر والفرار فلما اتسأله
كيف مضى عليهم تلك السنة
(التهیید لامیۃ التجدید ۶۹)

اکابر کی یہ سلح جدوجہد ۱۲۷ھ میں شروع ہوئی لیکن قضا و قدر
کے فیصلوں کے مطابق وہ اس میں کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکے بلکہ کچھ مزید الزاماً
ان کے حصہ میں آگئے، اس نازک وقت میں دین کے تحفظ کی فکر نے ان بزرگوں
کو ماہی بے آب بنادیا اور ان حضرات نے فیصلہ کیا کہ دین و شریعت کے تحفظ
کیلئے اسلامی مدارس کا قائم کرنا انشا اللہ مفید ہو گا، مولانا عبد اللہ سنگی کی زبان
سے اس کی اجمالی کیفیت سنئے۔

انہمہ الحزب الدھلوی اجتمعاً

دہلوی جماعت کے اساطین جماز میں مجع ہوئے

اور انہوں نے سندھستان میں ایک ایسے دینی جامع مدرسہ کی بنیاد ڈالنے پر اتفاق رئے کہ لیا جو دری کا بچ کے انداز پر قائم کیا جائے وہی کافی وہ مدرسہ ہے جو شاہ عبدالعزیز کے زمانہ میں قائم ہوا تھا اور جس کے مدرسین میں صدر سعید مولانا عبد الحقی، پیر شیخ المشائخ شیخ الدین، اور پھر استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی دہلوی تھے، اور جو ۱۳۸۵ھ میں معکرہ آزادی کے بعد بندرگاری کیا تھا، چنانچہ اکابر اپنے منصوبہ کی تکمیل پر دہلوی کے قریب دیوبند میں کامیاب ہو گئے اور محرم ۱۳۸۷ھ میں مدرسہ کی تاسیس و تکمیل میں مشغول ہو گئے اسی وقت سے اس جماعت کو دیوبندی جماعت کے نام سے یاد کیا جانے لگا، جبکہ اس سے پہلے یہ جماعت، دہلوی جماعت کے نام سے مشہور تھی۔

جماعت کے امراء حجاز میں مقیم تھے جن میں حاجی امداد اللہ مہاجر بکی اور شیخ عبد الغنی محمد دی شاہی میں، یہ حضرات حجاز

فی الحجاز واجمیعوا على تاسیس مدرسة دینیۃ جامعتہ فی الهند علی قمیال المدرسة الدهلویۃ دریلی کافی، التی اسست فی زمان الامام عبدالعزیز وکان المدرسون بھما الصدر السعید مولانا عبد الحقی ثم شیخ مشائخ خدا التسبیح، شیخ ایضاً الدہلوی ثم استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی الدہلوی وسدّ بعد المحاربة سنه ۱۳۸۷ھ فما قدروا علی ذلك الاف دیوبند قریباً من دہلی فاشتغلوا ابا تاسیس المدرسة وتکمیلها من محرم سنه ۱۳۸۸ھ ومن تلك الايام سمیت الطائفۃ بالدیوبندیۃ وقبل ذلك كانوا لا یعرفون الابالدهلویۃ۔

امراء الطائفۃ كانوا مقيمين بالحجاز منهم الامیر امداد اللہ التھانوی ومنهم الامام عبد الغنی

مقدس میں ایک اسلامی مرکز کو مضبوط
کرنا چاہتے تھے، اور افغانستان میں
ہندوستانی تحریک کے مرکز کی تجدید کا
ارادہ رکھتے تھے اور ہندوستان میں
نائب امیر کی حیثیت سے شیعہ اسلام
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانو توی[ؒ]
الدھلوی و کافوایر دین تثبیت
مرکز الاسلام فی الحجاز و تجدید
مرکز النہضۃ الهندیۃ فی جبال
الافغانستان و کان وکیل الامیر
فی الهند شیخ مشائخنا شیخ
الاسلام مولانا محمد قاسم
الدیوبندی المزاalah التهید لاعمۃ التجدید

یعنی سرکار اللہ کی مسٹح جدوجہد کی ہم میں ناکامیوں کے بعد یہ حضرات ہندوستان
کے ہجرت پر مجبور ہو گئے اور انہوں نے حجاز مقدس میں جا کر پناہی، پھر غور و فکر کے
بعد ہندوستان میں دہلی کالج کے انداز پر ایک بڑا مدرسہ قائم کرنے کی تجویز پاس
ہوئی، حاجی امداد اللہ اور شیخ عبدالغنی رحمہم اللہ کے پیش نظر تین مقامات پر مرکز قائم
کرنا ضروری تھا۔ حجاز مقدس میں، افغانستان میں اور ہندوستان میں، حسن اتفاق
کہ ہندوستان میں ان اکابر کو اپنے نقطہ نظر کی تکمیل کیلئے ایک نہایت کامیاب
وکیل شیعہ اسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ میسر آگئے،
ان حضرات کے پیش نظر کیا مقاصد تھے؟ یعنی وہ صرف ایک مدرسہ قائم کرنا
چاہتے تھے کہ علم دین کی ترویج و اشاعت کیلئے وہ ایک معیاری درسگاہ قائم فرمادیں
یا اس کے علاوہ بھی ان کے سامنے کچھ حقائق تھے، اس کے لئے مولانا عبدی اللہ مندو
رقم طراز ہیں۔

ثران کان قطر من المسلمين
پھر یہ کہ اگر مسلمانوں کے کسی ملک پر

کفار کا استلطہ ہو جائے تو ان عام مسلمانوں پر جو بھرت پر قادر نہ ہوں اپنے تعلیم اور افتخار کے معاملات میں مراجعت کے لئے امام کا قائم کرنا واجب ہو جاتا ہے، اور ہمارے مشائخ جنہوں نے دہلی کے قریب دیوبندی مدرسہ کی بنیاد رکھی اور اس کی بہت سی شاخیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں قائم فرمائیں ان کا مقصد اسی واجب کی ادائیگی تھا، چنانچہ الشہر نے ان کے کام میں برکت عطا فرمائی اور ان مدارس سے یہکے بعد گیرے ولی اللہی انداز خفیت رکھنے

والی جماعتیں پیدا ہوتی رہیں۔

(مواقت المسترشدین ۳۶۷ بحذف سیر)

فلسفہ ولی اللہی کے کامیاب شارح اور حکمت قاسمی کے معتبر ترجمان حضرت مولانا عبد اللہ سندھی قدس سرہ اس اقتباس میں یہ فرماتے ہیں کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے ختم ہو جانے اور غیر مسلموں کے ہاتھ میں زمام اقتدار آجائے کے بعد جو مسلمان بھرت پر قادر نہیں تھے ان کے ذمہ امامت کا قائم کرنا یہ فریضہ کے طور پر عامد ہوتا تھا اور اکابر مرحومین نے دیوبند میں مرکزی درسگاہ قائم کرنے کے بعد جو ہندوستان میں جگہ جگہ مدارس قائم فرمائے اس میں ان کے پیش نظر اسی نصب امامت کے فریضہ کی ادائیگی تھا۔ نصب امامت کا فریضہ کسی ذکری درجہ میں مدارس عربیہ کے قیام سے کس طرح ادا

تغلب عليه الکفار وجب على علمة المسلمين الذين لا يقدرون على الهجرة ان ينصبو الهمرااما يرجعون اليه في التعليم والفتيا ومشايخنا الذين اسسوا المدرسة الديوبندية بقرب دھلی وفروعها لها في اطراف الهند كان مقصد هم اداء هذا الواجب، فبارك الله في صنيعهم وتخرج منها فوج بعد فوج على السليقة الواحدة الولي للهية الحنفية۔

ہوا۔ اس کی وضاحت کے لئے مدارس عربیہ کے نظام کا میں مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کا معلوم کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہم پہلے دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت پر قدرے رشیٰ والیں گے اور پھر اکابر کے ارشادات سے مجلس شوریٰ کی شرعی نوعیت و حیثیت واضح کروں گے۔

دارالعلوم کے آغاز کی نوعیت

سلیمان جنوجہد کے جو نتائج سامنے آئے تھے اس کے بعد یہ تصویر نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس طرح کے کاموں کی سرپرستی اقتدار کلی رکھنے والی طاقت کر سکے گی کیونکہ یہ طاقت ختم ہو چکی تھی، یا اس کے مصارف کی کفالت صاحب ثروت مسلمان کر سکیں گے کیونکہ یہ حضرات بھی تباہ ہو چکے تھے اور اس تازہ صورتِ حال سے خائف بھی تھے، اس لئے اکابر مرحومن نے اس نئی صورتِ حال میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق مشورے کئے، آپ کا ارشاد ہے۔

عن علی قال قلت يا رسول الله
حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض
کیا، یا رسول اللہ! اگر کوئی ایسی صورت پیش
ان نزل بنا امرليس فيه بيان اه
و لامنه فهات امرني، قال شاوروا
آجائے جس میں آپ کی جانب سے امر یا نہی
کی وضاحت نہ ہو تو آپ کیا حکم دیتے ہیں،
فیه الفقهاء العابدين ولا تغضوا
آپ نے فرمایا کہ اس معاملہ میں فقہاء اور عباد
گزاروں کے شورہ کرو اور خاص لوگوں کی رائے
فیه رای خاصۃ۔

(رواہ الطبرانی فی الاوسط اور رجالہ)
موثقون من اصل الصحيح بجمع الرذائل (ص ۱۸)

چنانچہ آپ کے ارشاد کے مطابق جماز مقدس میں حضرت حاجی امداد اللہ اور شیخ

عبد الغنی قدس سرہ مانے شورے کئے اور ہندوستان میں ان کے نائب حضرت مولانا محمد قاسم صاحب قدس سرہ نے بار بار مشورے فرما کر ایک طریقہ کار کا تعین کیا۔

حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانو توی قدس سرہ کی اس زمانہ میں دیوبند میں بہت زیادہ آمد و رفت تھی، محلہ دیوان میں آپ تشریف لاتے اور چھترے کی مسجد میں نمازیں ادا کرتے، چھترے کی مسجد حضرت حاجی عابد حسین قدس سرہ کی قیام گاہ ہونے کے سبب اہل علم اور ارباب تقویٰ کا مرکز تھی، وہاں بار بار اس موضوع پر تبادلہ خیال ہوا اور ان حضرات کے مشوروں میں بھی یہ بات طے ہو گئی کہ اب اپنے منصوبوں کی تنکیل کیلئے تعلیم گاہوں اور مدرسوں کا قائم کرنا ہی ضروری ہے، لیکن اسلامی حکومت کے ختم ہو جانے اور صاحبِ شرودت مسلمانوں کے تباہ ہو جانے کے بعد مدارس کے نئے مصارف کا کیا انتظام ہو گا تو ان بزرگوں نے اس کے لئے عوامی چنڈہ کی تدبیر پر غور کیا، دارالعلوم سے پہلے عوامی چنڈہ کے ذریعہ کسی ادارہ یا مدرسہ کے چلائے جانے کی بات تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد میال صاحب ایک استفہ کے جواب میں لکھتے ہیں۔

« موجودہ مدارس، دارالیتامیٰ یا تبلیغی اداروں کا سلسہ اقطار ہند میں اس وقت قائم ہو اجب کہ اسلامی حکومت ختم ہو چکی تھی اور ارباب بصیرت و فراست اکابر نے محسوس کیا کہ اس قسم کے سلسلے کے علاوہ بلاد ہند میں احکامِ اسلام کے تحفظ کی کوئی مشکل نہیں؛ غالباً اس نظام مبارک کا پہلا موتی دارالعلوم دیوبند ہے۔»

(فتاویٰ مطبوعہ روزنامہ الجمیعۃ الکتبہ ۱۹۵۹ء)

مگر عوامی چنڈہ حاصل کرنا، بیت المال اور اسلامی نظم پر موقوف ہے، اس لئے ان

اکابر نے ارباب حل و عقد افرا پر مشتمل ایک مجلس تشکیل کی جو مفاہاتِ عاملہ کے تحفظ کے باب میں امام کی فائم مقام ہوا اور شرعاً اس کے لئے عوامی چندہ حاصل کرنا اور صدار خبریں صرف کرنا جائز ہو۔

چونکہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانو توی اور ان کے وہ رفقاء جو سلح جدوجہد میں پیش پیش تھے وہ حکومتِ مسلط کی نگاہوں میں آچکے تھے، ان کے خلاف مقدمات بھی قائم ہو چکے تھے، قید و بند کی صوبتیں بھی برداشت کر کے تھے اس لئے دین کے تحفظ کی کسی بھی جدوجہد میں ان اکابر کا بالکل سامنے رہنا، خود اس جدوجہد کیلئے نقصان دہ ہو سکتا تھا۔

ان حالات میں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور و مشورو کے بعد، جوا اعلان دارالعلوم کے قیام سے متعلق شائع کیا گیا اس میں بہت احتیاط برتنگی اور صرف وہ بات ظاہر کی گئی جو سبکے نزدیک قابل تعریف ہو اور کسی کے لئے اس پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہ ہو۔ اس اعلان و اشتہار کے متن کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دستاویز ایسی نہیں ہے جس کی بنیاد پر ہم یہ دعویٰ کر سکیں کہ ان اکابر نے چھتے کی مسجد میں دارالعلوم کی بناء پہلے لکھنی مجلسیں منعقد کیں اور ان میں کیا کیا تجاویز زیر غور آئیں، بلکہ ہمارے پاس تاریخی وثائق کے طور پر صرف ایک اشتہار ہے جس کا متن یہ ہے۔

اشتہار

الحمد لله رب العالمين ربنا و سلطاناً و سيدنا و مرجعنا و معلمنا و مطراناً
چندہ کیا اور ایک مذر عربی پندرہ محرم الحرام ۱۲۷ھ سے جاری ہوا اور مولوی محمد مجتو
صاحب بالفعل بشایره مدد ہوا مقرر ہوئے، چونکہ لیاقت مولوی صاحب کی

بہت کچھ ہے اور تخفواہ بسبب قلتِ چندہ کے کم، ارادہ مہمان مدرس کا ہے کہ
بشر طو صول زر چندہ قابل اطیان ان جس کی امید کر رکھی ہے تخفواہ مولوی صاحب
موصوف کی زیارت کی جاؤے اور ایک مدرس فارسی و ریاضی کا مقرر ہو، جملہ
اہل ہمت و خیر خواہانِ ہند خصوصاً مسلمانان سکنائے دیوبند و قرب و جوار پر واضح
ہو کہ چندہ مفصلہ فہرست ہذا کے کہ جسکی میزان ۸۰/۱۰۰ ہے دوسرے اجنبی و افغان
خواراک و مدد خرچ طلبہ بیرونی و نجات کے جمع ہوا ہے اور رسول طالب علموں کا فر
جمع ہو گیا ہے اور انشاء اللہ روز بروز جمع ہوتا جاتا ہے، اس میں طلبہ بیرونی و نجات
کو کھانا پکا پکایا اور مکان رہنے کو ملے گا، کتابوں کا بند و بست بھی متعاقب ہو گا
نام مہتمان کے درج ذیل میں جن صاحبوں کو روپیہ چندہ بھیجا منظور ہو تو نہماً
اوئکے بذریعہ خط پرینگ ارسال فرمادیں، رسید اس کی بصیرت پیدا بھی جاویگی فقط
 حاجی عابدین حب، مولوی محمد قاسم حب، ناظوری، مولوی ہبتاب علی حب، مولوی
ذوق الفقار علی حب، مولوی فضل الرحمن حب، منتشر فضل حق حب، شیخ نہائی احمد حب
العبد، فضل حق، سربراہ کارمدرس عربی و فارسی و ریاضی قصیدہ دیوبند ضلع سہارنپور
تحریر تباریخ ۱۹ محرم ۱۴۲۸ھ برداز دو شنبہ

محلس شوری کی تشکیل ارالعلوم سے پہلے ہے

اس مختصر اشتہار میں یوں توکتی ہی باتیں قابل توجہ ہیں، کیونکہ اپنی تمام قوتوں
کو دین کی سر بلندی کیلئے وقف کرنے والے یہ اکابر یہ واضح نہیں فرمائے ہیں کہ ان کا

منصوب کیا ہے، کتنے عرصت تک پیشانیاں بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز رہیں۔ ججاز مقدس سے ہندوستان تک کتنے اکابر کے دل و دماغ نے غور و فکر کے کتنے مرحلے طے کئے، قید و بند اور ترک وطن کی کتنی منزوں سے گذرنے کے بعد اس اقدام کی نوبت آئی، وہ یہ سب کچھ دانستہ چھپا رہے ہیں، مگر جتنی باتیں بھی ظاہر کی گئی ہیں ان میں تین چیزیں خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔

۱۔ پہلی بات یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل، قیام دارالعلوم سے پہلے ہے یکونکہ اشتہار میں یہ تبلیغیا گیا ہے کہ اکثر اہل بہت نے جمع ہو کر چنڈہ کیا، اور بھر ایک مدرسہ عربی بجا رہا۔ اشتہار میں "مہتممان" کا لفظ دوبار آیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ فرد واحد کے ذریعہ نہیں بلکہ پوری ایک جماعت کے ذریعہ اس کا رخیر کی ابتداء ہوتی ہے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ مدرسہ کا چنڈہ کے علاوہ اور کوئی ذریعہ آمدی نہیں ہے تمام مصارف چنڈہ پر اختصار کرتے ہیں اور اسی لئے چنڈہ کے حصوں پر زور دیا گیا ہے۔

۳۔ تیسرا بات یہ ہے کہ چنڈہ وصول کرنے والا فرد واحد نہیں بلکہ چنڈہ وصول کرنے والے تمام بزرگوں کو مہتممان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ابتداء چنڈہ بھی جماعت کے نام پر آ رہا ہے اور مدرسہ کا لفظ و نسبت بھی باہمی مشورہ سے انہم پارہا ہے۔

اسی سال کی رواد میں ذکر آئیں مدرسہ کے عنوان سے بھی ۹ دفعات درج کی گئی ہیں جس کا مفہوم یہ ہوا کہ دستور اساسی کی بنیاد بھی اسی وقت پڑ گئی ہے، غرض اس اشتہار کے شوریٰ کی دارالعلوم سے پہلے تشکیل، شوریٰ کی بالادستی، چنڈہ کے شوریٰ کے نام پر آنے کی بات پوری طرح واضح ہے۔ البتہ یہ بات واضح نہیں ہے کہ یہ ایک مدرسہ نہیں بلکہ تحریک یعنی

لیکن ۱۲۸۵ء کی روادوکے آخر میں جواشہار دیا گیا ہے اس سے یہ صون بھی کسی نہ کسی درجہ میں واضح ہو جاتا ہے، اس اشتہار کا متن یہ ہے۔

خاتمہ دعاء و شکریہ

اہل ہزار ہزار شکردا احسان تیرا کہ ہم سے ناجائز بندوں سے تو نے ایسا کام بزرگ لیا اور نہ اس چھوٹے سے قبیہ دیوبند میں نہ ایسے ذمہ خود لوگ ہیں کہ کفیں اتنے بڑے کام بزرگ کے ہوتے اور نہ ایسے اسباب تعلیم و تعلم موجود تھے کہ جن سے امید اجراء تعلیم خیال میں آتے۔ یہ تیرا ہی احسان ہے کہ اتنے اتنے دور دراز جگہ پر سے کہ جہاں وہم و گمان بھی نسبتاً تھا اہل تہمت کو اس کی امداد پر متوجہ فرمایا اور طلبان علوم عربیہ کے لئے ایک درفیض کھول دیا۔ وَذُلِّكَ فَضْلُ اللَّهِ يُوْتِيهُ مَنْ يُشَاءُ
وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

اہل برکت دے تو ان کی تہمت عالی میں اور وسعت عطا فرما ان کے مال میں کہ معاون ہیں وہ اس مدح کے اور تہمت دے تو ان کو کہ تجویز و اجراء اس کا زینک کا داد اپنے شہروں میں بھی فرمائیں۔ آمین یا رب العالمین۔

اہل دیوبند نہایت شکر گذار ہیں ان باہمت صاحبوں کے جنہوں نے اسکی ترقی میں کار خیر سمجھ کر کوشش بیخ فرائی اور مال سے، کتب سے فہاٹش زبان سے دریغ نہ فرمایا اور نہایت خوش اپنی ظاہر کرتے ہیں اس امر پر کہ اکثر حضرات باہمت نے اجراء مدارس عربی کو تو میمع دیئے میں کوشش کر کے مدارس بنا کیے مختلف دلی، میرٹھ دخوبہ و بلند شہر و سہارنپور و دکن وغیرہ میں جلدی فرما اور دوسری جگہ مثل علی گڑھ "دینوں میں اس کا رک تجویز ہی بھرپی ہیں۔ اور

امید کرتے ہیں کہ ہم کو بھی وہاں کے حسابات و حالات سے کبھی کبھی جیسا کہ یہاں
کے مہتمم بھی کرتے ہیں مطلع فرماتے رہیں تاکہ جو عدہ انتظام ان کے مدارس میں
تجویز ہو وہیاں بھی جاری کئے جائیا کر دیں اور یہاں سے وہاں، اور نیجہ اس
نیک تدبیر کا یہ ہو گا کہ انتظام سب جگہ کے قریب یکساں ہو جاویں گے۔

المشتكى - ارباب مشورہ مدرس عربی دیوبند

حسب تجویز ارباب مشورہ مشتہر کئے گئے۔ المقام یکم محرم ۱۲۸۷ھ

العبد محمد فیض الدین مہتمم مدحہ

اس اشتہار میں بھی چندہ پرانخصار، ایک نے تحریر کی کامیابی اور توقع سے زیادہ
کامیابی پر بارگاہ خداوندی میں شکر و سپاس بیش کیا گیا ہے کہ اس طرح طلبہ کے لئے
درفیض کھل گیا ہے، مزید یہ کہ اس اشتہار میں یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ بہت سے مقامات
پر اکثر باہمیت حضرات نے مدارس عربیہ کی بنیاد ڈال دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرات
اکابر قدس اللہ اسرار ہم نے قیام مدارس کو تحریک کی شکل دیدی ہے۔

ان تمام مدارس کے درمیان رابطہ کی استواری پر بھی انتظام کی یکسانیت اور حساب
کتاب کی یکسانیت کے عنوان سے زور دیا گیا ہے تاکہ جو قابل قبول نظرم ایک جگہ جاری کیا
جائے، دوسری جگہ اس کو نافذ کر کے فائدہ اٹھایا جائے۔

اور سبکے اہم بات اس اشتہار میں یہ ہے کہ دو سال پہلے کے اشتہار میں جن
اکابر کے نام مہتممان کے لقب کے ساتھ درج کئے گئے تھے وہ اس اشتہار میں "ارباب مشورہ"
کے نام سے موسوم ہو گئے ہیں اور مہتمم اس ذات کا نام رکھا گیا ہے جس کو مجلس شوریٰ نے اپنی
تجاویز کے نفاذ کا مامور بنایا ہے، مثلاً یہی دوسری اشتہار ہے اس اشتہار پر مجلس شوریٰ کا

حکم بھی لکھا ہوا ہے یعنی محسب تجویز ارباب مشورہ مشتہر کرنے گئے۔
ان اشتہارات سے ہر صاحب نظر پر سمجھ سکتا ہے کہ مجلس شوریٰ کی تشکیل، دارالعلوم
دیوبند کی تاسیس سے پہلے ہے نیز یہ کہ مجلس شوریٰ روزاول ہی سے تمام معاملات کو اپنے
ماتحت لیکر چل رہی ہے، معمولی جزئیات یعنی اشتہارات تک کی طباعت کیلئے مجلس شوریٰ
کی تجویز و اجراحت کی ضرورت ہے، ایسا نہیں ہے کہ مجلس شوریٰ نے مہتمم کو اپنی المارت
کے لئے نامزد کیا ہوا اور اس کو اپنا امیر مقرر کر کے در و بست تمام اختیارات اس کے
سپرد کر دئے ہوں۔

چندہ پر چلنے والے مدارس میں شوریٰ کی اہمیت

ان ابتدائی اشتہارات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی اقتدار کے
ختم ہو جانے اور اس کی واپسی کی جدوجہد میں مایوسی کے بعد اسلام کے بقار اور اس کے
حفظ کیلئے یہ اکابر بے تاب ہیں اور انہوں نے اسلام کی حفاظت کیلئے مدارسِ عربی کے
قلعہ تعمیر کرنے کا پروگرام مرتب کیا ہے۔ مصارف کے سلسلے میں چندہ پر اخصار کو وہ سبے
پائیدار طریقہ سمجھ رہے ہیں، اب عام مسلمانوں سے چندہ حاصل کرنے کا طریقہ، اس کا شرعی
جواز اور اس کو مصارف خیر میں صرف کرنے کی گنجائش، یہ باتیں ارباب حل و عقد یعنی شوریٰ
کے بغیر نہیں اس لئے وہ سبے پہلے شوریٰ کی تشکیل فرماتے ہیں۔

اس موقف کو سمجھنے کیلئے حضرت مولانا عبد الرحمن سنگھی کا مدرس عربیہ کی صورت میں
نصبہ امامت پرستیل اقتباس بہت اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں حضرت مولانا نے فرمایا
کہ بلا دہنڈ میں کفار کے فلبے کے بعد امامت کا قیام، ایک فریضہ کے طور پر عائد ہوتا ہے۔ اور

اس فرض کی ادائیگی مدارس عربیہ قائم کرنے کی صورت میں ہو رہی ہے، لیکن اس اجمالی کی تفصیل اور اس موقف کو پوری طرح سمجھنے کیلئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب ہمارپوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے درمیان چندہ کے سلسلے میں ہونے والے خطاو کتابت کا نقل کرنا مناسب ہو گا۔

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کی خدمت میں تحریر فرمایا۔

”درست میں جو روپیہ آتا ہے اگر یہ وقف ہے تو بقار عین کے ساتھ انتفاع کہاں اور یہ ملک سلطی کا ہے تو اس کے مر جانے کے بعد واپسی ورش کی طرف واجب ہے:
(فتاویٰ خلیلیہ ص ۲۲)

سوال کا خلاصہ یہ ہے کہ مدارس عربیہ میں آنے والے چندہ کی نوعیت متعین فرمائی جائے۔ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ ہے کہ اس چندہ کو اسلامی بیت المال میں جمع ہونے والے اموال کی طرح قرار دیا جائے کہ سلطان یا اس کے نائبین ان اموال کو مصارف خیر میں ہر فر کرنے کے مجاز ہوں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت یہاں نہیں ہے کیونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے زوال کے بعد نہ سلطان موجود ہے نہ اسلامی بیت المال اس لئے حضرت حکیم الامم قدس سرہ نے سوال میں اس شق کا ذکر نہیں فرمایا۔

۲۔ دوسری صورت یہ ہے کہ چندہ میں آنے والے اموال کو وقف قرار دیا جائے مگر وقف کی تعریف امام ابو حیفہؓ کے یہاں حبس العین علی ملک الواقف والتصدق

بنفعتها او صرف منفعتها الی من احبت ہے۔ [لئے فتح القدير بحوالہ حاشیہ بدایہ ص ۱۶]

اور صاحبین کے یہاں وقف کی تعریف ہے جسہا لاعلی ملک احمد غیر اللہ یعنی امام صاحب کے یہاں وقف کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ شری موقوف کو واقف کی ملکیت قرار دیکر جوں کاتوں محفوظار کھا جائے اور اس کے منافع امور خیر میں یا واقف کی تصریح کے مطابق صرف کئے جاتے رہیں، اور صاحبین کے یہاں شری موقوف پر واقف کی ملکیت تو ختم ہو جاتی ہے مگر اس کو جوں کاتوں محفوظار کھا ضروری ہوتا ہے۔ البتہ منافع خرچ کئے جاتے رہیں گے۔ گویا امام صاحب اور صاحبین اس پرتفق ہیں کہ شری موقوف جوں کی توں محفوظ ہے گی اب حضرت اقدس مولانا اشرف علی قدس سرہ کے سوال کا خلاصہ یہ ہوا کہ اگر آنے والا چندہ وقف ہے تو ضروری ہو گا کہ آنے والی رقم بعینہ محفوظ ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تمیس خرچ ہوتی رہتی ہیں۔

۳۔ تیسرا صورت یہ ہے کہ یہ چندہ معطلی ہی کی ملک رہے، لیکن اس صورت میں یہ اشکال ہے کہ اگر چندہ کی رقم معطلی کی زندگی میں صرف ہو گئی تو کوئی اشکال نہیں۔ البتہ اگر خرچ میں آنے سے پہلے معطلی کا بالفرض انتقال ہو گیا تو ضروری ہو گا کہ یہ رقم معطل کے وارثین کو واپس کی جائے، جبکہ مدارسِ عربیہ میں اس کا کوئی انتظام نہیں ہے۔

گویا مدارسِ عربیہ میں آنے والے چندہ کے بارے میں تین شقوقوں میں کے ایک شق کو حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے ذکر ہی نہیں فرمایا تھا اور بقیہ دو شقوقوں پر اشکال وارد فرمائکر، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ نے تحریر فرمایا۔

”عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں، مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطین اور آخذین کی طرف سے دکھارہیں۔ لہذا نہ اس میں زکوٰۃ واجب ہو گی اور نہ

معطین واپس لے سکتے ہیں۔“ (فتاویٰ خلیلیہ ص ۱۹)

جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب قدس سرہ نے جو شش بہت پر اعتماد کر کے ذکر نہیں فرمائی تھی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اسی کو معین فرمایا کہ مدارس میں آنے والی رقم نہ وقف ہیں اور نہ معطین کی ملکیت ہیں، بلکہ اہل مدرانِ قوم کو دینے والوں کے وکیل ہونے کی حیثیت سے صرف کرتے ہیں، اسی طرح لیتے وقت وہ بینے والوں کے وکیل ہوتے ہیں جیسے اسلامی حکومت میں بیت المال کے کارکنان بینے اور دینے والوں کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے اس چندہ کے اموال میں زکوٰۃ بھی واجب نہ ہو گی، کیونکہ یہ فقرارِ کامال ہے اور نہ معطین کو واپس کیا جائے گا کیونکہ ان کی ملکیت سے یہ مال خارج ہو چکا ہے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے اس جواب پر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے بھر تحریر فرمایا۔

”عمال بیت المال منصوب من السلطان ہیں اور سلطان کی ولایت عامرہ ہے اس لئے وہ سب کا وکیل بن سکتا ہے اور مقیس میں ولایت عامرہ نہیں اسلئے آخذین کا وکیل کیسے بنے گا، کیونکہ نہ وکیل صریح ہے نہ دلالت ہے اور مقیس علیہ میں دلالت ہے کہ وہ سب اس کے زیر اطاعت میں اور وہ واجب اطاعت ہے۔“

(فتاویٰ خلیلیہ ص ۲۳)

اشکال کا حاصل یہ ہے کہ ہندوستان میں سلطان کے نہ ہونے کے سبب، اہل مدارس کو ولایتِ عامرہ حاصل نہیں ہے۔ اسلئے اہل مدارس معطین کے وکیل تو بن سکتے ہیں، کیونکہ معطین معین ہیں اور اس صورت میں ولایتِ عامرہ کی ضرورت نہیں، لیکن فقرار

کے وکیل بن کر ان اموال کو وصول کرنے کا جواز ولایتِ عامہ پر موقوف ہے کیونکہ فقر اور غیر متعین ہیں اور ان صورتوں میں ولایتِ عامہ ضروری ہے، چنانچہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے اس اشکال کے جواب میں تحریر فرمایا۔

”بندہ کے خیال میں سلطان میں دُو وصف ہیں، ایک حکومت جس کا شرط تنقیدِ حدود و قصاص ہے، دوسرہ انتظام حقوقِ عامہ، امر اوقل میں کوئی اس کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے، امر شانی میں اہل حل و عقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد کی راستے و مشورہ کے ساتھ نصب سلطان والستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی نظام مدارس جو برضائے ملاک و طلباء، ابقار دین کیلئے کیا گیا ہے بالاوی معتبر ہو گا۔ اور ذرا غور فرمائیں انتظام جمعہ کیلئے عامہ کا نصب امام معتبر ہونا ہی جزئیات میں اس کی نظریت شاید ہو سکے“ (فتاویٰ خلیلیہ ص ۲۲۵)

حضرات اکابر قدس سرہ کی اس علمی گفتگو میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے آخری جواب کی خط کشیدہ عبارت سے ہمارا مر عاصراحت کے ساتھ ثابت ہوتا ہے کیونکہ اول تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اپنی جلالتِ علمی کی بنیاد پر امتیازی مقام کے عالم اور بزرگ ہیں، دوسرے کہ وہ مدارسِ عربیہ کا جاہل پھیلانے والے اکابر مر جو میں کے وہن فیض سے بلا واسطہ والستہ ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکنی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہما اللہ سے ان کا تعلق بہت قریب کارہا ہے۔ اس لئے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا یہ بیان بظاہر ان کی انفرادی راستے نہیں بلکہ یقیناً اکابر سے ان کے سمجھے ہوئے طریق کا رکی مضبوط شہادت ہے کہ ارباب حل و عقد

(مجلس شوریٰ) کی رائے اور شورے سے چونکہ نصب سلطان بھی وابستہ ہے اس لئے سلطان یعنی اقتدار اعلیٰ کی عدم موجودگی میں، مجلس شوریٰ تشکیل کر کے اسلام اور حقوق عامّت کے تحفظ کا انتظام کیا جائے گا۔

گویا مجلس شوریٰ صرف مشورہ کی سنت یا اس کے وجوب سے عہدہ برآئہ ہے کیا تھکیل نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ مدارسِ عربیہ میں چندہ کے ذریعہ حاصل ہونے والی آمدنی کے جواز کی مجبوری بھی ہے کہ اس کے بغیر مدارسِ عربیہ کا نظام کامکمل ہی نہیں ہوتا۔

نیز یہ کہ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ، گوک حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ سے سوال کے وقت اس اہم نکتہ کی جانب متوجہ نہیں تھے، مگر توجہ دلانے کے بعد وہ بھی اس حقیقت سے متفق ہو گئے، بوادر انوار در میں حضرت اقدس کا یہ ارشاد موجود ہے۔

”تو اعد شرعی سے ثابت ہے کہ جہاں امیر نہ ہو عام مسلمین جن میں ارباب حل و عقد بھی ہوں قائم مقام امیر کے ہوتے ہیں۔“ (بوادر انوار ص ۴۵)

حضرت مولانا عبد اللہ صاحب سندھی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہار پوری اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہم اللہ کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ چندہ کے ذریعہ چلنے والے مدارسِ عربیہ میں مجلس شوریٰ، محض شورے کے حکم کی تعییں کیلئے نہیں ہے۔ بلکہ یہ ارباب حل و عقد کی وہ مجلس ہے جس کے ذریعہ عوامی چندہ کا جواز حاصل ہوتا ہے، اور اگر مجلس شوریٰ سے صرف نظر کر لیا جائے تو حضرت تھانوی قدس سرہ کے اس اشکال کا حل و شوار ہو جائے گا کہ چندہ کو وقف قرار دیا جائے تو

اس کو بعینہ باقی رکھنا ضروری ہو گا اور اگر اس کو معطل کی ملکیت قرار دیا جائے تو خروج سے پہلے معطل کے انتقال کی صورت میں وارثین کی طرف اس کی واپسی ضروری ہو جائے گی جب کہ یہ دونوں صورتیں مدارس عربیہ میں راجح نہیں۔

مدارس عربیہ کے نظام کا ریس مجلس شوریٰ کی اسی شرعی حیثیت کے سبب روز اول سے اس کو اسی طرح بالا دستی حاصل رہی ہے جس طرح اسلامی نظام حکومت میں سلطان یا خلیفۃ المنین کو رہتی ہے کہ۔

(الف) عوامی چندے سے چلنے والے مدارس عربیہ کا قیام مجلس شوریٰ کے ذریعہ عمل میں آتا رہا ہے۔

(ب) قوانین اور دستور اساسی کی تدوین مجلس شوریٰ اور اسکے ارکان کے ذریعہ عمل میں آتی رہی ہے۔

(ج) تمام مدرسین، کارکنان اور خود تہم کے عزل و نصب کے تمام اختیارات مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں رہے ہیں۔

(د) مالیات کی فراہمیہ مجلس شوریٰ کے اعتماد پر ہوتی رہی ہے اور مجلس شوریٰ کی ہی چندہ کے اموال کو مصارف خیر میں صرف کرنے کے احکام صادر کرتی رہی ہے۔

(۴) اور ہر دور کے اکابر نے ہمیشہ مجلس شوریٰ کی بالا دستی کا اپنے اپنے نگ میں اعتراف کیا ہے، مناسب ہو گا کہ یہاں چند اکابر کی تصریحات نقل کر دی جائیں۔

مجلس شوریٰ کی بالا دستی کے سلسلے میں حضرت مانو توی کی تحریر

جع اسلام حضرت مولانا محمد فاقم صاحب نانو توی قدس سرہ، ہندوستان میں اس

برگزیدہ جماعت کے امیر کاروں میں جس نے حکومت وقت کی سربراہی، یا صاحبِ ثروت مسلمانوں کی امداد یا مخصوص اوقاف کی آمدی پر انصار کے بجائے عمومی چندے کے ذریعہ مدارس عربیہ کو چلانے کی بنیاد ڈالی ہے، حضرت اقدس نے دارالعلوم یا اس نجی پر چلنے والے مدارس کیلئے اساسی طور پر آٹھ اصول قلمبند فرمائے ہیں، ان میں بے مقصص دفعہ مجلسِ شوریٰ سے متعلق ہے جس کا متن یہ ہے۔

”مشیرانِ مدرسہ کو ہمیشہ یہ بات ملحوظ رہے کہ مدرسہ کی خوبی اور اسلوبی ہو، اپنی بات کی توحیح کی جائے، خدا نخواستہ جب اس کی نوبت آجائے گی کہ اہل شورہ کو اپنی مخالفت رائے اور اورول کی رائے کے موافق ہونا ناگوار ہو تو پھر اس مدرسہ کی بنیاد میں تزلزل آجائے گا، القصہ تہہ دل سے بڑ وقت مشورہ اور نیز اس کے پس و پیش میں اسلوبی مدرسہ ملحوظ رہے سخن پروردی نہ ہو اور اس لئے ضرور ہے کہ اہل مشورہ افہار رائے میں کسی وجہ سے تماش نہ ہوں اور سامعین بہ نیت نیک اس کو سنیں یعنی یہ خیال رہے کہ اگر دوسرے کی بات سمجھی میں آجائے گی تو اگرچہ ہمارے مخالف ہی کیوں نہ ہو بدلوں و جان قبول کریں گے۔

اور نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ مہتمم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے، خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا کوئی وارد و صادر ہو جو علم و عقل رکھتا ہو اور مدرسہ کا خیر انداز لے۔ اور نیز

لئے واردین و صادرین سے مشورہ کی اجازت سے یہ غلط فہمی نہ ہوں چاہئے کہ مہتمم مجلسِ شوریٰ کے پابند نہیں ہیں، کیونکہ حضرت اقدسؐ کی یہ تحریر اولاداً تو مستور اسکی کی تدوین سے پہلے کی بات ہے جب کوئی (بات) بر منظہ،

اسی وجہ سے ضرور ہے کہ اگر اتفاق کے کسی وجہ سے مشورہ کی نوبت نہ آئے اور بقدر ضرورت اہل مشورہ کی مقدار معتقد ہے مشورہ کیا گیا ہو تو پھر وہ شخص اس وجہ سے ناخوش نہ ہو کہ مجھ سے کیوں نہ پوچھا، ہاں اگر ہم تم نے کسی سے نہ پوچھا تو پھر ہر اہل مشورہ معترض ہو سکتا ہے ॥ (طبعہ عہد مشورہ دستور اسائی) مجلس شوریٰ سے متعلق حضرت اقدس کی اسن الہامی عبارت میں یوں تو کتنے ہی اشارے ہیں لیکن جواہم با تیں بیک نظر سمجھ میں آتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ چندہ سے چلنے والے مدارس عربیہ میں حضرت اقدس مجلس شوریٰ کو ضروری قرار دے رہے ہیں۔ کیونکہ اصول ہشتگانہ پر جو عنوان حضرت نے قائم فرمایا ہے وہ یہ ہے ”وہ اصول جن پر مدرس (عینی دارالعلوم) اور نیز اور مدارس چندہ مبنی معلوم ہوتے ہیں“ گویا بنیادی طور پر حضرت اقدس نے چندہ سے چلنے والے مدارس کیلئے مشورہ، مجلس شوریٰ، اور اس کی اہمیت پر پورا ذور دیا ہے۔

۲۔ امور مشورہ طلب میں حضرت اقدس نے ہمیتم کو مشورہ کا پابند بنایا ہے، اور اس پابندی کیلئے عبارت میں دوبار لفظ ”ضرور“ کا استعمال فرمایا ہے کہ ”نیز اسی وجہ سے یہ ضرور ہے کہ ہمیتم امور مشورہ طلب میں اہل مشورہ سے ضرور مشورہ کیا کرے“

۳۔ باقاعدہ ممبرانِ شوریٰ کی نامزدگی کی بھی صراحت ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے ”خواہ وہ لوگ ہوں جو ہمیشہ مشیر مدرسہ رہتے ہیں یا ہمیشہ مشیر مدرسہ رہنا اسی وقت ممکن ہے جب مجلس شوریٰ کے ممبران کی باقاعدہ نامزدگی ہو۔

(بقیہ حاشیہ مذکورہ کا) شقی وضاحت کے ساتھ متعین نہیں تھی، ثانیاً یہ کہ واردین و صادرین سے مشورہ کا مفتر ہے ہمکار ہے جنہات کے مشورہ کو اہمیت دی جائے اور مجلس شوریٰ میں پیش کر کے منظور کرایا جائے۔

۷۔ تمام ممبرانِ شوری کی حاضری کو ضروری نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ معتقد ہے تعداد سے مشورہ کر لینے کو کافی قرار دیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جماعت الاسلام مولانا محمد قاسم صنا نا نو توی قدس سرہ نے نصف یہ کہ اس دفعہ میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی تصریح کی ہے بلکہ مجلس شوریٰ کے سلسلے میں بعض اہم جزئیات تک کی صراحت فرمادی ہے۔ اور مہتمم کو ہر حال میں شوریٰ کا پابند قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا فیض الدین ضاقدس، ہمدم دوم کی تحریر

شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں دوسری قدم صراحت، حضرت مولانا فیض الدین صنا قدس سرہ، ہمدم دوم کے وہ اصول ہستہگانہ ہیں جن میں بیشتر دفعات مجلس شوریٰ ہی سے متعلق ہیں، یہاں وہ تمام دفعات نقل کی جا رہی ہیں۔ تاکہ دارالعلوم کے ابتدائی آیام میں شوریٰ کی قانونی اور عملی بالادستی کی صحیح تصویز لگا ہوں میں آسکے یہ تحریر ۲۸۹ھ میں بعضی دارالعلوم کی تاسیس کے صرف پانچ سال کے بعد مرتب ہوئی ہے۔

۱۔ ہر کادر خانہ کے امور جزئیک بنا ایک شخص کی رائے پر رہنی چاہئے، اس قاعدہ پر اس کادر خانہ کے امور جزئیہ کے انجام میں کسی صاحب کو اہل مشورہ میں سے دخل نہ ہو، الامشوہ اور رائے کر دے اپنے موقع پر اٹھا فرمادیں جیسا اہل شوریٰ مل کر پسند کریں مقبول ہو گا۔
۲۔ امور جزئیہ میں جو کوئی صاحب بندہ کے مددگار ہوں گے یا اچھا مشورہ دیں گے بندہ ان کا شکور ہو گا مگر اب ایام ان کا موقوف بندہ ہی کی رائے پر رہنا چاہئے۔

۳۔ جس کسی صاحب کو خواہ اہل شوریٰ خواہ اور عام خلق کوئی امر قابل اعتراض نہ ہو تو ہمہ میں سے مزاحمت نہیں جلسہ شوریٰ میں کیش کر کے اس کو طے کرائیں اور جیسا فرار پاؤ

اس کے انجام پر مہتمم کو عذر نہ ہو گا۔

۷۔ مشورہ کے جلسہ جب کبھی ہوں بے حاضری مہتمم نہ ہوں گے اگرچہ اس کی ہی کسی بات پر خودہ ہو اور یوں اہل شوریٰ کو اختیار اعتراف کا ہر وقت ہے اور مہتمم کو موقع جواب کا۔
۸۔ مہتمم اگر اہل شوریٰ کے اجتماع تک کسی امر ضروری کے انجام میں انتظار نہ کر سکے تو بذریعہ خط سب صاحبوں کو اطلاع دے گا۔ اور اس ضروری امر کو سب صاحبوں کو قبول کرنا ہو گا۔

۹۔ آمدی مدرس کی مہتمم کے ہاتھ میں رہے گی کیونکہ صرف ضروری کیلئے کسی قدر روپیہ مہتمم کے ہاتھ میں رہنا ضرور ہے۔ حاجتِ ضروری سے زیادہ روپیہ جب جمع ہو جایا کر لگا تو خدا پنچ کے پاس جمع کر دیا جاوے گا۔

۱۰۔ ہر روز وقت مقررہ مدرس پر مہتمم مدرس میں جایا کرے گا اور اسی وقت میں امور متعلقہ مدرس کو انجام دیا کرے گا۔

۱۱۔ مناسب ہے کہ سب اہل شوریٰ مل کر اپنے مستحکم اس معروضہ پر فرمادیں کہ مہتمم کو جائے سندھ ہے۔ تحریر تاریخ سارذی تعدادہ ۱۲۸۹

العبد العبد العبد

محمد قاسم عفی عنہ ذُو الفقار علی محمد عابد

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب قدس سرہ، اکابر دیوبند کے شیخ حدیث حضرت مولانا عبد الغنی مجددی قدس سرہ سے خصوصی نسبت فیض رکھنے والے بزرگ ہیں، ان کی مندرجہ بالا تحریر کی ایک ایک دفعہ مجلس شوریٰ کی بالادستی کی صراحت کر رہی ہے۔

پہلی اور دوسری دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے امور جزئیہ کی انجام دہی کا اختیار

طلب فرما رہے ہیں، اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ ۲۸۷۳ء تک مجلس شوریٰ امور جزئیہ کی انجام دہی میں بھی پوری طرح دخیل ہے، بظاہر امور جزئیہ سے مراد روزمرہ کے وہ کام ہیں جن کی بنیادی پالیسی مجلس شوریٰ نے وضع کر دی ہو، اور صرف اس پالیسی کو جزئیات پر منطبق کرنے کی بات باقی رہ گئی ہو۔

تیسرا دفعہ میں بالکل صراحةً کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ جلسہ شوریٰ میں جو طے ہو جائے چاہتہم کو اس کی تعییں میں کوئی عذر نہ ہو گا، یہ نہیں فرمائے ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ممبران کا کام، مسئلہ زیر غور کے تمام پہلوؤں کو سامنے کر دینا ہے اور پیش کردہ پہلوؤں میں کسی ایک کا انتخاب چاہتہم کر دیں گے۔ بلکہ وہ یہ فرمائے ہیں کہ ”جیسا اقرار پاؤے اس کے انجام پر چاہتہم کو عذر نہ ہو گا۔“

چوتھی دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے یہ درخواست فرمائے ہیں کہ شوریٰ کا جلسہ چاہتہم کی عدم موجودگی میں نہ کیا جائے۔

پانچویں دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے ہنگامی امور کی انجام دہی کا اختیار طلب فرمائے ہیں چھٹی دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ سے ضروری مصارف کیلئے رقم اپنے پاس رکھنے کی اجازت لے رہے ہیں۔

ساتویں دفعہ میں وہ مجلس شوریٰ کو مطلع فرمائے ہیں کہ وہ ہبہ وقت امور مدرسہ کی انجام دہی سے قاصر ہیں وقت مقررہ پر آیا کر دیں گے۔

چوتھی دفعہ سے ساتویں دفعہ تک تمام ہی دفعات مجلس شوریٰ کی بالادستی اور چاہتہم کے شوریٰ کی ماتحتی میں کام کرنے کی صراحةً پر مشتمل ہیں۔

اور آٹھویں دفعہ تو مجلس شوریٰ کے ہدایت حاکم ہونے کیلئے بالکل صراحةً کا درجہ

رکھتی ہے کیونکہ انہوں نے اپنی معروضات مبارن شوریٰ کی خدمت میں پیش کر کے اسکی منظوری لی ہے اور یہ فرمایا ہے کہ سب حضرات دستخط فرمادیں تاکہ یہ تحریر مسموم کے پاس وثیقہ اور سند کے طور پر محفوظ رہے۔

پھر یہ کہ حضرت مولانا فیض الدین صاحب کی اس تحریر پر، حضرت اقدس مولانا محمد تقیؒ حضرت مولانا ذوالفقار علی او حضرت حاجی سید عابدین قدس اللہ اسرار ہم کے دستخط میں، گویا اس تحریر میں شوریٰ کی بالادستی، اور شوریٰ کے سیدت حاکم ہونے کی جہت پر اس دور کے تمام ہی اکابر کا اتفاق ہے، ان اکابر میں کوئی یہ تحریر نہیں کرتا کہ حضرت ہم صاحب آپ یہ کیا قلب موضوع فرمائے ہیں، مجلس شوریٰ کا کام تو زیر غور مسائل میں مختلف جواب کو پیش کر دینا ہے باقی ان جواب میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دینا تو آپ ہی کا کام ہے۔ دارالعلوم کے ابتدائی ایام میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی یہ بات یہیں ختم نہیں ہو چکی بلکہ تمام روادوں میں مجلس شوریٰ کی جانب سے آئین مدار کے طور پر مستقل مختلف چیزیں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتی رہی ہیں جن میں ضروریات کے مطابق برابر اضافہ ہوتا رہا ہے۔ روادوں میں آنے والی یہ دفعات، مجلس شوریٰ کے ہر دو میں بالادستی اور سیدت حاکم ہونے کی حیثیت کو واضح کرنی پڑیں اور ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ اکابر مرحومین حرم اللہ عزیز نے مفادت مبارکہ تحریر کیے ہیں اور مذکورین کے قائم مقام کی حیثیت سے ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ کی تشکیل کی تھی۔

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علیٰ حسن تھانویؒ کی تحریر

حکیم الامّت مولانا اشرف علیٰ تھانوی قدس سرہ کے بارے میں شہرت دیجाहی ہے

کروہ مجلس شوریٰ کی بالادستی یا ہمیستِ حاکم ہونے کی جہت سے تفقیق نہیں تھے لیکن یہ بات حضرت اقدس کی تصریحات کے بالکل خلاف ہے، حضرت اقدس کے نقطۂ نظر کی تفصیلی وضاحت تو آئندہ صفحات میں کی جائے گی، یہاں ان کی صرف ایک تحریر نقل کی جا رہی ہے، یہ تحریر اس وقت کی ہے جب حضرت حکیم الامت کے دور پرستی میں حضرت مولانا فاریٰ محمد طیب صاحب قدس سرہ کے نائب مسٹرم مقرر کئے جانے پر ناخوشگوارہ عمل سامنے آیا تو بھی شیست سرپرست حضرت حکیم الامت کی جانب سے ایک اعلان عام شائع کیا گیا جو اس وقت متعدد اخبارات و رسائل میں شائع ہوا، اور اس کی اصل کاپی دارالعلوم کے محافظ خانہ میں محفوظ ہے، اس اعلان کا متن یہ ہے۔

۱۔ اعلان عام کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کسی کاملوں نہیں ہے، نہ اس کے اہم ایں دراثت جاری ہو سکتی ہے، خاندان مولانا محمد فاریم صاحب کو دارالعلوم کے ساتھ خصوصیت بے شک حاصل ہے مگر اس کا یہ شرہ نہیں ہو سکتا کہ اہم دارالعلوم بطور دراثت اوی خاندان میں قائم رہے۔ اگر ہزار ماہ کی مجلس شوریٰ بطور حق شناہی و بنیال حُسین انتظام و مصالح دارالعلوم اس خاندان کے اہل افراد کا انتخاب کریں تو مستحسن ہے، اور اگر باوجود مذکورین کی ابیت کے کسی دو سے شخص کا انتخاب کریں یہ بھی ان کو افتخار ہے۔

یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ مولوی حافظ فاریٰ محمد طیب صاحب دارالعلوم کی مدسری کے ساتھ نیابت اہم کیلئے بھی نامزد کئے گئے میں لیکن یہ ضرور نہیں ہے کہ وہ مسٹرم بھی بنائے جائیں یا بیشتر کیلئے وہ نائب مسٹرم رہیں، مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار ہے۔ فقط۔

اسید ہے کہ اب اس عالم میں کسی کو کوئی شبہ نہ رہا ہوگا۔

ان ارید الا اصلاح ما استطعت وَمَا تُؤْتِيَ الْأَبَدُهُ عَلَيْهِ تَوْكِيدٌ إِنَّمَا

کتبہ اشرف علی تھانوی سادہ شعبان

اس اعلان عام میں حضرت حکیم الامت نے صراحت کے ساتھ مجلس شوریٰ

کی بلا دستی اور بیعت حاکر ہونے کی وضاحت فرمائی ہے، وہ ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ

کو یہ اختیار دے رہے ہیں کہ اگر امیت کی بنیاد پر اس فائدان کے افراد کا انتخاب

کریں تو ستم سن بات ہوگی لیکن امیت کے باوجود وہ کسی دوسرے کو نامزد کریں۔

تو اس کا مجلس شوریٰ کو اختیار ہے پھر اس کے بعد ہم یا نائب نامزد کرنے کے

باوصف وہ تغیر و تبدل کا اختیار تسلیم فرمائے ہیں، وہ یہ نہیں فرمائے ہے میں

کہ نامزد کئے جانے کے بعد ہم ہم کی حیثیت امیر کی ہو جاتی ہے اور اب وہ مجلس شوریٰ

کا بھی امیر بن جاتا ہے اور شوریٰ کا کام صرف یہ رد جاتا ہے کہ زیر بحث معاملہ کے

مختلف گوشوں کو امیر کے سامنے رکھ دے تاکہ امیر اپنی صواب دیدیں اور اختیار سے پیش کر دے

گوشوں میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دیں۔ بلکہ حضرت حکیم الامت نے پوئی

طااقت کے ساتھ ہم ہم کے عزل و نصب کا اختیار ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ کو دیا ہے۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیدین احمد ردنی قدس سرہ کی تحریر

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیدین احمد ردنی، مدینی قدس سرہ، عوامی چندرہ

سے مدارس عربیہ کی بنیاد رکھنے والے اکابر میں حضرت حاجی امداد اشر، قطب العالم

حضرت مولانا شید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ سے بر اہ راست اکتساب فیض

کرنے والے بزرگ ہیں، اس لئے مجلس شوریٰ کے بارے میں ان کی کوئی بھی تحریر ان کا اپنا اجتہاد نہیں، بلکہ اکابر سے سمجھے ہوتے طریق کار کی مضبوط اشہاد ہے یہاں حضرت اقدس رحمہ اللہ کی وہ تحریر دی جا رہی ہے جو مدرسہ شاہی ناراضگی کے طور پر سپرد فلم فرمائی گئی ہے، یہ اصل تحریر آج بھی مدرسہ شاہی کے مجلس شوریٰ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، اس کا متن یہ ہے۔

”ہر جمہوری ادارہ کی قوتِ حاکم مجلس ممبران ہے، یہی مجلس عوام کی نمائندگی ہے اور اسی کے ہاتھ میں تمام امور عزل و نصب ترقی و تنزل وغیرہ متعلقہ ادارہ ہیں، تمام ملازمین ادارہ خواہ مدرس ہوں یا غیر مدرس اور پہنچتک اسی مجلس کے سامنے جوابدہ اور حسب قوانین ادارہ مکلفا اور پابند ہیں، کسی ملازم یا مدرس کو جائز نہیں ہے کہ جب تک وہ اس ادارہ کی ملازمت میں ہے مجلس کے احکام سے روگردانی کرے یہی حال تمام مدارس دینیہ جمہوریہ کا۔ ممبرانِ شوریٰ چندہ دہنگان کے نمائندگی اور ملازمان مدرس کے حاکم ہیں، کسی مدرس کو..... احکام مجلس شوریٰ سے سرتباہی کرنا درست نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی حرکت جائز ہے جس سے ادارہ کو نقصان اور اس کے نظم و نسق میں ابتری پیدا ہو، مجلس عاملہ اسی مجلس شوریٰ کی مقرر کردہ مجلس ہے، اس کی سرتباہی کرنا، مجلس شوریٰ حاکم کی سرتباہی ہے۔ اس لئے ان حضرات کے مذکورہ بالاعمال اقوال سرا منزلا جائز ہیں، اگر وہ پابندی عاملہ کے احکام کی نہیں کرتے ہیں تو

ان کو ادارہ سے علاحدہ ہو جانا چاہئے، ادارہ میں رہتے ہوئے ایسے اعمال کا یا ایسے اقوال کا رنگاب سراسر بغاوت اور عند الشد و عند الناس گرفت کا موجب ہے، ان حضرات کو غور کرنا اور اپنے ان مہل اور ناجائز امور سے تائب ہونا از حد ضروری ہے، ان کو جامعہ فاسیمیٹا ہی مسجد کو نقصان پہنچانا انتہائی شرمناک اور نمک حرامی ہے۔

والی اللہ المشتكی شیخ اسلام حسین احمد غفرلہ

از دارالعلوم دیوبند، ۸ شعبان ۱۴۳۷ھ

غور فرمایا جائے کہ حضرت شیخ الاسلام کی تحریر میں مجلس شوریٰ کی بالادی اور نیت حاکم ہونے کی کتنے جاہ و جلال اور کتنے پر شکوہ انداز میں صراحت ہے، حضرت اقدس قدس سرہ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ مجلس شوریٰ کا کام تجاوزی اور رائے پیش کر دینا ہے اور اس میں سے اختیاب یا ترجیح کا عمل، مہتمم کے دائرہ اختیار میں ہے، بلکہ وہ یہ فرمائے ہیں کہ عوامی چندے سے چلنے والے تمام دینی مدارس میں مجلس شوریٰ ہی حاکم ہے، اور اس کے احکام کی خلاف ورزی ناجائز ہے۔ بلکہ اس طرح کی ذہنیت رکھنے والوں پر حضرت اقدس نہایت بر جم ہیں اور ان کے اعمال کو شرمناک اور نمک حرامی سے تعمیر فرمائے ہیں۔

لکنی چیرت انگیزبات ہے کہ حضرت حکیم الاقریت قدس سرہ تو مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار دے رہے ہیں اور حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ عوامی چندہ سے چلنے والے تمام مدارس میں اور پر سے نیچے تک تمام ملازمین کو قوانین ادارہ کے مطابق مجلس کے سامنے جواب دہ قرار دے رہے ہیں اور یہ فرمائے ہیں

کے مجلس شوریٰ ان پر حاکم ہے، لیکن انہی دونوں بزرگوں سے نسبت طریقت اور نسبت تلمذ کا شرف رکھنے والے حضرات یہ صراحت کر رہے ہیں کہ جس دستور اسلامی میں مجلس شوریٰ کو خاکم اور ہمکو محکوم قرار دیا گیا ہے وہ غیر شرعی ہے اور اس کو تبدیل کر کے شریعت کے مطابق کرنا ضروری ہے

دستور اسلامی کی تدوین کا طریقہ

حالانکہ دستور اسلامی بالغ نظر قہار کرام کے مرتب فرمودہ اسی معاہدہ شرعی کا نام ہے جس کی ایک ایک دفعہ شریعت غیر امرکی روشنی میں مرتب کی گئی ہے اور ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان پر یا آیہ‌ها الذین امنوا اوفوا بالعقود، اے ایمان والو! معاہدات کو پورا کرو، نیز اوفوا بالعهد ان العهد مکان مسئولاً، باہمی معاہدات کی پابندی کرو، کہ پیشک عہد کے بارے میں باز پرس ہوگی، کی رُو سے اس کی پابندی لازم ہے۔

دستور اسلامی، اکابر دارالعلوم میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمہما اللہ کے عہد سے حضرت شیخ الاسلام کے عہد تک مجلس شوریٰ کی تجویز پر مشتمل ایک مضبوط دستاویز ہے کیونکہ ابتداء میں دارالعلوم در دبست مجلس شوریٰ کی تحویل میں چلتا رہا اور جس سلسلے میں ضرورت پیش آتی رہی اکابر دارالعلوم شریعت کے مطابق احکام نافذ فرماتے رہے۔ اکابر دارالعلوم اور مجلس شوریٰ کے یہ احکام "آئین مدرس" کے نام سے سال اول کی روادو سے طبع ہوتے رہے ہیں۔ پھر ترقی پزیر دارالعلوم میں اس دستور کے باقاعدہ مرتب کرنے کی ضرورت

محسوس ہوئی تو مجلس شوریٰ کے ایک تجربہ کار اور قانونی دماغ رکھنے والے ممبر مولانا محمود احمد صاحب رام پوری نے مجلس شوریٰ کے حکم سے ایک مختصر دستور اساسی مرتب کیا، پھر کچھ دنوں کے بعد ابوحنیفہ ہند حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب نے مجلس شوریٰ ہی کے حکم سے اس پر نظر ثانی فرما کر اس کو باقاعدہ اور مفصل بنایا، پھر ۱۳۶۷ھ کے بعد مجلس شوریٰ نے مکمل اور مفصل دستور کی ضرورت محسوس کی اور اس وقت کے مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمہ اللہ کو دستور اساسی مرتب کرنے کا مکلف کیا موصوف نے ۱۳۶۸ھ میں دستور مرتب فرما کر مجلس شوریٰ میں پیش کیا، موصوف نے مطبوعہ مسودہ کی ابتداء میں اس کی ترتیب و تدوین کے طریقہ پر روشی ڈالتے ہوئے تحریر فرمایا۔

”حسب ایمار مجلس، احقر نے دستور اساسی مرتبہ مولوی محمود احمد صاحب رام پوری ممبر دارالعلوم اور آئینِ دارالعلوم بقدر مطبوعہ مرتبہ حضرت علامہ مفتی محمد کفایت اللہ صاحب دامت برکاتہم کو سامنے رکھ کر اپنے تجربات اور مذکورہ اصول خمس کی روشنی میں ضروری رتو بدلت اور حذف و اضافہ کے ساتھ جدید آئین کا یہ مطبوعہ مرتب کیا ہے۔“ (سودہ دستور اساسی) مطبوعہ چند لائنوں کے بعد مزید رقم طراز میں۔

”اکثر و بیشتر ترمیمات وغیرہ میں حضرت نافتوی اور حضرت گنگوہیا رحمہما اللہ کے زمانہ کے تعالیٰ اور مرتب شدہ قواعد کو مشعل راہ بنایا گیا ہے جس کے لئے میں نے ان دونوں زمانوں کی مردماد ہائے شوریٰ کا بالاستیعاب مطالعہ کیا اور اپنی فہم کی رسائی تک ان میں کے طے شدہ مہمات امور کی

فہرست بنک اس کا اساسی اور نظری حصہ اس آئین میں لے لیا ہے۔

رسویہ دستور اساسی ص ۳ (طبوعہ

گویا حضرت نانو تویؓ اور حضرت گنگو ہیؓ کے عہد نیمون سے دیگر اکابر کے عہد تک کی مجلس شوریٰ کی تجویز اور کچھ بنیادی رہنمایا اصول کو سامنے رکھ کر پہ دستور اساسی مرتب کیا گیا ہے، پھر مختلف مجلسوں میں اس پر بحث ہوتی رہی اور آخر ۲۲ شعبان ۱۳۷۸ھ کی مجلس شوریٰ نے، دستور اساسی کی مکمل خواندگی کے بعد ٹلے کیا کہ یہ دستور اخراجی ۱۳۷۸ھ سے نافذ العمل سمجھا جائے۔ اور آج تک اسی دستور کے مطابق عمل ہو رہا ہے۔

اس مبارک اور پسندیدہ دستور اساسی کے بارے میں غیر شرعی ہونے کا قتوںی بہت بڑی جسارت معلوم ہوتا ہے جس کی حضرت حکیم الامت اور حضرت شیخ الاسلام کے منتسبین سے بالکل توقع نہیں تھی، بلکہ چندہ سے چلنے والے مدارس عربیہ کی ایک صدی سے زائد کی طویل تاریخ، اور اکابر کی تصریحات کے مطابق حقیقت یہ ہے کہ ان مدارس عربیہ کی بنیاد، حض تعلیم گاہ کے تصور سے نہیں ڈالی گئی ہے۔ ان مدارس کا حقیقی مقصد خدا کی سب سے بڑی نعمت یعنی دین کا تحفظ ہے۔ اس لئے حضرات اکابر نے ان مدارس کے نظام کا کو اس طرح مرتب فرمایا ہے۔

ا۔ ارباب حل و عقد کی ایک باقاعدہ مجلس ہو گی جو امیر المؤمنین کے قائم مقام کی حیثیت سے مدارکے تمام معاملات میں حاکم ہو گی اور وہ چندہ کی وصولیابی اور اس کو مصارف میں صرف کرنے کی اجازت دے گی، چندہ ہی دن کے بعد اس مجلس کا نام ”مجلس شوریٰ“ ہو گیا۔

۲۔ مجلس شوریٰ روز مرہ کے کاموں کی انعام دہی اور شریعت کے مطابق صادر کردہ اپنے فیصلوں کی تنفیذ کے لئے ایک شخصیت کا انتخاب کرے گی، اس اہم کام کے لئے منتخب شخصیت کو مہتمم یا ناظم کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

۳۔ مجلس شوریٰ کے یہی فیصلے اس درجہ کا دستور اساسی ہوں گے، چنانچہ روز اول سے مجلس کے صادر کردہ احکام پر غور و خوض کر کے جو قوانین یکجا کئے گئے، ان کا نام "دستور اساسی" رکھا گیا۔

حضرات اکابر قدس اللہ اسرار ہم کا جاری کردہ یہ طریقی کار بلاشک، شریعت کے بالکل مطابق، اور عصر حاضر کے تمام تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ ہے اور کسی اجتماعی کام میں جتنے اندیشے ہو سکتے ہیں اس طریقی کار میں ان تمام اندیشوں سے امکان کی حد تک تحفظ پایا جاتا ہے اور اسی لئے ہر دور کے اکابر نے اپنے اپنے رنگ میں مجلس شوریٰ کے ہدایت حاکم ہونے کی صراحت فرمائی ہے اور مہتمم کو بھی اس کے درجہ کے مطابق امیر سیم کیا ہے اور امور مفتوحہ کی انعام دہی میں سہولت کے بقدر ان کو صاحب اختیار قرار دیا ہے۔

زیر بحث موضوع کے تجزیہ کی صحیح بنیادیں

حضرات اکابر قدس اللہ اسرار ہم کے نقطہ نظر کے خلاف، ایک دوسرے نقطے نظر سامنے آیا ہے جس میں مہتمم کو امیر قرار دیکر مجلس شوریٰ کو اس کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر کا دعویٰ یہ ہے کہ صرف مہتمم ہی اولو الامر کا مصدقہ ہیں مجلس شوریٰ اس کا مصدقہ نہیں ہے، اس دوسرے نقطہ نظر کے سامنے آنے کے بعد

ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان چند امور کو معین اور منقح کر لیا جائے جن پر اس بحث میں صحیح نتیجہ تک پہنچنے کا انحصار ہے۔

۱۔ صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے سبے بنیادی باتیں یہ ہے کہ "اولو الامر" کے مصدقہ کا تعین کر لیا جائے، اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ اولو الامر کا مصدقہ صرف ہم ہیں اور مجلس شوریٰ اس کا مصدقہ نہیں ہے تو یہ نتیجہ نکالنا بالکل درست ہو گا کہ مہتمم امیر ہیں اور مجلس شوریٰ ان کے تابع ہے اور اگر مجلس شوریٰ کو اولو الامر کے مصدقہ سے خارج کرنے پر کوئی دلیل قائم نہیں ہے بلکہ دلیل اس بات پر قائم ہے کہ مجلس شوریٰ اولو الامر کا مصدقہ ہے تو اس حقیقت کا تسلیم کرنا، ناگزینہ ہو گا کہ مہتمم مجلس شوریٰ کے مقابلہ پر امیر نہیں بلکہ یامور ہیں۔

۲۔ دوسری بنیاد یہ ہے کہ مہتمم اور مجلس شوریٰ کے درجہ امارت کا تعین کر لیا جائے اگر واقعی یہ بات ثابت ہو جائے کہ مہتمم کو امارت کا وہ درجہ حاصل ہے جو اسلامی حکومت میں سلطان یا امیر المؤمنین کو حاصل ہوتا ہے تو چونکہ امیر المؤمنین سے شوریٰ کی نسبت کے بارے میں دونوں موقف میں، صحیح اور مضبوط موقف تو وہاں بھی سمجھی ہے کہ مجلس شوریٰ کو اس پر بھی بالادستی حاصل ہے جیسا کہ یہ بحث تفصیل ہے آرہی ہے، لیکن ایک کمزور موقف امیر المؤمنین کی بالادستی کا بھی ہے اس لئے اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ مہتمم کو امیر المؤمنین کے درجہ کی امارت حاصل ہے تو واقعہ اس بحث کی گنجائش نکل آئے گی کہ مہتمم بالادست میں یا مجلس شوریٰ، لیکن اگر مہتمم کے لئے امیر المؤمنین کا درجہ امارت ثابت نہ کیا جاسکے تو ان کی نسبت سے مجلس شوریٰ کی بالادستی یا زیر دستی کی بحث بالکل زائد بحث ہو گی کیونکہ ماتحت امر اپر کسی بھی طرح کی

نگرانی قائم کرنے کے جواز میں اختلاف رائے نہیں ہے۔

درجہ امارت کا تعین بھی دشوار نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی آسان صورت یہ ہے

کہ ہم تم کے دائرہ خدمات کو اسلامی حکومت کے نقشہ میں رکھ کر قیاس کر لیا جائے کہ وہ کس درجہ کے امیر ہیں، مثلاً حکومت کے عہدے داروں میں یہ بات طے شدہ ہے کہ ہم تم امیر المؤمنین نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق شعبۃ تعلیم سے ہے، شعبۃ تعلیم میں بھی ان کی جیشیت مرکزی یا صوبائی وزیر کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ وہ ایک بڑی سے بڑی درسگاہ کے ناظم اعلیٰ ہیں، اس لئے اگر ہم تم کا درجہ امارت معین ہو جائے تو مجلس شوریٰ کی نسبت سے ان کے امیر یا مامور ہونے کی بحث میں صحیح نتیجہ تک پہنچا بہت آسان ہو جائے گا

۳۔ تیسرا وہ بنیادی نقطہ جس سے زیر بحث موضوع میں صحیح نتیجہ تک پہنچا آسان ہو جائے یہ ہے کہ شوریٰ کے سلسلے میں قرآن کریم میں دو آیات ہیں، ایک آیت کا تعلق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے۔ یعنی شاورهم فی الامر فاذ اعن مت فتوکل علی اللہ، اور دوسری آیت یعنی وامرهم شوریٰ بینہم عام مونین سے متعلق ہے، اس لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے متعلق مشورہ کے حکم کی تفیق تقصود ہو تو آیت شاورهم فی الامر کو بنیاد بنا یا جائے اور عام مسلمانوں سے متعلق مشورہ کی تفصیلات معلوم کرنا ہوں تو امرهم شوریٰ کو بنیاد بنا چاہئے۔

اگر شاورهم کو عام مسلمانوں کے لئے مشورہ کے حکم کی بنیاد بنا یا جائے گا تو صحیح نتیجہ تک پہنچنے کیلئے احتیاط کے بہت سے تقاضوں کا عمل میں لانا ضروری

ہو جائے گا۔ مثلاً شادرهم کے صیغہ امر کو امام شافعی رحمۃ اللہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے استحباب پر محبوں فرمایا ہے۔ لیکن عام امر امر کے حق میں مشورہ کے استحباب کا قول کرنے والوں نے اس احتیاط کو ملحوظ نہیں رکھا کہ شادرهم کا صیغہ امر صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استحباب پر محبوں ہے دیگر امر ارکپیتے نہیں۔

نیز یہ کہ قرآن کریم کی آیات سے استنباط معانی کے وقت، اصول فقہ کے معین کردہ صحیح طریقہ کار کی پیرودی بھی ضروری ہے۔

ہم۔ صحیح تجویں تک ہنچے کیلئے چوتھی اہم بنیاد یہ ہے کہ عنمت میں مذکو عزم کے معنی مرادی کے تعین میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ تفسیر، اور عام مفسرین کرام کی بیان کردہ تشریفات کی پابندی کی جانے اور اگر مفہوم لغوی کے توسع کے مطابق ایسے معنی مراد نئے جائیں جو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر منطبق ہوں تو انھیں دیگر امر امر کے لئے عام نہ کیا جائے کیونکہ بتوت کا منصب سب سے بالاً منصب ہے اور کمالات انسانیت میں اس کا کوئی بدل نہیں یہ خالص عطا یہ خداوندی ہے، اس لئے اگر عزم کے معاملہ میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خصوصیت کے پیش نظر اہل مشورہ پر فوقيت حاصل ہو تو اس میں کوئی استبعاد نہیں لیکن عزم کے اس معنی مرادی کو دیگر امر امر و سلطانین کے حق میں عام کرنا درست نہ ہو گا۔

۵۔ مجلس شوریٰ اور اہم کی بالادستی اور زیر دستی کی اس بحث میں پانچوں بنیاد ہے دستور اساسی یعنی دستور اساسی کے تحت چلنے والے مدارس کا حکم ان مدارس سے

مختلف ہو گا جن کا کوئی دستور نہیں ہے، غیر دستوری مدارس میں شوریٰ اور اہمکی بحث کا جو بھی فیصلہ ہو، لیکن دستور اساسی کے تحت چلنے والے مدارس میں اہمکی اور شوریٰ کی حیثیت کا تعین دستور اساسی سے ہو جائے گا۔

زیر بحث موضوع میں صحیح تجربہ تک پہنچنے کے لئے ان چند بیانوں کی اجمالی نشاندہی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قابل اعتماد علماء و مفسرین کے حوالوں سے ان مصاہیں کو منقطع کرنے کی کوشش کی جائے۔

آیتِ پاک میں اول والا فرمان کیا مراد ہے؟

قرآن کریم میں اللہ اور رسول کی اطاعت کے ساتھ، اولو الامر کی بھی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

یا ایتھا الذین امنوا اطیعوا اللہ
و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم
فَانْتَزَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرَدَدْتُمْ إِلَى
اللّهِ وَالرَّسُولِ
رسوارة النساء آیت ۵۹

ایمان داو! ائمہ کی اطاعت کرو،
اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں جو اولو الامر
میں ان کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی معاملہ میں
اختلاف ہو جائے تو ائمہ اور رسول کی طرف
مراجعت کرو۔

اس آیت پاک میں ائمہ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، پھر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے، پھر اولو الامر کی اطاعت کو بھی رسول کی اطاعت کے
ساتھ شامل کر کے، اس کو واجب قرار دیا کیا ہے، لیکن اولو الامر سے کیا مراد ہے؟
اس سلسلے میں تقدیم کے عہد ہی سے مختلف اقوال ملتے ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے۔

کے اس موقع پر چند تفاسیر کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

۱۔ احکام القرآن میں امام ابو بکر جعافر المتوفی رض نے وہ قول انقل کئے ہیں، کہ کچھ حضرات نے اولو الامر کا مصدقاق علماء و فقہاء کو قرار دیا ہے اور کچھ حضرات نے مختلف مقامات پر جہاد کے لئے جانے والے سرتوں کے امراء کو اس کا مصدقاق بتایا ہے۔ پھر صاحب کتاب نے فیصلہ کیا ہے کہ اولو الامر سے ان دونوں معنی کے مراد لینے میں کوئی مضافات نہیں ہے۔ (احکام القرآن ج ۲ ص ۲۵۹ ملخصاً)

۲۔ تفسیر جامع احکام القرآن میں علامہ قرطبی المتوفی رض نے اولو الامر کے مصدقاق میں پاتنے احتمالات کا ذکر کیا ہے۔ اہل قرآن اور اہل علم، فقہاء و علماء، تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، صرف حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما اور اولو العقول والرأی الذین یدبرون امر الناس وہ ارباب عقل و دانش اور اصحاب رائے جو لوگوں کے معاملات کی گریں اپنے ناخن تدبیر سے کھولتے ہیں۔ پھر صاحب کتاب نے اپنے ذوق اور مختصر بحث کے ذریعہ پہلے اور دوسرے معنی کو بقییہ معانی پر ترجیح دی ہے۔ (تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۲۵۹ تا ص ۲۶۱ ملخصاً)

۳۔ تفسیر کبیر میں امام فخر الدین رازی المتوفی رض کی بحث کا خلاصہ ہے کہ یہ آیت اصول فقہ کے اکثر حصہ پر مشتمل ہے، کیونکہ فقہاء کرام یہ فرماتے ہیں کہ اصول شریعت چار ہیں، کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس، یہ آیت ترتیب داران چاروں اصول کو ثابت کرتی ہے، کیونکہ اطیعوا اللہ سے کتاب اے، اطیعوا رسول سے سنت رسول اللہ کے بارے میں وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے اور ادنی الامر منکم اجماع امت کے جمیت ہونے پر دلالت

کرتا ہے، اور فان تنازعتمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُوا إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ قِيَامٌ
کے جھت ہونے کی دلیل ہے، امام رازی رحمہ اللہ کی یہ بحث ان کی جلالت علم
کی آئینہ دار ہے۔ (تفصیر کبیر از ص ۱۷۹ تا ۱۸۰ مختصاً)

اس بحث کے دوران امام رازی نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ کہا جاسکتا
ہے کہ مفسرین نے تو اولی الامر سے دیگر معانی مراد لئے ہیں کہ خلفاء راشدین،
یا امراء و حکام، یا علماء کرام مراد ہیں یا روافیض کے قول کے مطابق انہی مخصوصین
مراد ہیں، مگر آپ کی بیان کردہ مراد تو امت کے بیان کردہ معانی اور اقوال
سے بالکل الگ ہے، اس لئے اجماع امت کے خلاف ہونے کی بنیاد پر اس
کو باطل ہی کہا جائے گا، پھر اس کا جواب دیتے ہیں۔

والجواب انه لانزعاع ان جماعة جواب یہ ہے کہ اس میں تو کوئی اختلاف نہیں کہ
صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت نے اولی
الامر منکم سے علماء کو ملدو بیا ہے، اس نے
اگر تم کہیں کہ اس سے تمام ارباب حل و عقد
علماء مراد ہیں، تو یہ قول امت کے اقوال سے
الگ قول نہیں ہو گا، بلکہ یہ کہا جائے کہ اگر امت
کے مختلف اقوال میں ایک قول کو لیا گیا ہے،
اور دلیل قطعی سے اس کو صحیح قرار دیا
القاطعۃ۔ (تفصیر کبیر ص ۱۷۹)

گویا امام رازی رحمہ اللہ کے نزدیک اولو الامر سے، ارباب حل و عقد علماء

کی وہ جماعت مراد ہے جن سے اجماع منعقد ہوتا ہے اور اسی قول کو انھوں نے مختلف دلائل پیش کر کے راجح قرار دیا ہے۔ غور فرمایا جائے کہ جب ارباب حل عقد کی اجتماعی طاقت تک مراد لینے کی گنجائش ہے تو کسی بھی جماعت کو مراد لینے میں کیا مانع ہے اور مجلس شوریٰ کو ہدایت حاکم قرار دینے میں کیا دشواری ہے؟ ۴۳ - ملا جیون رحمہ اللہ نے تفسیرات الحمدیہ میں دونوں معنی، علماء و حکام بیان کرنے کے بعد محکمہ فرمایا ہے۔

والحق ان المراد به كل اولى الحكم
اما ما كان او امير اسلطانا كان
او حاكم عالما كان او مجتهدا،
قاضياً كان او مفتياً على حسب
مراتب التابع والتابع لان شخص
مطلقاً فلا يقييد من غير دليل
الخصوص -

(التفسيرات الاحمدية ۱۴۹)

تید کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

ملأ جیون کی اس عبارت میں تین باتیں خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔

(الف) پہلی بات یہ ہے کہ ان الفاظ میں تمام اہل حکومت آجاتے ہیں، امام یا اس کے ماتحت حکام، علماء و مجتهدین اور قاضی اور مفتی، سب ہی مراد لئے جاسکتے ہیں گویا اپنے مفہوم لغوی کے اعتبار سے یہ "نفظ" اولی الامر "جهاں جہاں منطبق ہے، اس کو مراد لینے میں کوئی تنگی نہیں، اب اگر کسی ادارہ میں یہ طے کر لیا جائے کہ یہاں

کسی جماعت کی بیانیت اجتماعی کا حکم نافذ ہو گا تو اس میں کوئی مانع نہیں۔

(ب) دوسری بات علی حسب مراتب التابع والمتبع میں ہے کہ ان تمام حکام و اداراء وغیرہ کے درمیان درجہ بندی ضروری ہو گی، امیر المؤمنین یا سلطان کا دائرہ حکم بہت وسیع ہے، لیکن ماتحت حکام کو اپنے دائرہ میں رہنا ہو گا، اگر کسی شخص کو چند لوگوں کے لئے "اولو الامر" کی جیشیت دی گئی ہے، لیکن وہ اپنے بالادستوں کی جیشیت سے متبع نہیں ہے بلکہ تابع اور ماتحت ہے، تو اسکے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اپنے بالادستوں کی ماتحتی میں کام کرے، اس کا یہ کہنا کہ میں اولو الامر میں شامل ہوں اس لئے میرے اوپر کسی کی بالادستی قائم نہیں کی جاسکتی غلط ہو جائے گا۔

(ج) تیسرا بات لان النص مطلق المخ میں ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ، معنی مرادی پر دلالت کرنے میں اگر مطلق ہوں تو دلیل خصوصی کے بغیر قید کا اضافہ درست نہیں، لہذا فقط اولی الامر جب مطلق ہے تو اس سے تمام ہی طبقات مراد لئے جاسکتے ہیں، علماء، فقہاء اور حکام سب ہی حسب مراتب مراد میں شامل ہوں گے، کسی خاص طبقہ کے لئے معین کرنے کا دعویٰ، دلیل کے بغیر قابل تقبیل نہیں، یعنی کسی ادارے میں کام کرنے والے تمام کارکنان کے لئے ناظم یا مہتمم کی جیشیت اولو الامر کی ہے درست ہے لیکن مہتمم کے حق میں مجلس شوریٰ اولو الامر نہیں ہے اس کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ دلیل اس پر قائم ہے کہ روزاً اول سے وہ ایک قانون ساز اور صاحب امر جماعت ہے اور عہد اکابر سے لیکر آج تک تعامل، دستور اساسی، اور اکابر کی تحریرات کی رو سے اسکے احکام نافذ ہیں

۵ - ابن کثیر میں ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اولی الامر منکم سے مراد اہل فقه اور علماء میں ہیں مجاہد اور عطائے نے بھی یہی فرمایا ہے، اور اولی الامر منکم سے مراد علماء والظاهر اس سے مراد بنظاہر و الشاعر یہ ہے کہ یہ کلمہ تمام اولو الامر کو عام ہے خواہ وہ علماء ہوں یا امراء، جیسا کہ گذر حکما ہے۔

قال ابن عباس و اولی الامر منکم، یعنی اهل الفقه والدین وکذا قال مجاهد و عطاء، و اولی الامر منکم یعنی العلماء والظاهر والله اعلم انها عامة في كل اولی الامر من الامراء والعلماء کا تقدم (تفسیر ابن کثیر ج ۱ ص ۱۷)

ابن کثیر کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ کلمہ اولو الامر کو تمام ہی علماء و امراء کے لئے عام قرار دیا جائے گا، کویا اگر ہم تم اپنے ماتحتوں کے لئے اولو الامراء ہیں، اور یہ بات صحیح ہے تو مجلس شوریٰ ہمتم کے حق میں یقیناً اولو الامر ہے اور یعنی مراد یعنی بالکل درست ہو گا۔

۶ - تفسیر النار میں سید رشید رضا مصری رحمہ اللہ نے شیخ محمد عبدہ کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے۔

شیخ محمد عبدہ نے فرمایا کہ انہوں نے عمرہ دراز تک اس سلسلہ پر غور و فکر کیا اور غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ "اولو الامر" سے مراد مسلمانوں کی اہل حل و عقد کی جاتی ہے۔

قال رحمہ اللہ انہ فکر فی هذه المسألة من زمان بعيد فانتهی به الفکر الی ان المراد باولی الامر جماعة من اهل الحل العقد من المسلمين (تفسیر النار ج ۵ ص ۱۸)

شیخ محمد عبدہ نے "اولو الامر" کے معنی مرادی میں ارباب حل و عقد کی جماعت کی تعین کردی، پھر علامہ رشید رضا صحری نے اپنے استاد کے قول کو امام رازی رحمہ اللہ کے استدلال سے مدلل اور منقح کرنے کی کوشش فرمائی۔
۷۔ تفسیر الجواہر میں شیخ طنطاوی لکھتے ہیں۔

ارشاد بار کی اولی الامر منکم میں اولو الامر
و قولہ (اولی الامر منکم) ہم
سے مراد، امم اسلامیہ میں پائے جانے والے
اہل الحل والعقد فی الامر
وہ ارباب حل و عقد ہیں جو اپنے امور،
الاسلامیۃ الذین یکون الامر
شوری کے ذریعہ طے کرتے ہیں اور اس میں
بینہم شوری و یکون الرای
اکثریت کی رائے پر عمل کیا جاتا ہے یہاں
الغالب معمولاً بہ دال ف
الامر للعهد والمعهود ذ' لکی
امروں میں جو اول ہے وہ عہد خارجی کا ہے
فی قوله تعالیٰ۔ وامرهم شوری
جس سے مراد وہ امر ہے جو امر ہم شوری
بینہم۔ فهذا هر الامر المذکور
بینہم میں منذکور ہوا ہے، وہی امر یہاں
بھی ذکر کیا گیا ہے۔
بھی ذکر کیا گیا ہے۔
ھبنا۔ (تفسیر الجواہر للطنطاوی ج ۲)

علامہ طنطاوی نے اولو الامر کے معنی مرادی کی تعین میں مجلس شوریٰ ہی کی
صراحت فرمادی، ان کی تفسیر کا مفہوم یہ ہے کہ اولو الامر میں جو نفظ الامر
آیا ہے یہ دراصل وہی امر ہے جو امر ہم شوری بینہم میں بھی منذکور ہے۔
اس لئے اولو الامر انہی لوگوں کی جماعت کو کہا جائے گا جو اپنے امور میں شوری
کے ذریعہ فیصلہ کرتے ہیں۔

متقدمین و متاخرین اور عصر حاضر کی ان چند تفاسیر کا خلاصہ نقل کرنے کا

مدع اعلام کی مراد کی تعریف میں مختلف اقوال ہیں، اس نے یہ دعویٰ کرنا کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں ہستم تو اولو الامر میں آتے ہیں، مجلس شوریٰ نہیں آتی ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی تائید نہ اولو الامر کے معنی لغوی سے ہوتی ہے اور نہ تفسیر کی کتابوں میں جو بحث کی گئی ہے اس سے اس موقف کو ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اولو الامر کا اصل مصدق فرد و جماعت دونوں ہو سکتے ہیں

کلمہ "اولو الامر" سے افراد مراد لینے کے سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں اس نے اس مضمون کو تھوڑوں کے ساتھ نقل کرنے کی ضرورت نہیں البتہ یہ مناسب ہو گا کہ اس موقع پر اولو الامر سے جماعت مراد لینے والے چند مفسرین کی عبارت نقل کر دی جائے۔

۱۔ احکام القرآن میں امام ابو بکر جصاص نے روافیض کے رد میں لکھا ہے۔

زعمت هذہ الطائفۃ ان المراد
بقوله تعالیٰ و اولی الامر منکم

باقی داوی الامر منکم
علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ

و هذات اتاویں فاسد لان اولی الامر
جماعۃ و علی بن ابی طالب حل احمد

جمامۃ کا نام ہے اور حضرت علی بن ابی طالب
راہکام القرآن ص ۲۱)

تو ایک ہی فرد ہیں۔

امام ابو بکر جصاص نے تردید تو روافیض کی فرمائی ہے، کہ ان لوگوں نے

اولو الامر سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ذات کو مراد یا ہے۔ لیکن قرآن کریم کے انفاظ ان معنی مرادی کا ساتھ نہیں دیتے، کیونکہ اولو جمع کا صیغہ ہے جس کی مراد جماعت ہونی چاہئے، جبکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک ہی ذات گرامی کا نام ہے بہر حال مفسر مذکور کے ارشاد کے مطابق اولو الامر سے جماعت مراد لینے کی ضرورت ہے۔ ۳۔ امام ابو بکر حفصہ ص سے زیادہ واضح تعبیر امام رازی کے یہاں پائی جاتی ہے۔ امام رازی نے بھی ان روافیض کی تردید فرماتے ہوئے جو اولو الامر سے مراد ائمہ معصومین کو لیتے ہیں، یہ ارشاد فرمایا ہے کہ روافیض کا اولو الامر سے، ائمہ معصومین مراد لینا خلط ہے کیونکہ

اللہ تعالیٰ نے اولو الامر کی اطاعت کا حکم دیا ہے اور اولو الامر جمع کا لفظ ہے، اور روافیض کے یہاں ایک وقت میں ایک ہی امام ہوتا ہے اور جمع کے لفظ کو فرد کے اور یخوبی کرنا، ظاہر کے خلاف ہے،

انہ تعالیٰ امری طاعة اولی الامر،
واولو الامر جمع و عند ہم لا یکون
فی الزمان الواحد الا مام
ولحد حمل الجمع على الفرع خلا الظاهر

(تفسیر بکیر ص ۱۵ ج ۵)

مفہوم یہ ہوا کہ اولو الامر سے، ائمہ معصومین کو مراد نہیں لیا جاسکتا، دلیل یہ ہے کہ لفظ اولو جمع کا صیغہ ہے، اور جمع سے مراد وہ معنی ہونے چاہئیں جن میں جمع ہونے کی شان ہو، فرد پر جمع کا اطلاق بالکل ظاہر کے خلاف ہے۔

اسی لئے امام رازی کا رجحان اولو الامر کے سلسلے میں یہ ہے کہ اس سے مسلمانوں کی وہ جماعت مراد ہے جن کے ایک موقف کو اختیار کر لینے سے اجماع امت منعقد ہو جاتا ہے، بہر حال امام رازی کے ارشاد کے مطابق اولو الامر سے مراد

جماعت ہے، فرد ہیں۔ اس لئے مناسب ہو گا کہ مدارسِ عربیہ کے نظام کارمیں اس سے مہتمم مراد نہ لیا جائے، کیونکہ وہ فرد واحد ہے، بلکہ اس سے مراد مجلس شوریٰ ہی کو لیا جانا چاہئے کیونکہ وہ اولو الامر کی جماعت ہے۔

سم۔ جماعت مراد لینے والے مفسرین میں سید رشید رضا مصری، اور علامہ طنطاوی کا نام بھی اہم ہے، اس لئے کہ ان دونوں مفسرین نے جماعت ہی نہیں، بلکہ شوریٰ کی صورت میں قائم ہونے والی جماعت کو مراد لیا ہے، سید رشید رضا مصری تفسیر المغاریم لکھتے ہیں۔

یہ وہ بات ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہم پر
مسائل سے متعلق حکمت سے بریز اس
آیت کی تفسیر کے وقت کھولی ہے، اس سے
آیت کے معنی روشن ہو جاتے ہیں اور مفسرین
کے اقوال میں سے ایک کو درست برتر صحیح
حاصل ہو جاتی ہے کہ تمام مسلمانوں پر اللہ
کی اطاعت، کتاب اللہ پر عمل کرنے کی صورت
میں واجب ہے، اور رسول کی اطاعت، ان
کی سنت کا اتباع کرنے کی صورت میں واجب
ہے اور ارباب حل و عقد پر مشتمل علماء و رؤسائے
کی قابل اعتماد جماعت اولی الامر کی اطاعت
شوریٰ کے ذریعہ وضع کرده، شہری، عدالتی

هذا ما فتح اللہ به علینا عند
تفسیر هذہ الآیۃ الحکیمة
من المسائل التي يتجلیّ به
معناها والترجیح بين اقوال
المفسرین فيها انة يجب على
جميع المؤمنین طاعة الله بالعمل
بكتابه وطاعة رسوله باتباع
سننته وطاعة جماعة اولی الامر
وهم اهل العمل والعقد من
علماء الامة ورؤسائهم الموثق
بهم عند های فیما یضرونہ لها
بالشوریٰ من الاحکام المدنیة

اور سیاسی احکام کے اتباع کی صورت
میں واجب ہے۔

والقضائیہ والسياسیہ

(تفسیر المغارج ۵ ص ۲۲۱)

علامہ رشید رضا، اگرچہ اولو الامر سے وہ بالادست مجلس شوریٰ مراد لے
رہے ہیں جو اسلامی حکومت میں سلطان پر بھی تفوق رکھتی ہے، لیکن واضح ترین
بات یہ ہے کہ جب اقتدار اعلیٰ یعنی سلطان پر بھی مجلس شوریٰ کو بالادستی حاصل ہے
تو مدارس عربیہ کے نظام کاریں اس کی بالادستی میں کیا شک و شبہ کیا جا سکتا ہے۔
۴۔ علامہ طنطاوی لکھتے ہیں۔

خور کا مقام ہے کہ باری تعالیٰ نے سورہ نساء
کی آیت یا ایتها الذین امنوا اطیعوا
الله و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم
میں کیا ارشاد فرمایا؟ یہ اولو الامرون میں
یہ وہی ہیں جو مسلمانوں کے درمیان اپل
شوریٰ کے نام سے معین ہیں جن کا ذکر
اس سے پہلے کی مکن سوت میں - امرهم
شوریٰ بینہم - کے اندر ہو چکا ہے۔ اسے
ہر اسلامی مملکت میں مجلس شوریٰ ہون چاہئے
اور با فاظ دیگر مجلس نمائندگان ہون چاہئے
یہ مجلس ملکت کے معاملات میں فیصلہ کرن تو
کیا ملک ہو۔ تاکہ وہ حوصلت اور شرع کے

انظر ماذا قاله اللہ فی سورۃ
النساء - یا ایها الذین امنوا
اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسُول
و اولی الامر منکم - و من هم
او لو الامر لهم المعهودون عندهم
هم اهل الشوری المذکورون
فی السورة النازلة قبلها فی مکة
- و امرهم شوری بینہم - فلیکن
فی کل بلد اسلامی مجلس للشوری
وبعبارة اخرى نواب وهذا مجلس
لها القول الفصل فی امر
البلاد فلی فعل ما یشاء

ولیحکم بہما یرید

(تفسیر الجواہر للطنطاوی ج ۲)

مطابق روح پا ہے عمل کرے، اور جو بھاہے

فیصلے نافذ کرے۔

علامہ طنطاویؒ بھی اولو الامر سے جماعت ہی مراد لے رہے ہیں، اور جماعت کے ساتھ اس کو مجلس شوریٰ، یا عوامی مجلس نمائندگان کی صورت میں تعین کر کے اس کے احکام کو واجب التعمیل قرار دے رہے ہیں۔ اس لئے اس قول کے مطابق بھی مدارس عربیہ کے نظام کاریں، اولو الامر کا مصدق مجلس شوریٰ ہی کو ہونا چاہئے۔

بات مفضل ہو جائے گی ورنہ دیگر مفسرین کے اقتباسات بھی دے جاسکتے ہیں، مقصود یہ ہے کہ ۱۴۲۰ھ میں امام ابو بکر جعفی، پھر ۱۴۲۷ھ میں امام رازی، پھر تیرہ ہویں اور چودھویں صدی میں شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، اور علامہ طنطاوی، اولو الامر سے جماعت مراد لینے کے حق میں ہیں، فرق یہ ہے کہ امام رازی نے اس کو مسلمانوں کی اجتماعی طاقت پر منطبق کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور شیخ محمد عبدہ وغیرہ اس کو خلیفہ پر بالادستی رکھنے والی قانون ساز مجلس شوریٰ پر منطبق کر رہے ہیں۔

قاسم العلوم والجیزات حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ناظم توی قدس سرہ نے بھی "اولو الامر" کے معنی کی وضاحت میں صینگہ جمع کے ساتھ "علماء ربیان" کو مزاد لیا ہے۔

ماحصل آیت این است کہ اطاعت آیت کا خالصہ یہ ہے کہ اہل امر کا اٹھا اہل امر باید کرد، مگرچہ ضرور است کہ کی جائے، مگر یہ کیا ضروری ہے کہ اہل

امر سے مراد، امیر اور امام لئے جائیں بلکہ
علیٰ امر تبیان بھی مراد ہو سکتے ہیں
جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نائب کی
حیثیت سے اللہ اور رسولؐ کے ادامرو
نواہی کو مخلوق تک پہنچاتے ہیں اور اسی
وجہ سے وہ مخلوق کیلئے مطاع ہو گئے ہیں۔

مراد از اہل امر، امیر و امام باشد، بلکہ علامہ
ربانی باشند کے بہ نیابت حضرت رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم اور امر و نواہی نبوی و
خداوندی بخلاف تقدیمی رسانند و بہمیں وجہ
مطاع خلافت گر و نیدہ باشند۔
قاسم العلوم ص ۲۰۹

ایک صفحہ کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

اور شاید اسی وجہ سے، اس آیت کے بعد
دوسرے جملہ لا یا گیا ہے جو پہلی آیت کی نسبت
سے، ہمارے بیان کردہ اشارہ کے باعث
یہیں شرح و تفسیر کا درجہ رکھتا ہے۔ میری
مراد ہے جملہ فان تنازعتم فی شیئی فردوہ
اللہ و الرسول ان کنتم تو ممنون
باللہ والیوم الآخر۔

ہمارا ذکر کردہ مطلب، اس دوسرے جملہ پر
غور کرنے کے بعد، علم اليقین سے حق اليقین
تک پہنچ جاتا ہے۔

دہمیں وجہ غالباً پس از ایس آیت اجمل و بیگر
آور وہ اند کہ بنزرت شرح و تفسیر است
بنسبت آیت اولی در بارہ اشارہ منکور
امنی جملہ فان تنازعتم فی شیئی فردوہ
اللہ و الرسول ان کنتم تو ممنون
باللہ والیوم الآخر۔

طلب منکور پس از مطالع جملہ لاحقہ
از علم اليقین بحق اليقین می رسد
د ایضاً ص ۲۰۹ ،

مراد یہ ہے کہ چونکہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا کام صرف علامہ ہی کر سکتے
ہیں، اور زراع کی صورت میں صرف ہی حکم دیا گیا ہے اس لئے "اولو الامر" سے علامہ

مراد لینا بالکل درست بلکہ اولیٰ، بلکہ تین کے درجہ میں صحیح ہے۔

خلاصہ بحث

ہمیں اس موضوع پر محاکمہ یا تقابلی مطالعہ کرنا نہیں ہے اور نہ ہم کسی ایک معنی کو دوسرے پر ترجیح دینے کی سعی کر کے بحث کا دروازہ کھونا چاہتے ہیں بلکہ ان چند بحثوں کے نقل کرنے کا مدد عاید واضح کرنا ہے کہ اولو الامر کے معنی مرادی کی تعین میں متعدد باتیں کہی گئی ہیں، اس سے خلیفۃ المؤمنین یا سلطان یعنی اسلامی اقتدار کا سبب اوپر منصب بھی مراد لیا گیا ہے اور ماتحت امر اولو حکما بھی تمام صحابہ کرام بھی مراد لئے گئے ہیں اور حضرت ابو بکر و حضرت عمر بھی، ائمہ اجتہاد بھی مراد لئے گئے ہیں اور علماء و مشائخ بھی، پھر یہ کہ ان اہل مناصب اور علماء کو انفرادی حیثیت سے بھی مراد لیا گیا ہے۔ اور ان کی جماعت کو بھی، جماعت ہے اجماع امت کے انعقاد کی صلاحیت رکھنے والی جماعت بھی مراد لی گئی ہے۔ اور اسلامی حکومت میں خلیفہ پر بالادستی رکھنے والی ارباب حل و عقد کی مجلس شوریٰ بھی غرض متعدد احتمالات میں اور کسی بھی احتمال کو نہ ازروئے لغت غلط کہا جا سکتا ہے۔ نہ ازروئے شرع، کیونکہ لغت میں بھی ان معانی کی گنجائش ہے، اور علماء کرام نے قرآن ہمی کا جو معیار مقرر فرمایا ہے اس کی رو سے بھی ہر معنی کی گنجائش ہے۔

تمام اولو الامر یکساں نہیں ہیں

نیز یہ کہ ہم ان تمام ہی اقوال کے مطابق "اطاعت اولی الامر" کے حکم خداوندی کی تعمیل کر سکتے ہیں اور اس کی بہت آسان صورت یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے

کے ارشاد کے مطابق جس شخص کو جس جگہ اول امیر قرار دیا گیا ہے اس کے دائرے کو متعین کریں اور اس دائرے میں سب ماتحت اس کی اطاعت کو ایک مندرجی فریضہ سمجھ کر قبول کریں، اس سلسلے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سب سے زیادہ واضح ہے۔

خبردار کہ تم میں سے ہر انسان ذمہ دار اور نگران ہے اور اپنی زیر نگرانی تام چیزوں کیلئے جواب دہ ہے چنانچہ امام جو عام انسانوں کا نگران ہے وہ اپنی رعایا کے پاکیں جواب دہ ہے، اور وہ اپنے اہل خانہ کا نگران ہے اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور اولاد کی نگران ہے، اور اس سلسلے میں جواب دہ ہے، اور انسان کا غلام، آقا کے ماں کا نگران ہے اور اس سلسلے میں جواب دہ ہے۔ خبردار تم میں سے ہر انسان مذہب اور نگران ہے اور اپنی زیر نگرانی تمام چیزوں کے پاکیں جواب دہ ہے۔

الا كَلْمَ رَاعٍ وَكَلْمَ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ فَالْأَمَامُ الَّذِي عَلَى النَّاسِ رَاعٍ وَهُوَ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلَى أَهْلِ بَيْتِهِ وَهُوَ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ . . . وَالْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَوَلَدَهَا وَهِيَ مَسْؤُلَةٌ عَنْهُمْ وَعَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلَى مَالِ سَيِّدَهَا وَهُوَ مَسْؤُلٌ عَنْهُ ، الْأَفْكَلْمَ رَاعٍ وَكَلْمَ مَسْؤُلٌ عَنْ رِعْيَتِهِ .
(بخاری ج ۲ ص ۱۵۶)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد مبارک میں پوری وضاحت کے ساتھ تفصیل کی گئی ہے کہ جس انسان کی زیر نگرانی جو چیزیں ہیں وہ اس دائرہ

میں ذمہ دار بھی ہے اور حواب دہ بھی ہے اور اس کو اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو پورا کرنا چاہتے، اس ارشاد میں نیچے سے اُپر تک تمام ذمہ داریوں کیلئے رائی کا ایک ہی لفظ بولا گیا ہے، لیکن ظاہری بات ہے کہ ان سب کے دائرے الگ الگ اور کم و بیش میں۔ فتح الباری میں ہے۔

خطابی نے کہا کہ سب بڑا امام اور صاحب خانہ

قال الخطابی اشتہر کو ۱۱۱ الامام

او جن جن کا روایت میں ذکر آیا ہے ان کا رائی ذمہ دار (ہونا بیان کیا گیا) وہ سب رائی کے اطلاق میں مشترک ہے مگر ان کے معانی الگ الگ ہیں، امام المؤمنین کے رائی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ حکومت عدل اور حدود کو قائم کر کے شریعت کی حفاظت کرے، صاحب خانہ کے رائی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ گھر والوں کے معاملات کی تدبیر کرے۔ اور ان کے حقوق ادا کرے، عورت کے رائی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ گھر کے معاملات، اولاد اور خدام کے سلسلے میں شوہر کی خیر خواہ ہو، اور خادم کے رائی ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ جو اس کے باقی میں

الاعظم والرجل ومن في التسبیة
ای في الوصف بالرائع ومعانيهم
مختلفة فرعية الاماں الاعظم
حياطة الشريعة باقامة الحدود
والعدل في الحكم ورعاية الرجل
اهله سیاستہ لا مرخص والصالہم
حقوقہم ورعايتہ المرأة تدبیر
امرالمیت والادلاد والخدم و
النصیحة للزوج في كل ذلک و
رعاية الخادم حفظ ما تحت يده
والقيم بما يجب عليه من خدمته

(فتح الباری ج ۲۳ ص ۱)

جو خدمت واجب ہوتی ہے اس کی ادائیگی کرے۔
الگ الگ اور کم و بیش ذمہ دار یاں رکھنے والے یہ ذمہ دار (راعی) یکساں
حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ان میں بتہی طور پر فرق مراتب ہے، لیکن جس انسان کا
جو دائرہ کار ہے وہ اس سلسلے میں اولو الامر ہے اور پہلو تھوں کے لئے اس کے
احکام کا منداوجب ہے۔ البتہ یہ وضاحت ضروری ہے کہ کسی شخص کے خاص
دائرے میں اولو الامر ہولے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اب اس کے اوپر
کسی کی نگرانی نہیں ہے۔ اور وہ کسی کا ماتحت نہیں۔ یعنی مثلاً مدارس عربیہ کے
نظام کا ریس مہتمم کے درجہ کا اولو الامر ہو جانا اس کا تقاضا نہیں کرتا کہ اب اس
کے اوپر کسی کی نگرانی قائم نہیں ہو سکتی، بلکہ فتح الباری میں صاف ہے۔

دلايلزم من الاتصال بكونه	کسی انسان کے راعی (بالادرست) ہونے
راعياً ان لا يكون مَرْعِيًّا	کے یہ بات لازم نہیں آتی کہ وہ کسی دوسرے
باعتبار آخر رفع الباري (۱۳۲)	اعتبار سے مرعی (ماتحت) زبن سکے۔
عمدة القاري شرح بخاري میں اس سے بھی زیادہ وضاحت سے موجود ہے۔	
فان قيل اذا كان كل من	اگر یہ کہا جائے کہ جب یہ سب ہی راعی،
هؤلاء راعياً فمن المرعي،	(بالادرست) ہیں تو مرعی (زیر درست) کون
اجيب هو اعضاء نفسه و	رہا۔ جواب دیا جا چکا کہ مرعی، خود اس کے
جوارحة وقواه وحواسه	اعضاء وجاہ، اور اس کے قوی اور حواس
والراعي يكون مر عيًّا	ہیں۔ یا جواب یہ دیا جائے گا کہ راعی، دوسری
باعتبار آخر كون الشخص	جهت سے مرعی بن سکتا ہے۔ مثلاً ایک

شخض امام کی نسبت سے مرغی، اور اپنے
مَرْعِيًّا لِلَّامِ رَاعِيًّا لِالْأَهْلِه

اہل خانہ کی نسبت سے راعی ہے

عَمَدَةُ الْقَارِيِ مِنْ ج ۲۶۸

گویا مدارسِ عربیہ کے نظام کا رہیں بھی یہ بالکل درست ہے کہ ہم تم میں ڈھنپیں ہوں، ماتحتوں کے اعتبار سے وہ الوالا مرہیں۔ لیکن مجلس شوریٰ کی نسبت سے ان کی حیثیت مانور کی ہے، غرض ایک ہی شخص میں دونوں حیثیتوں کا ہونا فتح الباری اور عینی سے ثابت ہے۔

یہ محاسبہ دُنیا و آخرت دُنوں میں ہے

اسی حکم کیم راعی کے ساتھ آپ نے یہ بھی واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ حکم مسئول، ہر انسان سے اس کی ذمہ داریوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ یہ سوال دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی، پر وردگار عالم بھی ہر انسان سے یہ محاسبہ فرماتے گا، اور بندگان خدا بھی اپنی اپنی حدود میں رہتے ہوئے یہ محاسبہ کریں گے۔ غلام کا محاسبہ آقا کرے گا۔ عورت سے محاسبہ اس کا شوہر کرے گا۔ اور ماتحت الوالا مر سے محاسبہ، ان سے بالادست الوالا مر کریں گے۔ اور جو سبے بڑی طاقت یعنی امیر المؤمنین ہے۔ اس سے محاسبہ عوامی طاقت یا عوامی نمائندے مجلس الوالا مر کے مبران کریں گے۔

قیامت کے دن جواب دی اور مسئولیت کی بات تو بالکل واضح ہے کیونکہ تمام شارحین حدیث آخرت کی مسئولیت کے باب میں اس روایت پر متفق ہیں اور ہر معاملہ میں آخرت کی جواب دی اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ ارشاد بانی ہے۔

اَنَّ السَّمْعَ وَالبَصَرَ وَالْفَوَادَ كُلُّ أُولَئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْؤُلًا۔

برہادنیا کی مسئولیت کا اس روایت سے تعلق، تو بعض محدثین کرام نے

اسی روایت کو دنیا کی مسئولیت سے بھی متعلق کیا ہے، مثلاً امام بخاری حجۃ الشر
نے اس روایت کو کتاب الاحکام میں باب اطیعو اللہ و اطیعو الرسول واوی
الامر منکم کے تحت نقل کیا ہے، جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ امام بخاری روایت
میں ذکر کردہ راعیوں کو اولو الامر بمحترم ہے ہیں، اور کتاب الاحکام میں اس کو ذکر
کرنے کا اشارہ یہ ہے کہ وہ دنیا کی مسئولیت کا تعلق بھی روایت سے مان رہے
ہیں، چنانچہ حضرت علام کرشمیری قدس سرہ اس باب پر لکھتے ہیں۔

هذا الحدیث يتعلق بالدیانات

وقد عقد المصنف بباب الاحکم

فلعمله لم يفرق بينهما۔

(فیض الباری جلد ۳ ص ۲۹۸)

ہوتا ہے کہ وہ دونوں کے درمیان فرق

نہیں کرنا چاہتے۔

علامہ بدر الدین عینی کا ارشاد اور زیادہ واضح ہے، وہ اسی روایت کے
تحت لکھتے ہیں۔

جس انسان کی زیر نگرانی جو چیز ہو تو وہ اس کے

سلسلے میں عدل اختیار کرنے اور اس کے دین،

دنیا اور متعلقات کے بارے میں مصلحتوں

کے مطابق عمل فرمائند ہے چنانچہ اگر اس نے

فکل من كان تحت نظره

شيء فهو مطلوب بالعدل

نيه والقيام بمصالحة في دينه

ودنيا و متعلقاته، فان

مگر ان کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کو پورا کیا۔
تو اس کو پورا حصہ اور بڑی سے بڑی جزئی
ملے گی، اور اگر دوسری صورت ہوئی تو اس کی
رعایا میں سے ہر شخص کو اپنے حق کے مطالبہ کا
اختیار ہو گا۔

وَفِي مَا عَلِيهِ مِنْ الرِّعَايَةِ حَصَلَ
لَهُ الْحَظَّ الْأَوْفَرُ وَالْجَزَاءُ
الْأَكْبَرُ وَإِنْ كَانَ غَيْرَ ذَلِكَ
طَالِبَهُ كُلُّ أَحَدٍ مِنْ رَعِيَتِهِ
بِحَقِّهِ۔

(رَمَضَانُ الْقَارِي ج ۳ ص ۳۶۴)

یعنی ہر شخص اپنے ذمہ داریوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کا مکلف ہے۔ یہ
ذمہ داریاں دین کی بھی ہیں اور دنیا کی بھی، انہی ذمہ داریوں کی ادائیگی پر دنیا و
آخرت کی فلاح موقوف ہے، اور اگر ان کی ادائیگی میں کوتاہی کی گئی تو آخرت
میں پروردگار عالم باز پُرس فرمائے گا، اور دنیا میں ہر صاحب حق کو اپنے جائز
حقوق کے مطالبہ کی اجازت ہے، خلافتِ راشدہ کے دور میں امیر المؤمنین کے،
عوام کے سامنے جواب دہ ہونے کی پوری تفصیل کر دی گئی ہے، طبقات ابن سعد
میں ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بارگراں سنجا لئے کے بعد
جو بہلا خطبہ دیا اس میں ارشاد فرمایا۔

اَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا قَدْ وَلَيْتَ عَلَيْكُمْ
مِّنْ تَمَرٍ مِّمَّا يَرَى
مِنْ تَمَرٍ مِّمَّا سَبَ سَبَّ
بِهِرْ نَهْلِينَ ہوں اگر میں
اچھا کام کروں تو میری مدد کرنا، اور اگر
برائی کی طرف جاؤں تو مجھے سیدھا کر دنیا۔
فَقَوْمٌ مِّنْ أَنْوَاعِ الْجَنَّاتِ
حَضَرَتْ عَرْضِي اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ
بَارِ بَارِ عَامَ مُسْلِمَانُوںَ كُو خطاب کرتے ہوئے یہ

فرمایا کہ اگر تم میرے اندر کمی کا احساس کرو تو مجھے سیدھا کر دینا، حضرت عمرؓ کے عہد میون میں عام مسلمانوں کو خلیفہ وقت اور دیگر امراء کے سامنے اپنی بات کہنے کی بھی آزادی تھی وہ سب تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہے، صرف مردی نہیں بلکہ عورتوں نے بھی براہ راست بعض معاملات میں حضرت عمرؓ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے۔ اتق الله یا عمر، عمر! اللہ سے ڈرو۔

اسلامی حکومت کی صحیح تصوری خلافتِ راشدہ ہی میں ملتی ہے کہ وہاں ہر عام انسان کو اپنے حقوق کے مطابق کا پورا اختیار دیا گیا، رہماً تخت امراء کا معاملہ تو ان کے سلسلے میں معاملہ اور زیادہ آسان ہے کہ براہ راست بھی مطابق کیا جا سکتا ہے۔ اور بالادست حکام کے یہاں مرافق کی بھی آزادی ہے۔

اولو الامر کے درمیان فرق مراتب کی تفصیل

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بالادست اور رہماً تخت اولو الامر کے درمیان فرق مراتب کیلئے: اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں ایک نہایت قدیم اور معتبر کتاب، الاحکام اسلامیہ کے چند مضامین کا خلاصہ پیش کر دیا جائے، تاکہ یہ بات بالکل واضح ہو جائے کہ تمام اولو الامر کے حقوق یکساں نہیں ہیں۔ اُن کے اختیارات میں بھی فرق ہے اور اُن کا دائرہ خدمات بھی ایک دوسرے سے ممتاز ہے۔

اس طرح یہ بات بھی منقح کی جاسکے گی کہ مدارس عربیہ کے نظام کار میں ہتم کی حیثیت، امراء سلطنت میں کس امیر سے مشابہت رکھتی ہے اور مجلس شوریٰ کی

کیا حیثیت ہے ؟ کیونکہ ہندوستان کے مداریں عربیہ کی موجودہ صورت حال میں
مہتمم اور مجلس شوریٰ کی تفصیلات متفقہ میں کتابوں میں تو درکنار، متاخرین
کے سیاں بھی بالکل مذکور نہیں ہیں، کیونکہ یہ صورت حال، عالم اسلام میں پہلی یہ
بار پیش آئی ہے، ان کے بارے میں حکم شرعی معلوم کرنے کیلئے اس کے علاوہ
کوئی چارہ کا نہیں ہے کہ متفقہ میں و متاخرین نے عہدیداروں کے بارے میں
جون تفصیلات قلمبند کی ہیں ان پر قیاس کیا جائے کہ مہتمم کی امارت کس نوع کی ہے
اور مجلس شوریٰ کی کیا نوعیت ہے ؟ یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ فقہاء کے یہاں
ذکر کردہ اصولی بحثوں کو ان پر منطبق کر کے احکام کا استخراج کیا جائے۔

الاحکام السُّلطانیَّةِ کے پہلے باب کا خلاصہ

شیخ ابوالحسن ماوردی المتونی نے ۷۵۴ھ نے الاحکام السلطانیہ کے پہلے باب
میں امامتِ بزرگی اور خلافتِ غالیہ سے بحث کی ہے اور بیش صفحات میں مندرجہ
ذیل عنوانات پر سیر حاجل کلام کیا ہے، امامتِ بزرگی کا شرعی حکم، امامتِ بزرگی
کے مقاصد، اس کا وجوب، اس کے انعقاد کی شرطیں، تقرر امام کی جائز صورتیں یعنی
ارباب حل و عقد کے ذریعہ انتخاب، یا ولیعہد کی صورت میں نامزدگی، ولیعہد نامزد
کرنے کے احکام، امام کی ذمہ داریاں، امام کے حقوق، اور دیگر قسمی مضامین قلمبند
فرمائے ہیں، اس باب کے آخر میں شیخ ابوالحسن ماوردی لکھتے ہیں۔

"احکام امامت کی تفصیل کے بعد جو ہم نے بیان کی کہ مذہبِ ملت کی تمام
دنی و دنیاوی مصلحتیں منصبِ امام ہی سے وابستہ ہیں، اب یہ بیان کیا جانا ہے کہ

امام منصبِ امامت پر فائز ہونے کے بعد، اپنے اختیارات چار طرح کے عہدیداروں میں تقسیم کر دیتا ہے ॥

پہلی قسم میں وہ عہدیدار میں جن کو عام خدمات کیلئے اختیارات عامہ سپرد کئے جاتے ہیں، ایروہ وزرا میں جو بلا تخصیص تمام امور میں امام کی نیابت کرتے ہیں۔ دوسری قسم میں وہ عہدیدار ہیں جن کو خاص خدمات کیلئے عام اختیارات دئے جاتے ہیں ان میں صوبوں اور شہروں کے امراء شامل ہیں اس لئے ان کی امارت اگرچہ مخصوص حد میں ہوتی ہے مگر ان کو اس محدود خدمت کیلئے عام اختیارات دئے جاتے ہیں۔

*** *** *** *** *** ***

تیسرا قسم میں وہ عہدیدار میں کر جن کو عام خدمات کیلئے خاص اختیارات دئے جاتے ہیں جیسے قاضی القضاۃ، نائب لشکر، حافظ سرحد، مالگزاری کا محصل اعلیٰ، صدقات کا محصل اعلیٰ، یہ عہدیدار اپنے اپنے مخصوص شعبوں میں عام اور کل اختیار رکھتے ہیں۔

فالِ قسم الاول من تكون ولايته عامۃ في الاعمال العامة وهم الوزراء لأنهم يستنابون في جميع الامور من غير تخصيص والقسم الثاني من تكون ولايته عامۃ في اعمال خاصة وهم امراء الاقالیم والبلدان لان النظر في ما خصوا به من الاعمال عام في جميع الامور۔

القسم الثالث من تكون ولايته خاصة في الاعمال العامة وهم مثل قاضي القضاۃ ونائب العیوش وحاجی الشغور ومستوفی الخراج وجایب الصدقات ان كل واحد منهم مقصود على نظر خاص في جميع الاعمال۔

چوتھی قسم میں وہ عہدیدار ہیں جن کو خاص خدمات کیلئے، محدود اختیارات دے جاتے ہیں۔ جیسے کسی صوبہ یا شہر کا قاضی، یا اسی مخصوص خطہ کی مالگزاری کا افسر یا محصل صدقات یا اس کی سرحد کا محافظ یا وہاں کی فوج کا نیقاب، اس لئے کہ ان سب کو خاص خدمات کیلئے محدود اختیارات دے جاتے ہیں۔

والقسم الرابع من تكون ولايته خاصة في اعمال خاصة وهو مثل قاضي بلد او اقليم او مستوفى خراجه او جابي صدقاته او حامى ثغرة او نقيب جنده لان كل واحد منهم خاص النظر مخصوص العمل - (الاحكام السلطانية)

ابو الحسن ماوردی کے علاوہ، قاضی ابو علی الحنبلی نے بھی اپنی کتاب الاعدام السلطانية میں عہدے داروں کی تفصیل انہی الفاظ میں قلمبند کی ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ امیر المؤمنین یا خلیفہ کو منصب خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد چونکہ تنہا کام کرنا ممکن نہیں ہے، ذمہ داریاں بہت ہیں اور کام زائد ہیں اس لئے امور سلطنت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کیلئے وہ مختلف عہدیدار مقرر کر سکتے ہیں۔ ان عہدیداروں کو بنیادی طور پر چار انواع میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ عمومی خدمات کی انجام دہی کیلئے غیر محدود اور وسیع اختیارات رکھنے والے عہدیدار، اور خاص خدمات کی انجام دہی کیلئے غیر محدود اختیارات رکھنے والے عہدے دار، عمومی خدمات کیلئے، محدود اختیارات رکھنے والے عہدیدار، اس اجمالی فہرست خاص خدمات کیلئے، محدود اختیارات رکھنے والے عہدیدار، اس اجمالی فہرست ہی سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مہتمم کی امارت ہاچوتھی نسلمے مشابہت رکھتی ہے

کیونکہ وہ خاص خدمت، یعنی امور تعلیم کے سلسلے میں، مدد و اختیار، یعنی درجگاه کی سربراہی کیلئے امیر منتخب کئے گئے ہیں، جب کہ مجلس شوریٰ، اولو الامر کی وہ مجلس ہے جو ہندوستان میں اسلامی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے، قائم مقام امیر المؤمنین کی حیثیت سے ان امور تعلیم کی انجام دبی کی اجازت دے رہی ہے جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب کی علی مراسلت سے واضح کیا جا چکا ہے۔ یہیں اس بحث کو مزید منقح کرنے کیلئے اور چند اقتباسات نقل کریں گے جن میں وزارت کی اقسام، ان کے حکم اور وزارے کے اختیارات اور ان کے درمیان امتیاز طاہر کیا گیا ہے، تاکہ مدارس عربیٰ کے نظام کا رکھ کرے داروں کے اختیارات کو بالکل آئینہ کی طرح صاف کر دیا جائے۔ شیخ ماوردی لکھتے ہیں۔

اورو زارت کی دو قسمیں میں۔ ایک وزارت	والوزارة على ضربين، وزارة
تفویض۔ اور دوسرے وزارت تنفیذ	تفویض ووزارة تنفیذ اما
وزارت تفویض کے معنی یہ ہیں کہ امام یہے	وزارة التفویض فہروان
شخص کو وزیر بنائے جو اپنی رائے سے	یستوزر الامام من یغوض
معاملات کی تدبیر کرے اور اپنی ہی سوابیت	الیہ تدبیر الامور برایہ
سے اس کو نافذ کرے اور اس طرح کی	وامضاءها على اجتها دہ
وزارت کے جواز کی ممانعت نہیں ہے	ولیس یمتنع جواز هدہ

۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔

الوزارة الخ
الاحكام السلطانية م۲)

وزارتِ تفویض کے معنی یہ ہے کہ امام وسیع اختیارات کے ساتھ منصب وزارت پر درکردے کہ وزیر اپنی رائے اور صواب دید سے معاملات کا فیصلہ اور نفاذ کرے، اس وزارت کی حقیقت یہ ہے کہ امام بڑی حد تک اپنے اختیارات وزیر کی طرف منتقل کر دیتا ہے، وزارتِ تفویض کی تعریف کے بعد مصنف نے اُسکے جواز کیلئے شرعی دلائل قائم کئے ہیں، پھر اس منصب کیلئے منتخب کئے جانے والے انسان کے اوصاف سے بحث کی ہے، پھر یہ لکھا ہے کہ وزارتِ تفویض کیلئے نامزدگی کمن الفاظ کے ذریعہ عمل میں آتی ہے، پھر ایک فصل میں تفصیل سے یہ بتلایا گیا ہے کہ وزیرِ تفویض کو امام المومنین کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے پھر امامت اور وزارت کے فرق کو واضح کرنے کیلئے لکھا ہے۔

وَإِذَا تَقْرَدَ مَا تَعْقِدُ بِهِ وَزَارَةٌ
جَبَّ يَهُ بَاتٌ ثَابِتٌ هُوَ كَمَّ كَهُ كَهُ كَهُ كَهُ كَهُ
الْتَّفَوِيْضُ فَالنَّظَرُ فِيهَا وَإِنَّ
اس طرح منعقد ہو جاتی ہے تو اگرچہ اس وزارت
كَانَ عَلَى الْعَوْمِ مُعْتَدِلٌ شَرِطِينَ
کو عمومی اختیارات حاصل ہوتے ہیں مگر اس
يَقِعُ الْفَرْقُ بِهِ مَا بَيْنَ الْأَفَّامَهُ
میں دو شرطیں ملعونظر ہتی ہیں جن سے اہم
وَالْوَزَارَةُ أَحَدُهُمَا يَخْتَصُ
اوْزَارَتَ کا فرق باقی رہتا ہے ان میں
بِالْوَزِيرِ وَهُوَ مُطَالَعَةُ الْأَفَّامَ
پہلی شرط وزیر کے ساتھ خاص ہے کہ
لَمَّا امْضَاهَ مِنْ تَدْبِيرٍ وَانْفَذَهُ
وہ جو تدبیر اختیار کرے اور جو اختیارات
من ولاية و تقليد للطلايصير
استعمال کرے اور جو تقریر کرے وہ امام کے
بِالْأَسْتِبدَادِ كَالْأَمَامِ .
سامنے پیش کرتا رہے تاکہ وہ امام کی طرف
خود مختار نہ ہو، اور دوسرا شرط امام کے ساتھ
وَالثَّانِي مُخْتَصٌ بِالْأَمَامِ وَهُوَ

خاص ہے کہ وزیر کی تمام کارروائیوں اور
اس کی تمام تدبیرات پر نظر رکھنے تاکہ
ان میں جو صحیح ہوں ان کو برقرار
رکھئے، اور جو نامناسب ہوں ان کی مخالفہ
ان یتتصفح افعال الوزیر:
وتدبیره الامور بیقر منها
ما وافق الصواب ویستد
ما خالفه
(الاحکام السلطانیہ ص ۲۵) کردے۔

اس عبارت میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ وزیر تفویض
کو اگرچہ عمومی اختیارات دے جاتے ہیں لیکن وہ ہر حال میں امیر المؤمنین کا
ماحت ہے اس لئے وزیر تفویض کے لئے ضروری ہے کہ وہ تمام معاملات
امیر المؤمنین کے سامنے پیش کیا کرے۔ اور خود امیر المؤمنین کی ذمہ داری ہے کہ
وہ وزیر کے تمام افعال اور اس کی تمام کارروائیوں کی نگرانی کرتا رہے،
تاکہ اقت کے تمام کام حسن تدبیر، سلیقہ اور باہمی تعاون کے ساتھ انجام
پاتے رہیں۔

پھر اسی فصل میں امیر المؤمنین اور وزیر تفویض کے درمیان فرق
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وکل ما صاح من الامام صاح
من الوزیر الآثلاثة اشياء
احد ها ولایۃ العهد فان
للاما م ان يعهد الی من يری
ولیس ذالک للوزیر والثانی

وہ تمام کارروائیاں جو امام کی جانب سے
درست قرار پاتی ہیں۔ وزیر تفویض کی جانب
سے بھی درست قرار پاتیں گی، البتہ تین چیزوں
میں فرق ہو گا۔ پہلی بات یہ کہ اگرام کسی
کو مناسب سمجھے تو وہی ہمدرد مقرر کر سکتا ہے،

للہ امام ان یستعفی الامۃ من
الامامة ولیس ذالک للوزیر
والثالث ان للاماں ان یعزل
من قلدها الوزیر ولیس للوزیر
ان یعزل من قلدها الاماں
(الاحکام السلطانیہ ص ۲۶)

وزیر کو اس کی اجتاذب نہیں، دوسرے یہ کہ امام امت
کے سامنے امامت سے اپنا استغفار پیش کر سکتا ہے
وزیر کو امام کی جانب سے استغفار دینے کا حق نہیں۔
تیسرا یہ کہ امام وزیر کے مقرر کردہ ہدایہاروں کو
معزول کر سکتا ہے، وزیر امام کے مقرر کردہ
عہدیہاروں کو بطرف نہیں کر سکتا۔

اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ اگرچہ وزیر تفویض کو امام کی جانب سے
کلمی اختیارات دئے جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود ویعہد کی نامہ زدگی، امامت سے
استغفی اور عہدیہاروں کے تقریر کے سلسلے میں امام کو وزیر تفویض پر بالادستی حاصل
رہتی ہے، اس بحث کے بعد وزارت تنفیذ کے بارے میں لکھا ہے۔

اما وزارت التنفيذ فحکمها
اضعف و شر و طها اقل لان
النظر فيها مقصود على رأى الاما
و تدبیره وهذا الوزير وسط
بينه وبين الرعايا والولاية يوصي
عنه ما أمر و ينفذ عنه ما
ذكر و يمضي ما حكم و يخبر
بتقليد الولاية و تجهيز الجيش
ويعرض عليه ما ورد في مهم

وزیر کی شرعی چیزیں

کی تیاری سے مطلع کرتا ہے اور جو اہم واقعات یا نازہ
حدادیات پیش آتے رہتے ہیں وہ امام کے سامنے

پیش کرتا رہتا ہے تاکہ امام کے حکم کے مطابق کارروائی عمل میں لائے، گویا وزیر تنفیذ، امور کے نافذ کرنے میں مددگار ہے وہ خود با اختیار نہیں ہے معاملات کا ذمہ دار نہیں ہے، پھر اگر وہ رائے میں بھی شریک کیا جاتا ہے تو اس کو وزیر کہنا مناسب ہے اور اگر وہ رائے میں شریک نہیں کیا جاتا تو اس کو واسطہ اور سفیر کے نام سے یاد کرنا مزدوج ہو گا۔

وتعبد و من حدث مسلم
لیعمل فیہ ما یوم ربہ فهو
معین فی تنفیذ الامر و
لیس بواں علیها ولا مقلدا
لها. فان شورک فی الرای
کان باسم الوزارة اخص
وان لم يشارک فیہ کان
باسم الواسطة والسفارة
اشبه - (الاحکام السلطانية م۲)

اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ وزیر تنفیذ کے کام کرنے کا کیا طریقہ ہے، پھر اس کی بھی دو صورتیں میں کہ اگر نفاذ احکام کے ساتھ وہ رائے اور مشورہ میں بھی شریک رہتا ہے تو اس کو وزیر کے نام سے موسم کرنا قرین عقل ہے، لیکن اگر وہ رائے اور مشورہ میں بھی شریک نہیں کیا جاتا بلکہ صرف احکام کے نفاذ کا کام اسکے سپرد رہتا ہے تو اس کی وزارت برائے نام ہے، ایسے وزیر تنفیذ کو تو محض واسطہ ہی قرار دیا جائے گا۔ پھر صاحب کتاب نے چند سطروں کے بعد ان دونوں وزارتوں کے درمیان فرق کو واضح کیا ہے۔

ان دونوں وزارتوں کے اختیارات میں
ویکون الفرق بین هاتین
اتا ہی فرق ہے جتنا ان کے شرائط
الوزارتين بحسب الفرق
میں ہے۔ اور یہ چار صورتوں میں
بینهما في النظرین و ذلك

نمایاں ہوتا ہے، ایک یہ کہ وزیر تفویض کیلئے خود احکام کی تنفیذ اور مقدمات کے تصفیہ کی اجازت ہے جب کہ وزیر تنفیذ کیلئے ایسا کرنا جائز نہیں۔ دوسرے کہ وزیر تفویض کو والیوں کے تقریر کرنے کی مستقل طور پر اجازت ہے، وزیر تنفیذ کیلئے ایسا کرنا جائز نہیں۔

تیسرا یہ کہ وزیر تفویض کیلئے فوجوں کو محاذ پر روانہ کرنے، اور جنگ کے تمام انتظامات خود انعام دینے کی اجازت ہے، وزیر تنفیذ کیلئے اس کی اجازت نہیں۔

چوتھے یہ کہ وزیر تفویض کو بیت المال کے خزانے پر اقتدار حاصل ہوتا ہے، وہ سرکاری مطالبات دھول کرنے اور جو سرکار پر واجب الادا ہے اس کی ادائیگی کا حق رکھتا ہے، وزیر تنفیذ کو اس کا حق نہیں ہے۔

امیر المؤمنین، وزیر تفویض اور وزیر تنفیذ کے درمیان فرق مرتب کی ان تصریحات سے یہ بات تو بالکل واضح ہو گئی کہ تمام امراء کے اختیارات یکساں نہیں ہوتے،

من اربعہ اوجه: احدها انه یجوز لوزیر التفویض مباشرة الحكم والتظرف المظالم ولیس ذلك لوزیر التنفيذ . والثانی انه یجوز لوزیر التفویض ان یستبد بتقلید الولاۃ ولیس ذلك لوزیر التنفيذ . والثالث انه یجوز لوزیر التفویض ان ینفرد بتسيير الجيوش وتدبير الحروب ولیس ذلك لوزیر التنفيذ . والرابع انه یجوز لوزیر التفویض ان یتصرف في اموال بيت المال بقیض ما یستحق له ویدفع ما یجب فيه ولیس ذلك لوزیر التنفيذ (الاحکام السلطانية ۲۸)

پھر ان وزاروں کے ماتحت جو عہدیدار ہوں گے، ان کے بارے میں حقوق یا اختیارات میں اور زیادہ تحدید کرنا ضروری ہو گا۔ کیونکہ اختیارات دائرہ کار کے مطابق دے جاتے ہیں۔ اس فرق مراتب سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ مدارسِ عربیہ کے نظام کار میں ہم تم کو امیر قرار دیکر، اس کو مدارس کے تمام امور میں درودست و سیع اختیارات کا دعویٰ درست نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات بہت ضروری ہے کہ مجلسِ شوریٰ اور ہم تم کے بارے میں طے کیا جائے کہ ان دونوں کی امارت، مذکورہ بالا امارت میں سے کس کے ساتھ مشابہت رکھتی ہے تاکہ اس کے مطابق حکم لگایا جائے۔

یہ بات پہلے واضح کی جا چکی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے زوال کے بعد، سب سے پہلی کوشش اقتدار کی بازیابی کیلئے کی گئی اور ہندوستان کا طول و عرض ان مجاہدین کی سرگرمیوں کی جولان گاہ بن گیا۔ جن کے خون سے تحریر کی ہوئی داستانِ حریت، ذرتوں کے صفات میں نقش ہے، حضرت مولانا عبد اللہ صاحب کا بیان ہے کہ اکابر علماء کی زیر قیادت، دہلی کے قرب و جوار میں شتر بامعرکہ کارزار گرم ہوا جن میں شاملی کے مورچے کی کچھ تفصیلات محفوظ ہیں۔ لیکن اسلامی اقتدار کی بازیابی سے مایوسی، بلکہ قید و بند اور مقدمات کی طرح طرح کی پرشتابیوں اور ابتلاء کے بعد اکابر نے اسلامی اقتدار مسلم تہذیب و تمدن اور اسلامی علوم اور دین و مذہب کے تحفظ کیلئے مدارس عربیہ کا جال بچھادینا ضروری سمجھا، لیکن اس کام کیلئے سب سے پہلی مشکل مابیات کی فراہمی کی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے بہت غور و خوض اور مشورے کے بعد سلطان یا امیر المؤمنین کے قائم مقام کی جیشیت سے مجلس اولوال امر قائم کی تاکہ ارباب حل و عقد اور اولوال امر کی مجلس کی جانب سے مقرر کردہ امیر کو غام

مسلمانوں سے چند وصول کرنے اور اس کو مصارف خیر میں صرف کرنے کا شرعی جواز حاصل ہو جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارپوری اور حضرت مولانا اشتر فعالیت تھانوی قدس اللہ سرہما کے حوالوں سے یہ بات ثابت کی جا سکی ہے۔

ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ جو قائم مقام امیر المؤمنین کی حیثیت سے کسی دینی درس گاہ کیلئے عہدے دار مقرر کر رہی تھی، اس نے جائز تھا کہ وسیع اختیارات دے کر وزیر تفویض کی طرح کام لے۔ یا محدود دائرے میں اختیارات پر درکرے اور وزیر تنفیذ کی طرح کام کا مکلف کرے، روزاول سے قائم شدہ تعامل اور اکابر کی تصریحات سے یہ بات صاف ہے کہ مجلس شوریٰ نے مہتمم کو دروبست اختیارات تفویض نہیں کئے ہیں، بلکہ وہ وزیر تنفیذ کی طرح مہتمم سے کام لے رہی ہے، جیسا کہ آگے یہ بحث صاف ہو جائے گی۔

مہتمم اور مجلس شوریٰ کی شرعی حیثیت کی مکمل وضاحت کیلئے الاحکام السلطانية ہی سے ایک اور بحث نقل کر دنیا مناسب معلوم ہوتا ہے، سرکاری دفاتر کے بیان میں "تقری اور عزل" کی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

تیسرا قسم میں عاملوں کے عزل و نصب کے خصوصی احکام ہیں، اور یہ چھ فصول پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں ان لوگوں کا بیان ہے جن کی جانب سے عمال کا تقدیر درست ہے تقری، حکم کے نفاذ اور نگرانی کے جواز پر موقوف ہے۔ اس نے جس شخص کا کسی کام پر مکمل ہونا	واما القسم الثالث فيما اختص بالعمال من تقليد وعزل فيشتل على ستة فصول . احد ها ذكر من يصح منه تقليد العمال وهو معتبر بتفوذ الامر و جواز النظر نك من جائز نظره في عمل نفذت
---	--

درست ہے تو اس کے احکام وہاں نافذ ہوں گے اور اس کی جانب سے عالموں کا تقریر ہو سکتا ہے، یا باادشاہ کی جانب سے جسے ہر طرح کا اختیار ہے یا وزیر تنفیض کی جانب سے یا کسی صوبی یا بڑے شہر کے حاکم اختیار رکھنے والے عامل کی جانب سے جو خاص کاموں کیلئے عامل مقرر کر سکتا ہے، رہا وزیر تنفیذ تو اس کی جانب سے کسی عامل کا تقریر درست نہیں، الایہ کہ وہ بالادرست حاکم کے سامنے پیش کرے یا اس کے اجازہ میکر تقریر کرے

فی ادامة وصح منه تقلييد العمال عليه . وهذا يكون من أحد ثلاثة : امام من السلطان المستولى على كل الامور وامام وزير التقريض وامام من عامل عام الولاية كعامل اقليم او مصري عظيم يقلد في خصوص الاعمال عاملاما وزير التنفيذ فلا يصح منه تقلييد عامل الا بعد المطالعة والاستئمار . (۳۴)

اس عبارت میں واضح کیا گیا ہے کہ عزل و نصب کا اصول کیا ہے۔ اور اس کی بنیادی طور پر شرعاً کی گئی ہے کہ جہاں جس کی کارروائی نافذ العمل ہے اور جہاں اس کے احکام واجب التعمیل ہیں اس کی جانب سے کیا جانے والا تقریر درست ہے۔

مدارس عربیہ کے نظام کا میں مجلس شوریٰ کی کارروائی کے نافذ العمل ہونے کی یہ دلیل کافی ہے کہ ہندوستان میں یہ ارباب حل و عقد کی وہ مجلس شوریٰ ہے جس نے قائم مقام امیر المؤمنین کی جیشیت سے ذمہ داری سنپھالی ہے۔ مدارس عربیہ کا نظام کا مرتب کیا ہے، اور کچھ عامل مقرر کر کے ان کو اموال کی وصولی بی اور مصارف بغیر میں صرف کرنے کی اجازت دی ہے۔

پھر اس عبارت میں یہ بتلایا گیا ہے کہ عزل و نصب کی یہ اجازت امیر المؤمنین اور تفویض اور صوبے یا بڑے شہروں کے خصوصی اختیارات رکھنے والے علقوں کو دی جائے گی، وزیر تنفیذ یادو سکر کارکنان کو یہ حق نہیں ہے۔ مدارس عربیہ کے نظام کا ریس ان ٹینوں میں سے کوئی ایک بھی موجود نہیں ہے۔ ہاں امیر المؤمنین کے قائم مقام کی حیثیت سے مجلس شوریٰ، اور مجلس شوریٰ کی جانب سے مدد و اختیارات رکھنے والے امیر مقام موجود ہیں۔ اس لئے مدارس عربیہ میں یا تقریباً کی جانب سے درست ہو گا، یا شوریٰ نے اگر یہ اختیار مقام کو دیا ہے، تو ان کی جانب سے بھی درست قرار پاتے گا۔

تمام امر امر پر بُنگرانی قائم کرنے کی صراحت

یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ وزیر تفویض سے نیچے تک تمام ہی امر امر کی حیثیت مانعوں کی نسبت سے امیر کی ہے اور بالا مدعووں کی نسبت سے یہ تمام عہدیدار اموال ہیں، ان تمام عہدیداروں کو جن حدود میں امور کی انجام دہی کا مکلف کہا جائے۔ ان کے لئے اس کی پابندی ضروری ہو گی، ان تمام ہی کارکنان اور عہدیداروں کے بارے میں آگے یہ وضاحت کی گئی ہے۔

فان قلد عليه مشرف كان	اگر ان عہدیداروں میں سے کسی پر بُنگران مقرر
العامل مباشر للعمل وكان	کر دیا جائے تو امور کی انجام دہی خود عامل
الشرف مستوفيا له يمنع	ہم کرے گا، اور مشرف کی ذمہ داری یہ ہو گی
من زِيادة عليه اونقصان	کہ اس سے پُورا کام لے۔ حدود سے تجاوز

منہ اوتفرد بہ نکنے دے، کام میں کو تاہی یا ذکر نہ بننے سے روکتا رہے۔

مدارسِ عربیہ کے نظام کا میں نگرانی کا عمل بھی دوسری اصطلاح مقرر کر کے وجود میں آیا ہے، خاص حالات میں ہم پر صدرِ ہم، یا سہرست کا کام نگرانی ہی رہا ہے کہ امورِ مفتوحہ کی انجام دینے خود ہم کرتے رہے لیکن صدرِ ہم اور سہرست ان کے احوال کی نگرانی فرماتے رہے، مزید وضاحت کے لئے لکھا گیا ہے۔

نگران اور خبر سان کے درمیان تین باتوں میں حکم کا فرق ہے، ایک یہ کہ کسی کارکن کے لئے نگران کے علی الرغم کارروائی کا حق حاصل نہیں جب کہ کارکن خبر سان کے بغیر کارروائی کا مجاز ہے، دوسری یہ کہ نگران کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کارکن کو نہ برسست کاموں سے روک دے، خبر سان کو یہ حق نہیں ہے، تیسرا یہ کہ نگران حکام بالا کو غلط اور صحیح دونوں طریقے کے کاموں کی رپورٹ دینے کا مکلف نہیں جب کہ خبر سان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کارکن کے ہر صحیح اور غلط کام کی اطلاع دے، یونکہ نگران کی خبر شکایت

و حکم المشرف یخالف حکم صاحب البرید من ثلاثة او جه احد ها انه ليس للعامل ان ينفرد بالعمل دون المشرف قوله انه ان ينفرد به دون صاحب البريد والثانى ان للمشرف منع العامل مما افسد فيه وليس ذلك لصاحب البريد والثانى ان المشرف لا يلزم منه الاخبار بما فعله العامل من صحيح و فاسد اذا انتهى اليه ويلزم صاحب البريد

الا خبر بہما فعلہ العامل من صحیح
و فاسد لان خبر الشرف ا متعداء
و خبر صاحب البرید انهاء من ۲۔ رکھتی ہے۔

اس عبارت میں نگران اور خبر ساں کے درمیان فرق واضح کیا گیا ہے، اور نگرانی قائم کرنے کے بعد، تمام کارکنان کیلئے اس کے احترام اور پابندی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اس دور میں نگرانی کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت پڑگئی ہے۔ تاکہ کارکنان خطہ راجتہاری کے طور پر یا عمدًا کوئی نامناسب کارروائی نہ کر سکیں۔

خلاصہ بحث

اولو الامر کے معنی اور مصدقہ کے بارے میں پیش کی گئی معروف صفات، اور امیر المؤمنین اور دیگر امراء کے بارے میں پیش کردہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے

- وَتَرَأَنَّ كَرِيمَ كَيْمَ كَيْتَ آيَتَ پَاكِ أطِيعُوا اللَّهَ وَاطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولَى الْأَمْرِ مِنْكُمْ میں فقط اولو الامر سے علماء و فقہاء بھی مراد ہو سکتے ہیں، امیر المؤمنین اور ان کے ماتحت دیگر امراء بھی مراد ہو سکتے ہیں، اجماع امت کی طاقت رکھنے والی علماء و فقہاء کی جماعت بھی ہو سکتی ہے، اور امیر المؤمنین یا دوسرے امراء پر بالادستی رکھنے والی ارباب حل و عقد پر مشتمل مجلس شوریٰ بھی مراد ہو سکتی ہے۔
- امیر المؤمنین اپنی طویل الذیل ذمہ داریوں سے عہدہ برآ بونے کے لئے ماتحت امراء مقرر کر سکتے ہیں، جن میں وزیر تنفیذ بھی ہے۔ وزیر تنفیذ بھی ... صوبوں اور ٹبرے شہروں کے غمال بھی ہیں، اور ان ماتحت امراء کے اختیارات

میں یکسا نیت نہیں ہے بلکہ جس امیر کو جتنا اختیار دیا جائے ان کے لئے اس کی پابندی ضروری ہے۔

۳ - ان تمام عہدیداروں میں امیر المؤمنین کے بعد سبے اہم منصب وزیر تفویض کا ہے، لیکن وزیر تفویض کیلئے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنی تماہ کارروائیوں کی امیر المؤمنین سے توثیق کرتا ہے، اور خود امیر المؤمنین کی ذمہ داری ہے کہ وہ وزیر تفویض کے کاموں پر نظر رکھیں۔

۴ - وزارت کی ایک مستقل قسم وزیر تنفیذ بھی ہے کہ امیر المؤمنین اپنے اختیارات مستقل نہ کریں بلکہ اپنے احکام کی تنفیذ کے لئے کوئی وزیر یا چند وزراء مقرر کریں اور سلطنت کا کام چلا میں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وزیر تنفیذ کو شرکیو مشورہ کر لیا جائے اور یہ بھی جائز ہے کہ وہ مشورہ میں بھی شرکی نہ کیا جائے۔

۵ - ماتحت امراء کے اختیارات یکسا نہیں ہوتے بلکہ ان میں تمام امراء ماتحتوں کی نسبت سے بالادست اور امیر، اور بالادستوں کی نسبت سے ماتحت اور ماورشمار کئے جاتے ہیں، اور ہر شخص کو اپنے بالادست اولو الامر کی اطاعت واجب ہے۔

۶ - ان ماتحت امراء میں سے ہر ایک کے اوپر مشروف اور نگران کا مقرر کرنا شرعاً درست ہے اور اگر کسی پر نگران قائم کر دی جائی ہو تو نگران کیلئے عامل کے تمام کاموں کی نگرانی کرنا ضروری ہے اور عامل کو نگران کے بغیر خود مختار ہو کر امور کی انجام دیجی کی اجازت نہیں۔

ان بنیادی باتوں کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ خواہی چندہ کے ذریعہ چانے

والے مدارس عربیہ کے نظام کا میں بتیم اور مجلس شوریٰ کی امارت کس درجہ کی ہے تاکہ یہ فیصلہ کیا جاسکے کہ ان میں کس امیر کے کتنے اختیارات ہیں۔ یہ بات ثابت کی جا سکی ہے کہ ہندوستان میں اسلامی اقتدار کے ختم ہونے کے بعد، ارباب حل و عقد کو اسلام کی بقارہ، اسلامی تہذیب و تمدن اور اسلامی اقدار کے تحفظ کی فکر دامنگیر ہوتی تو انہوں نے عربی مدارس کا قیام تجویز کیا۔ لیکن اس اقدام کیلئے پہلے ہی مرحلہ پر مالیات کی فراہمی کا مستد سامنے آیا تو انہوں نے قرآن کریم کے حکم کے مطابق ایک مجلس اولی الامر قائم کی جو عوامی چندے کو وصول کرنے اور پھر اس کو مصارف میں صرف کرنے کی اجازت دے تاک مالیات فراہم کرنے والے، اگر چہ سلطان وقت کی سرپرستی سے محروم ہوں مگر سلطان کا انتخاب کرنے والی، ارباب حل و عقد اور اولی الامر پر مشتمل مجلس شوریٰ کی اجازت سے یہ کام انجام دے سکیں۔

اولی الامر کی اس مجلس شوریٰ کے سامنے متقدیں کی تحقیق کے مطابق وزیر تنفیض، وزیر تنفیذ اور دیگر عہدیداروں کی نظیریں تھیں، ان عالی مقام، روشن دماغ، بخششناس اور عبقری سفت ارباب زہد و تقویٰ نے غور و فکر کے بعد طے کیا کہ انھیں مدارس عربیہ کے محدود دائرہ کا میں وزیر تنفیض کی ضرورت نہیں بلکہ وکی شخص کو وزیر تنفیذ کی طرح نامزد کر کے کام چلا سکتے ہیں جو مجلس شوریٰ کے احکام کی پابندی کے ساتھ مدارس عربیہ کا نظام چلائے، جیسا کہ حضرت مولانا شاد رفیع الدین صاحب بتیم دوم کے اصول شستگان سے واضح ہے کہ ابتدائی امور جسٹیسیک میں مجلس شوریٰ دخیل تھی، پھر

دارالعلوم کے قیام کے پانچ سال کے بعد ۱۲۸۷ھ میں، مہتمم دوم کی عرضداشت پر مہتمم کو امور حبسز تیہ کی انجام دی کا اختیار دیا گیا اور جبیا کہ اس وقت کے دستور اساسی میں تصریح ہے کہ مہتمم وسیع اختیارات رکھنے والے امیر نہیں میں بلکہ ان کو مجلس شوریٰ کی جانب سے محدود اختیارات دئے گئے ہیں جن کو دفووار دستور اساسی میں واضح کر دیا گیا ہے اور یہ وہ دستور اساسی ہے جس کے بارے میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شبہارت موجود ہے کہ اس کو حضرت نافتوی اور حضرت گنگوہی قدس سرہما کے زمانے سے آخر دو تک کی مجلس شوریٰ کی بنیادی تجویز سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اور جس کی پابندی اوفو بالعهد اور اوفو بالعقود کی نصوص کی رو سے تمام کارکنان کیلئے وجوب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس لئے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ مدرس عربیہ کے نظام کا ریس مجلس شوریٰ، صرف مشورہ دینے والی جماعت کا نام نہیں بلکہ حقیقت یہ ارباب حل و عقد اولاد امرکی وہ جماعت ہے جو باہمی مشورہ کے بعد احکام نافذ کرتی ہے جس کی ہر تجویز اور ہر فیصلہ واجب اتعییل ہے، اور مہتمم کی حیثیت ماتحتوں کی نسبت سے امیر کی ضرور ہے، لیکن مجلس شوریٰ کے مقابل اس کی حیثیت اس وزیر تنفیذ سے زائد کی نہیں جس کو شرکیہ مشورہ بھی کیا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دستور اساسی میں اس کی صراحت ہے کہ مہتمم بحیثیت عہدہ مجلس شوریٰ کا نمبر ہو گا۔ اور شاید شرکیہ مشورہ بھی حضرت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب کی اس عرضداشت کے بعد کیا گیا ہے جس میں

انھوں نے یہ کہا تھا کہ مجلس شوریٰ کے جلسوں میں ہم تم کو بھی شرکیں کیا جائے، اور یہی وجہ ہے کہ مجلس شوریٰ سال میں دوبارا جلاس منعقد کرنا ضروری خیال کرتی ہے تاکہ وزیر تنفیذ کو وقتاً فوقتاً مددیات دی جاتی رہیں، بلکہ ہنگامی حالات میں یہ اجلاس کسی وقت بھی بلا یا جاتا ہے۔

ان معروضات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ جن مقالہ نگاروں نے ہم تم کو ایم کری حیثیت دیکر، مجلس شوریٰ کو اس کے ماتحت قرار دیا ہے انھوں نے مفسرینِ کرام کی بیان کردہ اولوالامر کی تفسیریں پر غور نہیں کیا، اور نہ متفقہ میں کے یہاں اسلامی حکومت کے عہدیداروں اور ماتحت امرار کے درمیان فرقِ مراتب کی بحث کو ملحوظ رکھا، جس کی وجہ سے وہ ایک زبردست خطأ اجتہادی میں مبتلا ہو گئے کہ انھوں نے ہم تم کو ایمِ المؤمنین کی طرح عام اختیارات پسپرد کرنے کا قول کیا، پھر جن مدارسِ عربیہ میں سابقہ مجلس شوریٰ کو توڑ کر، نئی مجلس شوریٰ کی نامزدگی، اور اس کے ساتھ اس کے سیدیتِ حاکم نہ ہونے کی تصریح کی گئی انھوں نے خطأ اجتہادی سے بھی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا کہ مقام نگار کے یہاں تو خطأ اجتہادی قرار دیکر موقف کو ہلکا کرنے کی گنجائش بھی ہے، لیکن اس کو عملی طور پر قبول کر لینا، اور مفادات کی بنیاد پر اکابر کے پسندیدہ طرزِ عمل کی خلاف ورزی کرنا، ایسے اقدامات ہیں جن کی کسی بھی صورت ہمت افزائی نہیں کی جاسکتی۔

اسلام میں شوریٰ کا مقام

مدارس عربیہ کے نظام کا میں شوریٰ کی حیثیت پر مشتمل ان معروضات کے

بعد، اب اس موضوع کا تفصیلی جائزہ باقی رہ جاتا ہے کہ شوری کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ اسلام کی بنیادی چیزوں یعنی کتاب و سنت میں اس کے بارے میں کیا احکام ہیں، ان احکام کی کیا نوعیت ہے؟ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے باری تعالیٰ کے حکم شاودھم فی الامر کی تعمیل کس طرح فرمائی ہے اور عہد رسالت میں شوری کا کیا طریقہ رہا، علماء متقدمین و متاخرین نے کتاب و سنت اور عہد رسالت کی عملی تفصیلات سے کیا مسائل مستنبط فرمائے اور اسلامی ذخیرہ علوم و فنون میں اس موضوع پر کیا لکھا گیا، خلافت راشدہ کے عہد مبارک میں شوری کے حکم کی تعمیل کس طرح کی گئی، اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے تک پہنچنے کا کیا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اور سبے زیادہ ضروری بات یہ کہ ان تمام تفصیلات میں ہمارے لئے کیا ہدایت ہے کہ ہم مدارسِ عربیہ کے نظام کار میں مجلس شوریٰ کو کیا اہمیت دیں۔

شوری کے لغوی معنی

لفظ شوری، باب نصريضو کا مصدر ہے، اس کے لغوی معنی میں شہد
کے چھٹے سے شہد پخواڑنا، اس ماذہ سے باب افعال میں اشارہ، باب استعمال
میں استشارة، اور باب مفاظۃ میں مشاورۃ کا استعمال ہوتا ہے۔
اشارة بصلہ علی کے معنی میں مشورہ دینا، استشارة کے معنی میں مشورہ
طلب کرنا اور مشاورۃ کے معنی ہیں۔ باہم بیچھر مشورہ کرنا بخلافی سے یہ
مادہ مشورہ کے معنی میں مستعمل نہیں ہے، بلکہ اس کا مصدر شوری، مشورہ کے

معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

مشورہ کی اہمیت، عقل انسان کی نظر میں

مشورہ کی حقیقت یہ ہے کہ مشورہ کی صلاحیت رکھنے والے ایک سے زائد افراد کسی ایسے معاملے میں جس کے حسن و قبح کے بارے میں دوڑائے ہو سکتی ہوں۔ یکجا بیٹھکر غور و فکر کریں اور ایک دوسرے کے علم، تجربہ، عقل اور قوت استنتاج سے استفادہ کریں۔

پیغمبر ان عالی مقام کے علاوہ جنہیں وحی خداوندی کی بنیاد پر دوسرے انسان عقل و شعور سے استفادے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کے کسی بھی مفکر اور کسی بھی رانشور کو مشورے کے نتیجہ خیز عمل سے بے نیاز نہیں سمجھا جاسکتا، شور کا مادہ اگر جھپٹتے سے شہد نچوڑنے کے معنی میں مستعمل ہے تو مشورہ بھی افکار انسانی کے تبع کردہ مفید ترین تجربات ہی کو نچوڑنے کا مشیہ اور شیرین عمل ہے۔

مشورہ کا عمل، خور و فکر کے سند میں غواصی سے کم نہیں ہے، عقل انسان کی وسعتوں کا احاطہ ذوار ہے اس لئے جب کوئی تنقیح طلب سے ملدار باز شوری کے سامنے پیش ہوتا ہے تو وہ خدا کی عطا کردہ علم کی گہراتی ہیں غواصی کرتے ہیں اور وہاں سے وہ آبدار موتی نکال کرلاتے ہیں جس سے انسانیت کا حرم زندگانی منور ہو جاتا ہے۔

مشورہ علم و فن کی فضائے بسیط میں، عقاب فکر و شعور کی اس کامیاب

پرواز کا نام ہے جس کی گرفت سے مسائل کا کوئی مرغ پرواز، آزاد نہیں رہتا۔ اس لئے جب اہل شوریٰ دور تر مسائل پر کند فکر ڈالتے ہیں تو مسائل خود گرفتاری کی پیش کش کرتے ہیں۔

اسی لئے دنیا کے تمام علمی طبقے اور دانشوار، انسانی زندگی کی ابدار سے مشورے کی افادیت پر اتفاق رکھتے ہیں، علمی دنیا کے تمام قدیم و جدید فکری مجموعوں میں مشورے کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے، انسان کے پاس متقدیں کی علمی و راثت کے طور پر جتنا سرما ی محفوظ ہے ان سب میں شورہ کی افادیت و اہمیت پر اتفاق رائے پایا جاتا ہے، حضرت مولانا جیب الرحمٰن صاحب عثمان مہتمم سادس نے اپنی کتاب "تعلیماتِ اسلام" میں عربی ادب کی کتابوں سے دور جا بہت سے لیکر دو اسلام تک کے اہل عقل، اصحاب تدبیر، ارباب سلطنت اور مفکرین انسانیت کے انکار و خیالات نقل کر کے اس حقیقت کو ثابت فرمایا ہے کہ انسانیت کا کوئی طبقہ بھی مشورے کی خوبی کثیر کا منکر نہیں ہے۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر انسان، مشورہ کا اہل نہیں ہوتا، مشورہ صرف عالی دماغ، روشن ضمیر اور باکردار انسانوں کا صحیح حق ہے، مسئلہ کتنا ہی پیچیدہ اور تاریک ہو لیکن جب وہ روشن دماغ اور باکردار انسانوں کی عقل کی قندیلوں کے درمیان رکھ دیا جاتا ہے تو اس کے تمام پہلو روشنی میں آجائے ہیں، تاریکیاں کافور ہونے لگتی ہیں، گتھیاں سلیم جاتی ہیں۔ اور بات نکھر کر سامنے آجائی ہے۔

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مشورہ ہر شخص کو نہیں دیا جاتا، بلکہ دنیا کے باشور انسان اپنی قیمتی رائے کا اٹھاہار صرف انہی لوگوں کے سامنے کرتے ہیں جن پر انھیں اعتماد ہو، اچھا مشورہ بازارِ علم و فن کا وہ قیمتی جو ہر ہے جس کی قیمت کا اندازہ صرف جو ہری ہی کر سکتا ہے۔

نیز اہل عقل کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ مشورہ ہر معاملے میں نہیں کیا جاتا، جو معاملات طے شدہ ہوں، جن باتوں کی مذہب میں وضاحت کر دی گئی ہو یا جو چیزیں عقل انسانی کی کسوٹی پر آکر نکھر جکی ہوں، ان کے سلسلے میں مشورہ نہ صرف یہ کہ بے ضرورت بلکہ تضییع اوقات ہے، ہاں اگر مسئلہ میں خفا ہے تو وہاں مشورہ نہ کرنا اپنے آپ کو خیر کثیر سے محروم رکھنے کے مراد ہے۔

مشورہ کا شرعاً کی نظر کر میں

شرعیت محمدیہ، جو نوع انسانی کیلئے خداوند عالم کا عطا کردہ آخری دین ہے، اس میں بھی اس کی اہمیت پر پورا ذور دیا گیا ہے، اس سلسلے میں قرآن کریم میں دو آیتیں ہیں، ایک آیت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب فرمایا حکم دیا گیا ہے۔

وشاور هم فی الامر، فاذَا
کریں اور جب مشورہ کے بعد آپ کسی
چیز کا عزم فرمایں تو اثر پر توکل دکر کے
(سورۃ آل عمران آیت ۱۵۹)

اقدام فرمایا، کریں

چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کی اس طرح تعمیل کی کہ صحابہ کرام کے بیان کے مطابق آپ سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی نہیں تھا، آپ کے مشورہ فرمانے کی تفصیلات اور اس سے متعلق بحثیں آئندہ صفحات میں پیش کی جا رہی ہیں۔ اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم ہے تو اقتدار درجہ اولیٰ اس کی پابند ہے۔ چنانچہ قرآن کریم میں دوسری جگہ مونین کے اوصاف تمیہ بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ
وَأَقْامُوا الصَّلَاةَ وَ
أَمْرُهُمْ شُورِيٌّ بِيَنِهِمْ
وَمِتَارِزْ قَنْهُمْ يَنْفَقُونَ ۝

(سورة الشوریٰ آیت ۳۸)

اور وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کا حکم مانا
اور جنہوں نے نماز کو قائم رکھا اور جو
آپس کے مشورے سے کام کرتے ہیں۔ اور
جو ہمارے دنے ہوئے رزق کو خرچ کرتے
ہیں۔

چنانچہ مونین نے مشورہ طلب امور میں شوریٰ کے ذریعہ فیصلہ کو جوان کا پہلے سے معمول تھا، نہایت مضبوطی کے ساتھ معمول زندگی بنالیا۔ اس کی تفصیلات بھی آئندہ پیش کی جا رہی ہیں۔ یونکہ امرہم شوریٰ بینہم میں اگرچہ مقام مردح میں جملہ خبر یہ تھا، لیکن باری تعالیٰ کا کسی وصف کو مقام مردح میں واجب کے درمیان ذکر فرمانا، اس کے تاکیدی حکم کیلئے کافی ہے، امام ابو یکر جہاں التوفی نے سرہ نے نہایت مختصر اور جامع الفاظ لکھے ہیں۔

يَدِلِ على جَلَالَةِ مَوْقِعِ الشُّورِيَّةِ
ذِكْرُ كُرَنَّا مشورہ کی اہمیت اور جلالتِ شانِ
لَذِكْرِهِ لِهَا مَعَ الْإِيمَانِ رَاقِمَةً

الصلوٰۃ و بیدل علی انا مامور فہما کی دلیل ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ ہم کو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے۔
(احکام القرآن ج ۳ ص ۲۸۶)

قرآن کریم کے ان احکام کے ساتھ حدیث پاک میں مشورہ کی اہمیت پر پُورا زور دیا گیا ہے۔ جیسا کہ آئندہ صفات میں یہ بحث آرائی ہے، فقہاء اور مفسرین نے اس موضوع کا حق ادا کیا، اور اس حکم خداوندی کے ہر پہلو کی خوب خوب تتفیع فرمادی۔

قرآن کریم میں شوری کا حکم تفصیل پر مشتمل نہیں

مگر اس سلسلے میں سبے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ تفصیل و اجمال کے اعتبار سے تمام احکام شرعیہ کا انداز یکساں نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے مقامات پر شریعت جزئیات تک کی تفصیل کر دیتی ہے اور کتنے ہی مقامات پر مختلف حکمتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قواعد کیمیہ یا اصولی رہنمائی کی صورت میں حکم دیا جاتا ہے۔ عبدالوہاب خلاف اپنی مشہور کتاب اصول الفقہ میں لکھتے ہیں۔

احکام القرآن ثلاثة، اعتقادیة، احکام القرآن میں طرح کے ہیں۔ اعتقادی احکام، اخلاقی اور عملی، پھر عملی احکام دو نوع پر مشتمل ہیں، عبادات اور معاملات اور معاملات عصر حاضر کی اصطلاح میں سائٹ طرح کے ہیں۔ شخصی احوال دینیں لا، شہری احکام تعزیزی الشخصية، الاحکام المدنیة، خلقيۃ، عمليۃ والاحکام العلمیۃ تنظم فوعین، العبادات و المعاملات و المعاملات في اصطلاح العصر الحديث ينقسم إلى سبعة أحوال الشخصية، الاحکام المدنیة،

احکام، مرافعہ (عدالتی کارروائی) کے احکام قانونی اور دستوری احکام دولی اور ملکی احکام اور اقتصادی احکام

بین بین بین بین

الاحداث الجنائية، احکام المراجعت، الاحکام الدستورية، الاحداث الدولية، الاحکام الاقتصادية۔ (اصول الفقه خلاصہ)

اس تفصیل کے بعد رقم طراز ہیں۔

آیات احکام کا استقرار کرنے والوں پر واضح ہے کہ قرآن کریم کے احکام عبادات کے باب میں تفصیل ہیں، اسی طرح شخصی احوال اور وراثت کے احکام بھی تفصیل ہیں اس لئے کہ اس نوع کے اکثر احکام تعبدی ہیں، عبادات اور شخصی احوال کے علاوہ جو شہری، تفسیری، دستوری اور ملکی احکام ہیں وہ عامہ قواعد اور اساسی اصول کی صورت میں ہیں اور ان کے بارے میں قرآن کریم نے جزوی تفصیلات شاذ و نادر ہی بیان کی ہیں سلسلے کریے احکام معاشرے اور ماحول اور مصلحتوں کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل ہو جاتے ہیں۔

من استقرأ آيات الاحداث يتبعين ان احكامه تفصيلية في العبادات وما يتحقق بها من الاحوال الشخصية والمواث لان احکام هذا النوع تعبدی واما فيما بعد العبادات الاعمال الشخصية من الاحکام الدينية والجنائية والدستورية و الدولية فاحکامه فيها قواعد عامة ومبادی اساسية ولم يتعرض فيها لتفصيلات جزئية الا في النادر لان هذہ الاحکام بتطور البيانات والمصالح (اصول الفقه خلاصہ)

ان عبارتوں سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ تمام احکام کی نوعیت یکساں نہیں ہے، کہیں شریعت تفصیل کرتی ہے اور کہیں اجمال سے کام لیتی ہے، اور اجمال سے کام یعنی کی بنیاد مجبوری یا معاف الشد کوتاہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد پر ہے کہ یہ احکام ضروریات اور معاشرے کی تبدیلی کے سبب جزوی تمیم کے مقاضی ہیں، ان احکام میں شریعت کے بنیادی مقاصد اور اساسی حکم کو برقرار رکھتے ہوتے، تفصیلات کی تعین میں حالات کی رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے۔

اجمائی احکام کی چند نظریں

اصولی طور پر عبد الوہاب خلاف کی عبارت میں ایسے مقامات کی وضاحت کردی گئی ہے جہاں شریعت نے جزوی تفصیلات کے بجائے اصول رسمائی کو کافی سمجھا ہے کہ تمدنی، تعزیری، دستوری اور ملکی احکام میں عام طور پر جزوی تفصیلات کی تعین نہیں کی گئی ہے۔ لیکن مناسب ہو گا کہ اس سلسلے میں چند نظریں پیش کر دی جائیں۔ مثلاً قیام عدل ہے قرآن کریم کا حکم ہے۔ اعدالواہو اقرب للتفوی، عدل اختیار کرو کہ یہ تقوی سے بہت قریب ہے، لیکن قیام عدل کی جزوی تفصیلات بیان نہیں کی گئی ہیں، الطرق الحکمیۃ میں علام ابن قیم لکھتے ہیں۔

شریعت کے حکم عدل کا مقصد، اللہ کے
بندوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور
لوگوں کا انصاف پر قائم رہنا ہے۔

ان مقصودہ ایامۃ العدل
بین عبادۃ و قیام الناس
بالقسط، فای طریق استغراج

بها العدل والقسط فهی من
الدین لیست مخالفۃ له،
(الطرق الحکمیۃ ص ۲۱)
کو لا یا جائے وہ دین ہی کا حصہ ہو گا۔
دین کے خلاف نہ ہو گا۔

اسی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرضیہ بھی اسی نوع کی مثال
ہے۔ الدستور القرآنی میں ہے۔

لیس فی القرآن تحدید لکیفیۃ
القیام بهذذا الواجب وقد
یتبادر من هذَا ان الکیفیۃ
متروکة لحکمة المسلمين و
طروح فهم -

(دجواں حالات زمانہ کی رعایت ص ۲۲)

مولانا ابو الحسن علی صاحب ندوی، اصلاح و دعوت کے بارے میں لکھتے ہیں

اصلاح و دعوت کی کوئی خاص شکل یا تعین میدان یا لگابند حاکوئ

ایسا نظام نہیں ہے جس کو تبدیل کرنا یا جس سے ہٹانا جائز ہو بلکہ

یہ ان فرقہ دینیہ میں سے ہے جن کا کوئی متعین نظام یا خاص شکل

منصوص نہیں ہے：“ (دستور حیات ص ۲۳)

اس طرح کے احکام کی فہرست پیش کی جاسکتی ہے، خلافت و حکومت

یا امامت کا قیام واجب ہے مگر اس کی کوئی معین صورت ہمنصوص نہیں۔

محکم قضا کا قیام ضروری ہے اور اس کی تفصیلات منصوص نہیں، طلب علم

فریضہ ہے اور اس کی خاص شکل معین نہیں، جہاد فرض ہے اور اس کا خاص طریقہ کار منصوص نہیں، کیفیت احسان کا حصول مطلوب ہے اور اس کے حصول کا کوئی خاص طریقہ منصوص نہیں وغیرہ۔

شوری کے احکام بھی تفصیلی نہیں ہیں

شوری کا حکم بھی انہی احکام میں سے ہے، قرآن کریم میں دو جگہ اصولی طور پر تاکید فرمادی گئی ہے، کہ ایک جگہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ بھی مشورہ فرمائیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں ذکر فرمایا گیا کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں، روایات میں بھی اصولی طور پر فرمایا گیا ہے کہ خلافت مشورے کے بغیر نہیں ہے۔ فرد واحد کی رائے نافذ کرنے کے بجائے فقہاء و عابدین کے مشورے سے بات طے کی جائے غیرہ، لیکن اس کے باوجود شوری کا کوئی معین طریقہ کار منصوص نہیں ہے۔ بلکہ شوری کے وجوبی حکم کی تعمیل میں جو صورت بھی اختیار یا جو تجویز کر لی جائے، حکم خداوندی کی تعمیل ہو جائے گی، علامہ رشید رضا مصری، الاعتصام کے حاشیہ پر لکھتے ہیں۔

ان اللہ قد اکمل الدین
من حیث هودین اصولا
وفروعًا فلا يجوز ان يزاد
فيه بالاجتهاد والقياس كما

بے شک اللہ تعالیٰ نے دین کو بھیت دین
اصولی اور فروعی طور پر مکمل فرمادیا ہے
چنانچہ ان (منصوص احکام میں) اجتہاد اور
تفسیس کے ذریعہ کوئی اضافہ یا کمی

نہیں کی جاسکتی، رہا دین کا شہری یا انتظامی
حیثیت سے مکمل ہونا تو وہ ان اصول
ثابتہ کی صورت میں ہے جو ان جزئیات
کی رہنمائی کرتے ہیں جو زمانہ کی تبدیلی کے
ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں جیسے شوریٰ کا
بنیادی حکم اور ارباب حل و عقد کی اطاعت
کا بنیادی مکمل، ان احکام میں جو خلاف
شیعہ نہ ہوں۔ یعنی قول مختار ہے۔

لا يجوز ان ينقص منه، واما
الكماله من حيث هو شريعة
مدنية سياسية فبالصل
التابعة الهادية الى الفروع
التي تختلف باختلاف الزمان
كامل الشوري وطاعة أهل
الحل والعقد فيما لا يخالف
الشرع. هذَا هو المختار

(حاشیۃ الاعتصام ص ۲۵۵)

عصر حاضر کے نامور عالم شیخ ابو زہرہ مصری بھی تصریح فرماتے ہیں کہ شوریٰ
کا حکم اسی شان کا حامل ہے۔

بے شک قرآن کریم نے شوریٰ کے ذرائع
وضاحت کے ساتھ بیان نہیں کئے جیسا کہ
عدالت کو وجود میں لانے کے ذرائع کی وضاحت
نہیں کی بلکہ اسکو انسانوں کی صوابیدی پر محصور ہے
و یا تاکہ وہ مقصد تک بدرجہ اتمم پہنچانے والے
اچھے سے اچھے وسائل اختیار کر سکیں اور اسلئے
کہ شوریٰ کے وسائل، جماعتوں کے بدلتے
سے بھی بدلتے ہیں، لوگوں کے احوال کے

ان القرآن لم یبین وسائل
الشوري کمالم یبین وسائل
تحقيق العدالة بل ترك ذلك
لتقدير الناس لينتهجوا
احسن الوسائل التي توصلهم
إلى المطلوب على الوجه الأكمل
ولأن وسائل الشوري تختلف
باختلاف الجماعات وباختلاف

احوال الناس وباخت نف العصو
اختلاف سے بھی بدل جاتے ہیں، اور زمانہ کی تبدیلی سے بھی بدل جاتے ہیں۔
(اممٰوٰه الفقه اوزرہ ۹۵)

ان حوالوں سے یہ بات معلوم ہوتی کہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ شریعت نے عبادات اور شخصی احوال کے علاوہ، بہت سی سیاسی، تمدنی، دستوری اور تعزیری احکام میں تفصیلات بیان نہیں کی ہیں اور شوریٰ بھی انہی احکام میں سے ہے جس میں شریعت نے جزویات کی تفصیل کا اتهام نہیں کیا اور اس کی بنیاد نعوذ باشد کوئی مجبوری یا کوتاہی نہیں بلکہ اس کی بنیاد تغیر پذیر انسانی معاشرے کی رعایت ہے کہ اصولی طور پر مشورہ کو ضروری قرار دیدیا گیا۔ اور تفصیلات کو حالات زمانہ کی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے طے کرنے کی اجازت محنت فرمادی۔

لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ تفصیلات کی تعین کا عمل بھی ایک دشوار عمل ہے، اور اصالۃ یہ عمل، قواعد کلیہ پر جزویات کی تطبیق کا عمل ہے جس کے لئے خاص شرائط اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے، اسلئے ضروری ہو گا کہ عصر حاضر کے علماء و مفکرین، متفکرین کی متعین کردہ را ہوں کے علاوہ نئی را میں تلاش نہ کریں، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ لن یصلح اخر هذہ الامة الابدا صلح بد او لها کہ اس امت کا آخری طبق بھی انہی بنیادوں پر صلاح سے ہمکنار ہو سکتا ہے جن بنیادوں پر امت کے اولین طبقہ کو صلاح کی دولت نصیب ہوئی ہے۔

شوریٰ، عقل و شرعیت دونوں ہی کے اتفاق سے ایک قابل تعریف

وصف ہے لیکن اس دور میں ایک بالکل نیا نقطہ نظر سامنے آیا ہے کہ شوری محفوظ م收拾 ہے اور اس استحباب پر عمل کر لینے کیلئے چند اہل مشورہ سے تبادلہ خیال کافی ہے، اس کے بعد امیر المؤمنین سے لیکر ماتحت امراء تک سب کو یہ اختیار تمیزی حاصل ہے کہ وہ شوری میں پیش کردہ مختلف زاویوں میں سے کسی ایک زاویہ کو ترجیح دیدیں۔ بلکہ خود امیر بھی چونکہ شوری کا ایک فرد ہے اس لئے اگر وہ اپنی ہی رائے کو ترجیح دینا مناسب سمجھے تو یہ بھی خلاف شرع نہیں کیونکہ اس کی رائے بھی اہل شوری ہی میں سے ایک کی رائے ہے۔

لیکن اس نقطہ نظر کی وکالت کرنے والے حضرات نے غور نہیں فرمایا کہ امرا کو علی الاطلاق اتنی آزادی دینے کا مفہوم تو یہ ہو گا کہ شورائیت کا صرف مندرج استبداد بالرائے کی صورت میں تبدیل ہو جائے گا جس سے بچنے کے لئے شوری کا حکم دیا گیا تھا، یعنی قرآن کریم تو مقام مدرج میں یہ کہہ رہا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں لیکن اس نئے نقطہ نظر کے مطابق، شوری کا تو صرف قالب رہا کہ چند لوگ ایک جگہ بیٹھے ہوئے نظر آئے، روح تو استبداد بالرائے میں تبدیل ہو گئی کہ بالآخر فیصلے کی زمام فروذ واحد کے ہاتھ میں آگئی۔

حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحب قدس برستہ اور حضرت مولانا محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں۔

”عام امراء کے متعلق کیسے کہا جاسکتا ہے کہ ارشد دہی ہے جو امام یا

امیر کی رائے ہے بلکہ واقعاتِ عالم اس کے خلاف شہادت دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ امرِ ہم شوریٰ جو بینہم کی قید بھی رکھتا ہے بمعنی ہوگا، قاضی بیضاوی جن کے الفاظ آیت شادر ہم کی تفسیر میں موہم واقع ہوتے ہیں وہ امرِ ہم شوریٰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ لاینفرون برائی حتیٰ یتشاردرو اوجتمعاً علیہ (بیضاوی ص ۲۳)

گویا مجب مدرج یہی جائز ہے کہ انفرادی رائے پر عمل نہیں ہوتا بلکہ مشاورت کے بعد جو اجتماعی رائے ہوتی ہے اس پر عمل ہوتا ہے۔

(فتاویٰ مطبوعہ اخبار الجمیعہ اکتوبر ۱۹۳۵ء)

امیر قرار دیکر فرد واحد کے ہاتھ میں زمام کار دینے والے نقطہ نظر میں بھی یہی ہوا ہے کہ شوریٰ کے بارے میں قرن اول اور مسند بن کی تصریحات کی پابندی نہیں کی گئی، یونکہ شوریٰ کے مقابلہ پر تمام امرار کی آتنی مطلق العنان کا ثبوت خبر القرون یا مسند میں کے یہاں نہیں ملتا، اور جن جزوی واقعات سے یہ نقطہ نظر اپنی تائید کر رہا ہے ان میں سے بعض واقعات کا تو شوریٰ سے تعلق ہی نہیں ہے جیسے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ، اور بعض واقعات کا شوریٰ سے ربط ضرور ہے جیسے جیش اسامہؓ کی روانگی یا مانعین زکوہ سے مقابل کے واقعات، لیکن ان واقعات میں فیصلے کی بنیاد امیر کا اختیار نہیں، بلکہ فیصلے کی بنیاد کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے۔ شوریٰ سے ربط رکھنے والے واقعات پر بحث آئندہ صفحات میں اپنی جگہ آرائی ہے، لیکن حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کا واقعہ شوریٰ کی بحث سے اصلاح مربوط بھی نہیں ہے اسلئے

اس کا مذکورہ شوریٰ کی بخوبی کے درمیان نہیں آئے گا، مناسب علوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں اختصار سے یہیں عرض کر دیا جائے۔

حضرت بریرہ رضی اللہ عنہما کا واقعہ

حضرت بریرہ رضی کا واقعہ یہ ہے کہ جب ان کو حضرت عائشہؓ نے خرید کر آزاد کیا وہ اس وقت حضرت مغیث رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ اسلام کے قانون کے مطابق انہیں خیارِ عتق یعنی یہ اختیارِ ملاکہ غلامی کے زمانہ کے نکاح کو چاہیں تو باقی رکھیں اور چاہیں تو فتح کر دیں، حضرت بریرہؓ نے اسلام کا عطا کر دہ حق استعمال کیا اور اپنا نکاح فتح کر لیا، حضرت مغیثؓ کو ان سے بہت تعلق تھا وہ اتنے پریشان ہوئے کہ مدینہ طیبہ کی گلیوں میں روٹے پھرتے تھے۔ اسی حالت میں انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آپ بریرہ سے میرے بارے میں سفارش فرمادیں، ابو داؤد میں یہ عن ابن عباسؓ ان مغیثا کا ان حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ عبد افقال یا رسول اللہ !

حضرت مغیث غلام تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ بریرہ سے میری سفارش فرمادیں تو آپ نے بریرہ سے فرمایا کہ بریرہ ! اللہ سے ڈر، وہ تیرا شوہر ہو جائے ہے اور تیرے بچوں کا باپ ہے، حضرت بریرہؓ نے پوچھا کیا آپ مجھے حکم فرمائے ہیں ؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں صرف سفارش کر دیا ہوں

قال لا انما انما شافع (ابوداؤد ۳۰۴)

روایت نقل کرنے کا منشایہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طور پر حضرت بریرہ سے بات نہیں کی، بلکہ حضرت مغیث کی درخواست پر آپ نے حضرت بریرہ کو سمجھایا، اس سمجھانے کی جو تفصیلات حدیث پاک کی عامم کتابوں میں ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ آپ کی فہمائش یا سفارش کے بارے میں حضرت بریرہ نے یہ استفسار کیا اتنا مردی، یعنی کیا یہ آپ کا حکم ہے؟ اگر حکم ہے تو بسر وچشم قبول کروں گی، لیکن آپ نے جواب دیا۔ لاما ناشافع، بخاری شریف ص ۹۵ ج ۲، میں، مسندا حمد م ۱۵ ج ایں، ابن ماجہ کتاب الطلاق میں شافع کے بجائے اشفع، یعنی صینہ، اسم فاعل کے بجائے، مضارٹ کا صینہ ہے۔ گویا حدیث پاک کی مشہور کتابوں میں مشورہ کا کہیں ذکر نہیں، شفاعت اور سفارش کا ذکر ہے، امام بخاری نے عنوان بھی باب شفاعة النبی فی زوج بریرہ منعقد کیا ہے، علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ائمما انا اشفع پر تحریر فرمایا ہے۔

ای اقوال ذلک علی سبیل یعنی میں پہ بات تم سے سفارش کے الشفاعة له (فتح الباری بنیہ)

طور پر کہہ رہا ہوں۔

علامہ عینی نے بھی اس روایت سے سفارش کے متعدد مسائل پر استدلال کیا ہے، مشورہ کے کسی بھی مسئلہ پر ان حضرات میں سے کسی نے استدلال نہیں فرمایا اور یہ طے شدہ بات ہے کہ شفاعت اور مشورہ میں بڑا فرق ہے شفاعت کی حقیقت معلوم ہو جائے تو فرق خود بخود واضح ہو جائے گا۔ کشاف اصطلاح الفنون میں شفاعت کی تعریف اس طرح کی گئی ہے۔

الشفاعة بالفتح و تخفيف الغاء شفاعت دشین کے فتح اور فارک تخفیف

کے ساتھ، عاجزی کے طور پر دوسرے کی خاطر، دوسرے کے بارے میں، بھلانی کا سلوک کرنے یا نقصان سے دست بردار

ہی سوال فعل الخیر و ترك
الضرر عن الغير لاجل الغير على
سبيل التضرع۔

دکشان اصطلاحات الفنون ج ۲۶) ہونے کے سوال کو کہتے ہیں۔

یعنی اگر کوئی شخص، کسی دوسرے شخص سے کسی تیسرا شخص کے بارے میں نفع پہنچانے یا اس کو نقصان سے محفوظ رکھنے کا عاجزی کے طور پر سوال کرتے تو اس کو شفاعت کہتے ہیں، علامہ زمخشیری نے شفاعت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

الشفاعة الحسنة هي التي

شفاعت حسنة ہے جس میں کسی مسلمان

روى بها حق مسلم و دفع بها

بجانی کے حق کی رعایت محفوظ ہوا اور شفاعت

عنہ شر او جلب الیه خير و

کے ذریعہ اس سے کسی شر کو دور کیا گیا ہو یا

ابتعني به وجہ الله ولم تؤذ

اس کے لئے کسی خیر کو حاصل کیا گیا ہو اور

عليه رشوة وكانت في امر

مقصد محض رضاۓ خداوندی ہو، کوئی ثبوت

جائز لافي حد من حدود

نہیں گئی ہو، معاملہ فی نفسہ جائز ہو، حدود

الله ولا في حق من الحقوق

خداوندی یا حقوق خداوندی سے اس کا

والسيئة ما كان يخالف ذلك

تعلق نہ ہو اور شفاعت سیئہ وہ ہے جو

(الكتاف ۵۳۹ ج ۱)

اس کے برعکس ہو۔

غور کر لیا جائے کہ شفاعت کی تحقیقت میں، مشورہ کا کوئی ذکر نہیں ہے

اور اگر اس طرح غور فرمایا جائے کہ شفاعت بارگاہ خداوندی میں بھی ہوتی ہے

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بارگاہ خداوندی میں شفاعت فرمائیں گے ہمیں میں

فوت ہونے والے پتے بارگاہ خداوندی میں شفاعت کریں گے، تو مضمون اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے کہ مشورہ کی حقیقت، شفاعت سے بالکل الگ ہے ورنہ اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ یہ شفاعت کرنے والے پروردگار کو مشورہ دے رہے ہیں۔ بلکہ جن روایات میں انہما اناشافع کا لفظ آرہا ہے اگر ان کو اصل قرار دیا جائے تو انہما جو نکہ کا لفظ بھی ہے اور مقصود علیہ انہیں کے جملوں میں بھی شہادت میں اس معاملہ میں میری حیثیت صرف شفاغت کنندہ کی ہے، یعنی میں اس وقت پیغمبر کی حیثیت سے، حاکم کی حیثیت سے یا مشیر کی حیثیت سے گفتگو نہیں کر رہا ہوں۔ اس وقت میری حیثیت صرف سفارش کرنے والے کی ہے۔ اس لئے اگر انہما اناشافع کو اصل تعبیر قرار دیا جائے تو اس میں خود مشورہ کی حیثیت کی نظر نہیں ہے۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم ہی کر دیا جائے کہ سفارش کی بعض سورتیں مشورے کی بعض سورتوں سے مشابہت رکھتی ہیں تو حضرت بریرہ کے واقعیں یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ اس کا تعلق بخی زندگی اور اخلاق کی تلقین سے ہے، یہ کوئی دستوری یا قانونی بات نہیں ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب حمد اللہ نے جو جماعت البالغین میں ایک مستقل بحث کی ہے کہ شریعت میں دو طرح کے علوم بیان فرمائے گئے ہیں اور دونوں میں فرق ہے۔

اعلم ان الشارع افادنا	شارع نے میں دو طرح کے علوم عطا کئے ہیں جن کے احکام الگ الگ ہیں، جن
نوعین من العلم متماثلين	

کے محل الگ الگ ہیں، ایک مصالح اور مفاسد کا علم ہے یعنی وہ چیزیں جن کا تعلق نفس کی تہذیب سے ہے کہ دنیا و آخرت میں نفع پہنچانے والے اخلاق اختیار کرنے چاہئیں اخراج اور دوسرے علوم میں جن کا تعلق شرائع اور حدود سے ہے اخراج اور اس دوسری قسم کا تعلق، ملی سیاست کے قوانین سے ہے۔

اس لئے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ حضرت بریرہؓ سے کی گئی سفارش کا تعلق، اخلاق سے ہے یا قوانین سے، خیارِ عتق کا قانون چونکہ حضرت بریرہ استعمال فرمائچکی ہیں، اس لئے اس سلسلے میں اب جوبات ان سے کی جا رہی ہے اس کا تعلق، اخلاق کی تلقین ہی سے مانا جائے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اول توحضرت بریرہؓ کے واقعہ میں شوریٰ کا ذکر نہیں، شفاعت کا ہے۔ اس لئے اس واقعہ سے مشورہ کے کسی بھی جزو پر استدلال درست نہیں۔ دوسری یہ کہ اگر توسع کے طور پر یہاں مشورہ مان بھی لیا جائے تو اس کا تعلق اخلاق سے ہے قوانین سے نہیں۔

وَالْعِلْمُ عِنْدَ اللَّهِ

با حکماً همَا متبَّأْتِينَ فِي مَنَازِلِهَا
فَاحِدُ النَّوْعَيْنِ عِلْمُ الْمَصَالِحِ وَ
الْمَفَاسِدِ اعْنَى مَا بَيْنَهُ مِنْ تَهْذِيبِ
النَّفْسِ بِالْكَسَابِ الْإِخْلَاقِ
النَّافِعَةِ فِي الدُّنْيَا وَ فِي الْآخِرَةِ إِنَّمَا
وَالنَّوْعَ الثَّانِي عِلْمُ الشَّرِّ ثُمَّ وَ
الْخَدْدُودِ إِنَّمَا وَمَرْجِعُ هذَا
النَّوْعِ إِلَى قَوَاعِدِ السِّيَاسَةِ
الْمَلِيَّةِ (رجوعه الله البالغة بعده م ۱۷۹)

شوری پر احتمالی تبصرہ

شوری کے بارے میں کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس پر علماء امت نے روشنی نہ ڈالی ہو، کیونکہ قرآن کریم میں اس سلسلہ میں دو آیات میں اور احادیث پاک میں بھی اس کی بہت اہمیت بیان کی گئی ہے، ان آیات و احادیث کے ذیل میں متقدمین سے لے کر متاخرین تک، محدثین و مفسرین کرام نے منحورے کے موضوع پر بہت قیمتی ذخیرہ قلمبند فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مجلس شوریٰ کا اصل مسئلہ امیر المؤمنین یعنی حکومتِ اسلامیہ کے سب سے بڑے منصب یا سلطان وقت سے متعلق ہے کیونکہ علماء تفسیر کے علاوہ تمام علماء نے شوریٰ کی بحث، خلافت کی بحث کے ساتھ کی ہے، علماء تفسیر پر بحث دونوں آیات کے تحت کرتے ہیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوں تمشورہ کا حکم عام بھی دیا ہے۔ لیکن خلافت کے ساتھ اس کا رابطہ آپ کے ارشادات میں بھی ہے کہ میں اگر مشورہ کے بغیر کسی کو نامزد کرتا تو عبد اللہ بن مسعود کو خلیفہ نبادیتا، حضرت عمر نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ شوریٰ کے بغیر اگر کسی کی بیعت کی جائے گی تو وہ قابل قبول نہ ہوگی۔ غرض یہ ہے کہ شوریٰ کا اصل تعلق خلافت عالیہ سے ہے اور یہ بحث وہیں کی ہے کہ شوریٰ کو خلیفہ پر بالادستی حاصل ہے یا خلیفہ کو شوریٰ پر خلیفہ کے بارے میں دونوں ہی نقطہ نظر پائے جاتے ہیں، مگر در نقطہ نظر خلیفہ کی بالادستی کا ہے۔ اور راجح نقطہ نظر مجلس شوریٰ کی بالادستی کا ہے کیونکہ خلیفہ کو شوریٰ اور قرن اول کے تمام علماء کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ خلافت راشدہ اور قرن اول کے تمام علماء کا اتفاق رائے معلوم ہوتا ہے کہ

مجلس شوریٰ یا ارباب حل و عقد کی مجلس امیر المؤمنین پر بھی بالادست ہے۔ لیکن ماتحت امراء کے بارے میں دورائے نہیں ہیں، انھیں ہر طرح پابند کیا جاسکتا ہے، ہر ماتحت امیر اپنے بالادستوں کا مامور ہوتا ہے اور اسکے لئے اپنے بالادستوں کے سامنے جواب دہ، ہونا ناگزیر ہے، کسی بھی امیر کے بارے میں نگرانی قائم کی جاسکتی ہے اور اس ماتحت امیر کے لئے ضروری ہو گا کرشمہ یا نگران کے بغیر کوئی اقدام نہ کرے، اس لئے اگر کسی ماتحت امیر پر مجلس شوریٰ یا ارباب حل و عقد کی مجلس اولو الامر کو بالادستی دیدی جائے تو اس کے جواز میں نہ شرعاً کوئی کلام ہے اور نہ عقلاءً کوئی اشکال ہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ امیر المؤمنین یا ماتحت امراء کے حق میں مشورہ کی اہمیت کیسے کم کی جاسکتی ہے جب کہ قرآن کریم میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ صحابہؓ کرام سے مشورہ فرمایا کریں، آپؓ کو یہ حکم بصیغہ امر دیا جا رہا ہے، مفسرین کی ایک بڑی جماعت اس صیغہ امر کو وجوہ پر محمول کر رہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ غیر منصوص مسائل میں احکم المأمورین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مشورہ کا پابند بنارہا ہے اور انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورے کے اس حکم کی اتنی پابندی فرمائی ہے کہ روایات میں تصریخ موجود ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کا پابند کوئی نہیں تھا۔ مفسرین کرام تصریخ کر رہے ہیں کہ مشورہ آپؓ کیلئے بھی ضروری تھا۔ اور مشورے کے بعد جو عزم کا تذکرہ ہے اس میں بھی یہ وضاحت کر رہے ہیں کہ یہ عزم مشورے سے آزاد نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہ عزم ہے جو مشورے سے پیدا

ہوا ہے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نقل فرماتے ہیں کہ عزم کے معنی ہیں اہل رائے میں مشورہ لینا، اور پھر اس کا اتباع کرنا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر منصوص مسائل میں مشورے کی مجلس میں جو طے ہوا س کو اللہ کے اعتماد پر نافذ فرمائیے اور اس سلسلے میں مشورہ یا کسی اور چیز پر اعتماد نہ فرمائی کیونکہ مشورہ تو صرف مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر کے طریق کار کے تعین کے لئے تھا۔ جب مشورہ کے بعد طریق کا تعین ہو گیا تو اب اس کے نفاذ میں اللہ سے مدد طلب فرمائیے۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آیت پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم محض استحباب کیلئے ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عزم، فیصلہ کیلئے شوریٰ پر غالب ہے تب بھی یہ بات بالکل طے شدہ ہے کہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے، آپ کی کتنی ہی خصوصیات ایسی ہیں جن میں امت بلکہ انسانیت کا کوئی فرد شریک نہیں، مشورہ حقیقت حال کی تنقیح کی کوشش تھا اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا نے وہ علوم عطا فرمائے ہیں کہ ساری دنیا کے عقول، کے حصہ میں اس کا ذرہ بھی نہیں آیا، آپ کو وحی جیسے طاقتو زر یعنی معلومات پر ذمترس حاصل ہے، عقل و دانش کے سلسلے میں آپ کو وہ تفوق عطا کیا گیا ہے جو کسی فرد بشر کا حصہ نہیں اس لئے مشورہ کے باب میں بھی آپ کے ساتھ کسی اختصار یا امتیاز کا معاملہ کیا جائے تو اس میں کوئی استبعاد نہیں، البتہ آپ کی اس خصوصیت میں دوسرے حضرات کو شامل کرنا یا شامل سمجھنا، اور عنہم ت

کے صیغہ خطاب کو دیگر امارات مسلمین کے لئے عام کرنا، عقل شریعت، اصول فقہ اور تصریحات علماء کے خلاف ہو گا۔

عہد رسالت کے فوراً بعد خلافت کا انعقاد بھی شوری سے ہوا اور خلافت کے تمام امور مشورہ سے انجام پاتے رہے، مہر نے پیش آمدہ مسئلے میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے شوری کی پابندی فرمائی، اپنے آخری وقت میں انہوں نے مسلمانوں سے مشورہ کرنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر فرمایا، حضرت عمر نے خلافت کے بارے میں بھی تصریح فرمادی کہ شوری کے بغیر اس کا انعقاد نہیں ہوتا۔ اور تمام امور سلطنت باہمی مشورہ، اور شوری کی بنیاد پر طے ہوتے رہے، پورا نظام خلافت شوری کی بنیاد پر استوار فرمانے کے بعد حضرت عمر نے دوسرے خلیفہ کے انتخاب کے لئے آخری وقت میں چھ سو سال تفری شوری مقرر فرمائی جس نے حضرت عثمانؓ کا انتخاب کیا، حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنے پورے عہد خلافت میں شوری پر عمل فرماتے رہے۔

پھر خلافت عابیہ کا انعقاد اگر مجلس شوری کی مانعیت میں ہوتا ہے تو کیا دلیل قائم ہے کہ اس کی بقا اس پر موقوف نہ ہو، یقیناً اسکی بقا اس کی حیات اس کا فروع اور اس کا بارآ اور اورامت کے لئے مفید اور مشرم خبرات ہونا بھی مشورے کی بالادستی میں ضمیر ہے، یہ کوئی داشمندی نہیں ہے کہ خلافت کی آفرینش تو مجلس شوری کے بطن سے ہو، لیکن وجد میں آنے کے بعد اسے شوری سے بے نیاز کر دیا جائے، بلکہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ جب حکومت کا سبکے بڑا کام اور اقتدار انسانی کا سبکے بڑا محل مجلس شوری کے ہاتھوں تغیری ہو رہا ہے تو اسے نیچے کے

تمام مرحلے بھی شوریٰ ہی کے زیر اثر، زیر نگیں اور زیر قیادت انجام پذیر ہوں گے جیسا کہ خلافتِ راشدہ کے زریں عہد میں غیر منصوص جزئیات کا حکم معلوم کرنے کیلئے شوریٰ کی پابندی کی گئی۔

بلکہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ خلافتِ راشدہ میں غیر منصوص مسائل کے سلسلے میں شوریٰ کے ذریعہ حکم معلوم کرنے کی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی روشن سے امت کو آئندہ کام کرنیکا طریقہ معلوم ہوا۔ انہوں مجتہدین نے انہی کے طریقے سامنے رکھ کر اجتہاد و استنباط احکام کے اصول مرتب فرمائے، کیونکہ صحابہ کرام کے سامنے اجتہادی اور اختلافی معاملات میں حکم شرعاً معلوم کرنے کیلئے قرآن کریم کا بیان کردہ یہ اصول تھا۔

فَإِن تَنَا زَعْلَمَ فِي شَيْءٍ فَرِدُودٌ
أَكْرَسِيْ چیز کے بارے میں تمہارے درمیان
الْخِلَافُ ہو جائے تو خدا اور رسول خدا
کی طرف رجوع اکر کے، حکم معلوم کرو۔
(سورۃ النساء آیت ۵۹)

چنانچہ صحابہ کرام ہی کی مجتہدانہ بصیرت سے کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے اصول متعین ہوئے جو قیامت تک پیش آنے والی تازہ جزئیات کا حکم معلوم کرنے کا ذریعہ بنے، کیونکہ صحابہ کرام کے دور میں ارباب شوریٰ کی پوری کوشش ہی رہتی کہ ہر معاملہ میں کتاب و سنت کا حکم معلوم کیا جائے۔

کہیں شوریٰ میں کتاب و سنت کا صریح حکم سامنے آجائا، حکم کی صراحت نہ ملتی تو قواعد کلید کے تحت لاکر حکم معلوم کیا جاتا، کبھی کوئی نظر سامنے آجائی اور ایک نظر کا حکم دوسری نظر پر قیاس کر لیا جاتا، کبھی حکم منصوص کی علت کا

استخراج کرنے کے تعداد کیا جاتا اور اگر ایسا جزئیہ ہوتا جس کا تعلق انتظام دعیہ سے ہو اور کتاب و سنت میں اس کا حکم معلوم نہ ہو سکے تو مشورہ میں جو طے ہو جاتا امیر المؤمنین کو اس کے نفاذ میں تاصل نہ ہوتا۔ یہ بھی نہیں ہوا کہ شوری منعقد ہوئی ہو اور اہل شوری کی رائے کو اہمیت نہ دی گئی ہو بلکہ خلیفہ نے اپنے اختیار تمیزی سے کسی رائے کو ترجیح دیدی ہو۔

عصر حاضر میں غیر منصوص جزئیات کا حکم معلوم کرنے کے لئے کتاب و سنت کی مراجعت کے باب میں شوری کا کام بہت آسان ہو گیا ہے کیونکہ انہی مجتہدین نے حقیقی بھی جزئیات مدون فرمائی ہیں وہ سب کتاب و سنت کی طرف مراجعت اور غیر منصوص مسائل میں حکم شرعی کو معلوم کرنے کی سی مشکوری کا دوسرا نام ہیں۔

شوری پر اجمالی تبصرے کے بعد اب عہد رسالت میں مشورہ، خلافتِ راشد و میں شوری، سلطان سے شوری کی نسبت، ویگرا مراد کیلئے شوری کا حکم اختلاف رائے کی صورت میں فیصلے کا طریقہ اور مشورہ طلب امور کی وضاحت وغیرہ پر الگ الگ قدرتے تفصیلی کلام کا آغاز کیا جاتا ہے۔ اللہم ارنا الحق حقا و ارزقنا اتباعہ والباطل باطل و ارزقنا اجتنابہ

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے مشورہ کا حکم

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر امتیازی شان کے باوصاف ان تمام معاملات میں مشورہ فرماتے رہے جن میں وہی کے ذریعہ کوئی حکم بیان نہیں

فرمایا گیا۔ اور آپ کی اس سنت سے تمام صحابہ کرام واقف تھے، آپ صحابہ کرام سے کچھ ارشاد فرماتے یا ان کو کوئی ہدایت دیتے تو وہ سبے پہلے یہ استفسار فرماتے کہ آپ کا یہ ارشاد وحی کی بنیاد پر ہے کہ ایک جانب کے علاوہ دوسری جانب غور و فکر کی گنجائش نہیں یا اس سلسلے میں کوئی گنجائش ہے اگر آپ ارشاد فرمادیجے کہ یہ ہدایت حکم خداوند کی کی بنیاد پر ہے تو بطيب خاطر اس کی تعمیل کی جاتی اور اگر آپ توسعہ کا اظہار فرماتے تو صحابہ کرام اپنی رائے پیش کرتے اور بسا اوقات آپ صحابہ کرام ہی کی رائے کو ترجیح دیتے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ طرز عمل اس بنیاد پر تھا کہ خداوند عالم نے آپ کو خطاب فرماتے ہوتے ارشاد فرمایا۔

سو یہ اثر کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان کے حق میں نرم خود واقع ہوئے ہیں اور اگر آپ تمدن خواہ و سخت دل ہوتے تو یہ آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے، تو آپ ان کو فحافر مباریں ان کے لئے استغفار کریں اور ان سے کام میں مشورہ فرمایا کریں، پھر آپ کام کا عزم کریں تو اشد پر بھروسہ کریں۔

بس ابتدی پاک میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حق میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے کہ آپ ان کو معاف فرمادیں ان کے لئے پروردگار عالم سے مغفرت کی دعا فرمائیں اور معاملات میں ان سے مشورہ

فی بارحمة من اللہ لنت لهم
ولو كنت فطا غلیظ القرب
لانفضا من حولك، فاعف
عنهم واستغفر لهم وشاورهم
فی الامر فاذاعز مت
فتوكّل عَلَى اللہِ
رسورۃ آلن عمران آیت ۱۵۹)

فرمایا کریں اور مشورے کے ذریعہ جو عزم قائم ہو جائے تو اسدر پر توکل کر کے اقدام فرمائیں۔ تفسیر قرطبی میں علامہ محمد بن احمد القرطبی المتوفی ۴۷۴ھ اس آیت پاک میں دئے گئے تینوں احکام کے بارے میں لکھتے ہیں۔

قال العلماً امر الله تعالى	علماء کہتے ہیں کہ پروردگار نے حضور پاک
نبیہ صلی الله علیہ وسلم	صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں جن اوامر
بهذه الا وامر التي هي بتدبیج	کا حکم دیا ہے ان میں اصولی بلاغت کے

مطابق تدریج ملحوظ ہے۔
بلیغ الم (تفسیر قرطبی ص ۲۳۹)

کہ سب سے پہلے یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان حضرات کی ان لغزشوں کو معاف فرمادیں جو ان سے حقوقی رسالت کی ادائیگی میں ہوئی ہیں۔ اس معافی کے بعد صاحابِ کرام کی شان میں اضافہ ہوا تو حکم دیا جا رہا ہے کہ حقوق خداوندی کی ادائیگی میں ہونے والی تقصیرات کے سلسلے میں استغفار فرمائیں، پھر جب یہ مقام بھی حاصل ہو گیا تو فرمایا جا رہا ہے کہ اب یہ معاملات میں مشورے کے اہل ہو گئے ہیں

وقت طبی ملخصہ ص ۲۳۹ ج ۳

قرطبی کی اس عبارت میں امر الله تعالى نبیہ صلی الله علیہ وسلم بهذہ الا وامر تبلارہا ہے کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو فاعف و استغفر اور شاورهم، صیغہ امر کے ذریعہ جو خطاب کیا گیا ہے اس سے مفترض و جوب کی طرف جا رہے ہیں۔

امام فخر الدین رازی المتوفی ۴۰۷ھ ان تینوں صیغوں کے بارے میں الگ الگ اس طرح رقمطراز ہیں، فاعف کے بارے میں لکھتے ہیں۔

(آپ ان کو معاف فرمائیجئے) اس

صیغہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

پر صحابہ کرام کو معاف فرمادیتا ذا جب دیکھا ہے

(فَاعْفُ عَنْهُمْ) ایجاد للعفو

علی الرسُولِ عَلَيْهِ السَّلَامُ

تفسیر کبیر مت ۴ ج ۵)

واستغفر پر لکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اعطا

کبائر کے بارے میں استغفار کا حکم دیا ہے

اور جب خدا طلب بیغفت کا حکم دے تو یہ درت

نہ ہو گا کہ قبول نہ فرمائے اسے کہا سا کرنا

کریم کے شایان شان نہیں ہے۔

امر لہ بالاستغفار لاصحاب

الکبائر و اذا امره بطلب المغفرة

لا يجوز ان لا يجيء اليه

لان ذلك لا يليق بالكريمة

ص ۶۸ ج ۵)

تیسراے صیغہ شاورہم کے بارے میں لکھتے ہیں۔

صیغہ امر کا ظاہر و جوب ہے، اسلئے باری

تعالیٰ کا قول و شاورہم و جوب کا

تقاضا کرتا ہے۔

ظاهر الامر للوجوب فقوله

(و شاورہم) یقتضی الوجوب

ص ۶۹ ج ۵)

امام فخر الدین رازی رحمہ اللہ نے تصریح فرمادی کہ ان امر کے صیغوں کا

تقاضا و جوب ہے اس لئے ان صیغوں کے ذریعہ جو حکم سر کار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم

کو دیا جا رہا ہے اس کا تقاضا و جوب ہونا چاہئے، اور ان احکام میں ایک حکم مشورہ کا بھی ہے

رسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمْ يَلْيَى مَشْوُرَهُ كَمْ تَقَاصِدُ

رمایہ کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اس کے اسباب۔

اور مقاصد کیا تھے ہی یعنی مشورہ گو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی ضروری قرار دیا گیا۔ لیکن آیا اس کا مقصد صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی دل جوئی اور عزت افزائی تھا، یا ان کے مشورہ کو کوئی اہمیت بھی حاصل تھی اور ان کی رائے کے مطابق عمل درآمد بھی کیا جاتا تھا؟ اس سلسلے میں مفسرین کرام نے نہایت تفصیلی گفتگو کی ہے، امام ابو بکر جعفر الصادق علیہ السلام اس آیت پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ جائز نہ ہو گا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دتے گئے مشورہ کے حکم کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ وہ محض دل جوئی اور صحابہ کی عزت افزائی کیلئے تھا اور یہ کہ مشورہ کا مقصد یہ تھا کہ امت ایسے معاملات میں اس سنت کی اقتدار کرے، اسلئے کہ اگر صحابہ کرام کو یہ معلوم ہو کہ وہ امور مشورہ طلب کا حکم معلوم کرنے میں جزو قوت استنباط صرف کریں گے اور یا فت طلب معاملات میں جو درست رائے قائم رہنے کی کوشش کریں گے وہ نہ عمل میں لاتی جائے گی اور نہ اس کو کسی درجہ میں قبول کیا جائے گا تو اس میں کسی طرح کی دل جوئی یا عزت افزائی نہیں ہے، بلکہ

وغير جائز ان يكون الا مرس بالمشاورة على جهة تطبيق نفوسهم ورفع اقدارهم ولتفتقدي الامنة به في مثله لانه لو كان معلوما عندهم انهم اذا استفرغوا هجهودهم في استنباط ما مشوروا فيه وصواب الرأي فيما سئلوا عنه ثم لم يكن ذلك عملا علىه ولا ملتقي منه بالقبول بوجه لم يكن في ذلك تطبيق نفوسهم ولا رفع لقدرهم بل فيه ايحا شهمر واعلامهم بيان آراءهم غير مقبولة

و لامعمول علیہا فہذ اتاویل

ساقط لامعنی اللہ

(احکام القرآن ص ۲۳ ج ۲)

بلکہ اس میں تو انھیں وحشت میں بستلا
کرنا ہے اور ان کو بدلانا ہے کہ ان

کی رائے نامقبول اور ناقابل عمل ہے اسلئے

آیت کے یہ سعینی قرار دینا درست نہیں۔

بَْنَرَبِّهِ بَلِكَفْ بِمُهْمَنْ

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جس مشورے کا حکم دیا گیا تھا وہ بڑائے نام نہیں تھا کہ امور مشورہ طلب میں، مشورہ دہندگان کو مشورہ کا مکلف بھی کیا جائے اور ان کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہ ہو، بلکہ امیر کو یہ اختیار دیدیا جائے کہ وہ اقلیت، اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو قبول کرنے کے مجاز ہوں، یہ کیونکہ ایسا کرنے میں اہل مشورہ کو وحشت میں بدلنا کرنا لازم آتا ہے۔

اس کا واضح مفہوم یہ ہوا کہ مشورہ کا مقصد یہ تھا کہ زیر غور مستلے کا شوری کے ذریعہ حل تلاش کیا جائے اور مشورہ میں جو بات منقح ہو کر سامنے آئے، اس کو قبول کرنے میں پس و پیش نہ کیا جائے، کیونکہ اس طریق کا میں رائے کی اہمیت باقی رہتی ہے اور اسی میں اہل شوری کی عزت افزائی اور دل جوئی کا مضمون پایا جاتا ہے۔

یہ بات صرف ابو بکر حصاص ہی نہیں، بلکہ شمس الائمه کے یہاں بھی موجود ہے، اور اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہے۔

قال شمس الائمه رحمہ اللہ، شمس الائمه رحمہ اللہ،

یہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ

و لامعنی لقول من یقول انما

سے مشورہ ان کی دل جوئی کے لئے کیا
کرتے تھے وہ بے معنی بات ہے، اسے
کہ جن امور میں آپ کے پاس وہی ہوتی
تھی ان میں مشورہ نہیں فرماتے تھے اور جن معاملات
میں مشورہ فرماتے تھے دو حالے ممال نہیں، ان کی برپا
عمل فرماتے تھے، یا عمل نہیں فرماتے
تھے، اگر عمل نہیں فرماتے تھے اور یہ بات
صحابہ کرامؓ میں کوئی معلوم تھی تو اس طرح کے
مشورے میں دل جوئی نہیں ہے بلکہ یہ تو استہزاء
کا ایک طریقہ ہوا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے بارے میں اس طرح کامگان کرنا
محال ہے

شمس الامر رحمہ اللہ نے بات بالکل واضح فرمادی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کے بارے میں یہ تصور کرنا کہ آپ کسی معاملہ میں مشورہ فرمائیں اور اس مشورہ کو
اہمیت نہ دیں، یہ بات ناممکن ہے، بلکہ یہ تو بدترین مذاق ہوا جس کی توقع
آپ کی ذات گرامی سے نہیں ہونی چاہئے۔
پھر آگے چل کر ارشاد فرماتے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ آپ کے مشورہ کا مقصد
مختلف پہلوؤں کو قریب لانا اور رائے کو

کان یستشیر ہم فی الاحکام
لتطییب قولہم لان فیما کان
الوھ ظاهر اعلوم ما کات
یستشیرم وفیما کان یستشیرم لایغلو
اما ان کان یعل براہم او لایعن فیان
کان لایعمل براہم و کان
ذالک معلوما لهم فلیس فی
هذہ الاستشارۃ تطییب
النفس بن ہی نوء من
الاستہزاء وظن ذالک
برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
محال۔ اکشف بزدؤن ص ۲۳ ج ۲)

ویتبین انه کان یستشیر ہم
لتفقیب الوجه و تحریر الرأی

علی ما کان یقول المشورة تلقع
بچھتہ کرنا ہوتا تھا جیسا کہ آپ فرماتے تھے
کہ مشورہ، انسانی عقولوں کو بار آور کرنے
کی کوشش کا نام ہے اور آپ فرماتے
کہ داشمندی یہ ہے کہ ذمی رائے سے مشورہ
تستشير ذاری ثم قطیعہ
(بحوال بالا ص ۲۱۱)

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اہل مشورہ
کو جمع کیا، مستدان کے سامنے پیش کیا اور پھر خصوصی اختیارات استعمال کر کے
جس رائے کو مناسب سمجھا اختیار کر لیا، کیونکہ ابو بکر حبص اس کے نقطہ نظر سے یہ
طریقہ کار، وحشت انگیز ہے اور شمس الامر کی تعبیر کے مطابق یہ ایک بدترین
مذاق ہے جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس سے امید نہیں
کی جاسکتی۔ بلکہ مشورہ کا طریقہ یہ ہے کہ ارباب مشورہ کی رائے کو پوری اہمیت
دی جائے اور مشورہ میں جو بات ٹے ہو جائے اس کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔

حضرور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورے کے مزید فائدے

مشورہ کا اصل فائدہ تو یہی تھا کہ زیر بحث مسئلہ کے تمام پہلوں کھڑ جاتے اور
جو بات اہل مشورہ کی رائے سے ٹے ہو جاتی اس پر عمل درآمد کیا جاتا۔ لیکن رسول کرم
صلی اللہ علیہ وسلم کے مشوروں میں اور جنی فوائد تھے، اس موضوع پر امام فخر الدین رازی
نے مفصل کلام کیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ حضرور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام سے مشورہ فرمانے میں صحابہ کرام کی

عزت افزائی ہوگی، درجات میں ترقی ہوگی اور اس طرح صحابہ کرام کی محبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ جائے گی وہ آپ کی فرماں برداری میں خلاص پیشہ ہو جائیں گے۔

۲۔ دوسری یہ کہ اگرچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عقل و دانش میں تمام انسانوں سے زیادہ باکام تھے۔ لیکن بہر حال مخلوق کے علوم محدود ہوتے ہیں اس لئے بعید نہیں ہے کہ کسی دوسرے انسان کے دل میں ایسی بات آجائے جو آپ کے دل میں نہ آئی ہو خصوصاً دنیوی معاملات میں ایسا ہو جانا ناممکن نہیں ہے خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ماتشاد رقوم الاصدرا لارشد امرهم یعنی جو لوگ بھی مشورہ کریں گے انھیں اپنے معاملات میں رشد و صواب کی رہنمائی منجانب اللہ کی جائے گی۔

۳۔ حسن اور سفیان بن عینہ کا ارشاد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا یہ حکم اس لئے دیا گیا تھا تاکہ امت اس سلسلے میں آپ کی اقتدار کے اور یہ مشورہ آپ کی امت کا طریقہ کار بن جائے۔

۴۔ چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے احمد کے معاملہ میں مشورہ فرمایا، صحابہ نے مدینہ طیبہ سے باہر نکلنے کا مشورہ دیا جبکہ خود آپ کامیلان مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کا تھا، لیکن جب آپ نے صحابہ کرام کے مشورہ کے مطابق مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کیا تو دوسری صورتِ حال سامنے آئی، اب اگر آپ صحابہ کرام سے مشورہ کرنا ترک فرمادیتے تو خیال ہو سکتا تھا کہ آپ کا دل بصابہ کرام کے مشورہ کے سبب بیش امده صورتِ حال سے متاثر ہے۔

اس لئے احمد کے واقعہ کے بعد پروردگار عالم نے حکم دیا کہ آپ ان صحابہ کرامے مشورہ فرمایا کریں تاکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ آپ کے دل پر اس واقعہ کا کوئی اثر باقی نہیں ہے

۵ - پانچویں مصلحت یہ ہے کہ آپ ان سے مشورہ فرمایا کریں، اس لئے نہیں کہ آپ کو ان کی رائے کی ضرورت ہے بلکہ ضرورت یہ ہے کہ خود ان حضرات کے عقل و شور، فہم و ادراک اور محبت و اخلاص کے پیمانے مقرر ہو جائیں اور آپ ان کے درجات کے مطابق ان کے ساتھ پیش آیا کریں

۶ - چھٹی بات یہ کہ مشورہ کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا کہ آپ کو اس کی ضرورت ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب آپ مشورہ فرمائیں گے تو تمام حضرات مشورہ طلب معاملہ میں بہتر صورت تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور اس طرح بہتر طریق کارکی تلاش میں ایک ایسا روحانی توافق حاصل ہو جائے گا۔ جس سے مقصد تک رسائی میں سہولت ہو گی۔

۷ - ساتویں مصلحت یہ کہ جب پروردگار عالم نے پیغمبر علیہ السلام کو ان حضرات سے مشورہ کا حکم دیا تو اس سے واضح ہوا کہ ان بزرگوں کی خدا کے یہاں بھی قدر و منزلت ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں بھی عزت کا مقام حاصل ہے اور دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی قدر و قیمت ہے۔

۸ - آٹھویں مصلحت یہ ہے کہ شاہوں کے یہاں بھی مشورہ مہمات امور میں صرف خصوصی مقریبین سے کیا جاتا ہے، صحابہ کرام سے لغزش ہو لی اور انہیں اللہ نے معاف بھی فرمادیا، لیکن یہ خیال گذر سکتا تھا کہ معاف تو پروردگار نے

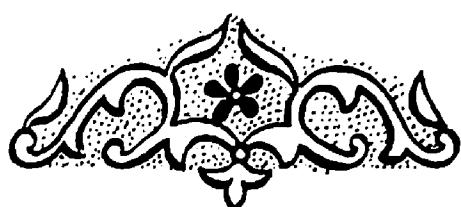
کر دیا ہے۔ لیکن اس لغزش کے سبب، اب وہ مقام حاصل نہیں ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے مشورہ کا حکم دے کر یہ واضح فرمایا کہ وہ مقام حاصل ہی نہیں بلکہ غلطی کے بعد تو پہ کے سبب پروردگار نے درجات میں ترقی عطا فرمادی ہے کہ پہلے پیغمبر علیہ السلام کو مشورہ کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اب مشورہ کا حکم دیا جائے۔ (خلاصہ تفسیر کبیر جلد ۵ ص ۷۸)

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو صحابہ کرام سے مشورہ کا جو حکم دیا گیا ہے اس میں بہت سی مصلحتیں ہیں اور اس کا منتصف صحابہ کرام کی دل جوئی و عزت افزائی ہی نہیں ہے بلکہ جس سلسلے میں وحی نازل نہ ہوئی ہو اس میں ارباب حل و عقد صحابہ کرام کی رائے سے صحیح راستے کا تعین ہے اور اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم ٹری تاکید کے ساتھ دیا گیا ہے اور اسی لئے مشورہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ارباب حل و عقد کو جمع کر کے پیش آمدہ مسئلے میں ان کی رائے لی جائے اور اختلاف رائے کی صورت میں امیر کو اختیار دیدیا جائے کہ وہ اکثریت و اقلیت میں سے جس رائے کو مناسب بحث قبول کر لے یا اپنی ہی رائے پر عمل کر لے۔ بلکہ امام ابو بکر جصاص تو اس طرح کے مشورے کو وحشت کا سبب قرار دیتے ہیں۔ اور تم الامت کے الفاظ میں اس طرح کا مشورہ، مشورہ ہی نہیں بلکہ استہزار کا وہ طریقہ ہے جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے توقع نہیں کی جاسکتی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاورہم کے ذریعہ مشورہ کا جو حکم دیا گیا ہے وہ بہت تاکیدی حکم ہے، یہ مشورہ ان تمام معاملات

یہ ہے جن کے بارے میں وحی نازل نہیں ہوئی، اس تاکیدی حکم کے بارے میں علماء کرام نے وجوب تک کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے اور مشورہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو اہمیت نہ دی جائے اور آپ جس جانب کو مناسب سمجھیں اختیار فرمائیں، بلکہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو پوری اہمیت حاصل ہے۔

ان تصریحات کے علی الرعنم، اہل مشورہ کی رائے کو اہمیت نہ دینے والوں نے عجیب و غریب استدلال کیا ہے کہ شادا و حمد کے بعد عزمت فرمایا گیا ہے، مشورہ کے بعد عزم کا حاصل یہ ہوا کہ امیر مشورہ کے بعد، عزم کی منزل میں قدم رکھتے وقت آزاد ہے کہ جس جانب کو چاہے ترجیح دیدے کیونکہ عزم کو صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا گیا ہے، اس لئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عزم کے معنی پر غور کر لیا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا منقول ہے، علماء امت نے اس کے کیا معنی متعین کئے ہیں، اور مشورہ کی اہمیت سے گریز کرنے والوں کے استدلال میں کتنا وزن ہے؟



عزم کے معنی حدیث میں

شادر ہو میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا۔ آپ نے اپنی شان کے مطابق اس حکم خداوندی کی اس طرح تعییل فرمائی کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مشورہ کا عادی نہیں پایا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے والا نہیں دیکھتا۔ رادی تمام ثقہ ہیں مگر روایت منقطع ہے۔

(جواحیف کے یہاں جوت ہے راقم)

یہی مشتمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے۔

بغوی نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عائشہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے کسی بھی انسان کو دوسرے حضرات سے مشورہ کرنے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ پابندیں پایا

دفی حدیث ابی هریرۃ: مارأیت احد الکثر مشورۃ لاصحابہ من النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجال ثقات الابناء منقطع (فتح المبارک ج ۲ ص ۲۳۳)

روی البغوی بسندہ عن عائشة قالت مارأیت رجلا احتراس تزرا للرجال من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (تفہیر مظہری ج ۱ ص ۲۶۷)

معلوم ہوا کہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر مشورہ کا بہت اہتمام

فرمایا جس کی حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عالیہ رضی اللہ عنہما نے ان الفاظ میں شہادت دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کا پابندان کے علم میں کوئی نہیں ہے۔

اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آپ مشورہ فرماتے رہے لیکن مشورہ دینے والوں کی رائے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں تھی، آپ جس جانب کو چاہتے اختیار فرمایتے، مگر ایسا ہرگز نہیں ہوا جیسا کہ شمس الائمه کے حوالے سے یہ بات گذر چکی ہے کہ اس طرح کام مشورہ مشورہ ہی نہیں بلکہ استہزا کا وہ طریقہ ہو گا جس کی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے توقع نہیں ہوئی چاہئے۔

لیکن استہزا کی اسی قسم کو مشورہ کہنے والوں کا استدلال یہ ہے کہ شادر ہم کے بعد فاذاعزمت فرمایا جا رہا ہے، عزموا نہیں فرمایا جا رہا ہے عنمت کی نسبت صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب یہ بتلا رہی ہے کہ عزم صرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے مشورہ دینے والوں کا نہیں۔ گویا یہ عزم مشورہ کا پابند نہیں، مشورہ کے بعد آزاد ہو کر تنہایہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کام ہے، پھر اس نقطہ نظر کے دلکار نے یہ کمال کیا ہے کہ عزم کے ان طبع زاد معانی کو صفرہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ خاص نہیں کیا بلکہ اس میازی شان میں امیر المؤمنین ہی نہیں ماتحت امر اتنک کوشال کر دیا کہ ہر امیر کو تمام حالات میں یہ حق ہے کہ مشورے کے استحباب یا سُنّت پر عمل کرنے کے بعد، عزم کے معاملہ میں با اختیار اور آزاد ہے۔

اب ہمیں یہ جائزہ لینا ہے کہ عزم کے معنی پیغمبر علیہ السلام نے کیا منقول

بیس، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کیا رہا ہے، علماء تفسیر نے کیا فرمایا ہے؟ اور اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں اس کو سلیم بھی کریما بنائے تو کیا دیگر امر اس کے بارے میں عزم کے یعنی مراد یعنی کی گنجائش ہے۔

علماء تفسیر کے نزدیک یہ ایک طریقہ حقیقت ہے اور ہونی بھی چاہئے کہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ قابل اعتدال تفسیر وہ ہے جو خود قرآن کریم سے کی جائے یا خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہو، عزم کے یہ مذکورہ بالمعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ صرف یہ کہ منقول نہیں بلکہ اسکے بالکل برخلاف ایک دوسرے معنی منقول ہیں۔

حضرت علیؑ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا عزم کے معنی یہیں اہل رائے سے مشورہ کرنا پھر ان کا اتباع کرنا۔

عن علی قال سئیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العزم
نقائش مشاورۃ اہل الرائی ثم اتباعهم

(ابن حثیر ۲۷۷)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم کے معنی کی وضاحت میں اپنے یا کسی نیز کے بارے میں یہ ارشاد نہیں فرماتا ہے، میں کہ مشورہ دینے والوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہئے کہ وہ مشورہ دینے کے بعد معاملہ کو امیر کی رائے پر مخول کر دیں وہ جائز کو مناسب تصور فرمائیں گے اختیار کر لیں گے، بلکہ آپ اسکے بالکل برخلاف یہ فرماتے ہیں کہ مشورہ دینے والوں کی رائے کو پوری اہمیت حاصل ہے، ایت پاک میں مذکور عزم تنہ امیر کا نہیں ہے، یہ عزم ارباب شوریٰ کے مشورہ کا پابند ہے

کیونکہ عزم کے معنی ہیں اہل رائے سے مشورہ لینا پھر اس کا اتباع کرنا، خود گویا آپ اپنے بارے میں فرار ہے ہیں کہ جس معاملہ میں مشورہ کیا جائیگا اس میں اہل مشورہ کی رائے قبول کی جائے گی، خصوصی اور انفرادی رائے کے مطابق عزم و نفاذ کی آپ نے کہیں بھی اجازت نہیں دی، اور یہ مضمون تو آپ سے ثابت ہی نہیں ہے کہ مشورہ کرنے کے بعد سلطان یا دیگر امرا کو اختیار نہیں فی بلکہ اختیار تام حاصل ہے کہ وہ خواہ اکثریت کی رائے قبول کر لیں کہیں خواہ اقلیت کی بلکہ اقلیت د اکثریت کی رائے سے بے نیاز ہو کر وہ اپنی رائے بھی نافذ کر سکتے ہیں۔ اہل مشورہ طلب ہیں انفرادی رائے نافذ کرنے کے سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام کوہہ بالا رشاد نص کا درجہ رکھتا ہے، لیکن اس کے علاوہ بھی آپ کے اشارات اس سلسلے میں موجود ہیں: *مجمع الزوائد باب الاجماع میں ہے۔*

ابن عباس سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا رسول اللہ! اگر کوئی ایسا معاملہ ہمارے سامنے آئے جس میں قرآن کا حکم نازل نہ ہو اب تو اور نہ اس میں آپ کی سنت موجود ہو، آپ نے فرمایا کہ ایسے معاملے میں اہل ایمان میں سے عبادت گزاروں کی شوریٰ سے معاملہ طے کرو اور خصوصی وال انفرادی رائے سے فیصلہ مت کرو۔ (اطبرانی) مگر اس

و عن ابن عباس قال قدلت يا رسول الله ان عرض لنا امر لم ينزل فيه قرآن ولو تمض فيه سنة منك قال تجعلونه شوري بين العابدين من المؤمنين ولا تقضونه برأي خاصة (رسول الطبراني في الكبير) وفيه عبد الله بن كيسان قال البخاري منكر الحديث

روایت میں عبداللہ بن کیسان ہیں جسکے
باقیں ہم بخاری نے منکر الحدیث ہونے کا قول کیا ہے

حضرت عبداللہ بن عباس کی اس روایت میں تو عبداللہ بن کیسان تھے
جن کا اعتماد محروم ہے، لیکن اسی طرح کی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ سے
بھی منقول ہے۔

حضرت علی سے روایت ہے کہ میں نے
عرض کیا یا رسول اللہ! اگر ہمارے
سامنے ایسا معاملہ آئے جس میں امر
اور نہیں کی وضاحت نہ ہو تو اپنے ہمیں
کیا حکم دیتے ہیں؟ ارشاد فرمایا کہ اس
معاملہ میں اہل فقہ اور عبادت گزاروں
سے مشورہ کرو اور اس میں خصوصی انفرادی
رائے نافذت کرو (طبرانی فی الاوسط،
تمام راوی ثقہ اور صحیح کے درجہ کے ہیں)

وعن علی قال قلت پا
رسول الله! ان نزل بنا امر
لیس فيه بيان امر ولا نهی
فمات أمرني. قال شاؤروا
فيه الفقهاء والعابدين
وكاتمضا فيهم رأى خاصة
رواية الطبراني في الاوسط
درجاته موثقون من
أهل الصحیح۔

ان روایات سے یہ بات بالکل منقطع ہو جاتی ہے کہ مشورہ طلب غیر منصوص
مسائل میں اکثریت کے مقابل ایک دوآدمی کی رائے کے مطابق فیصلہ نہیں کیا
جاسکتا، اہل مشورہ کا اگر کسی معاملہ میں اتفاق رائے ہو جائے تو اس اتفاقی رائے
کا اتفاق اور اس کے مطابق عزم کرنا ضروری ہے، اور اگر اختلاف رائے کی نوبت
آئے تو جس جانب فقہاء و عابدين کی عام رائے یعنی اکثریت ہو اس کے مطابق

عزم کرنا ضروری ہے۔

عزم کے بارے میں علماء تفسیر کے ارشادات

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول عزم کی تفسیر اور مندرجہ بالا روایات کے بعد اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ قابل اعتماد مفسرین کے ارشادات پر بھی نظر کر لی جائے کہ وہ اس سلسلے میں کیا فرماتے ہیں اس سلسلے میں چند مفسرین کے آواں نقل کئے جاتے ہیں۔

— امام ابو بکر جصاص المتوفی شمسہ لکھتے ہیں۔

دفی ذکر الغزیمة عقیب المشورة دلالة عزم کا شادر ہم کے بعد ذکر فرماناد لالات
کرتا ہے کہ یہ عزم مشورہ سے پیدا ہوا ہے
علی انها صدرت عن المشورة۔

(احکام القرآن ۲۲)

امام ابو بکر جصاص کی عبارت کا صریح مفہوم یہ ہے کہ عزم مشورے کا پابند ہے مشورہ کرنے والے کو یہ آزادی نہیں ہے کہ وہ اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی چیز کو قبول کر لے کیونکہ وہ صدرت عن المشورة کے الفاظ لکھ رہے ہیں جب کر لغت کی کتابوں میں صدر الشی عن غیرہ ای نشأ ترجمہ تبلیا گیا ہے، یعنی صدر الشی عن غیرہ کے معنی یہ ہے کہ یہ چیز دوسری چیز سے پیدا ہوئی ہو اس کا مفہوم یہی ہوا کہ عزم اگر مشورہ کے بطن سے پیدا ہوا ہے تو اسے مشورہ کا تابع اور مشورہ کا پابند ہونا چاہتے۔

اوّل اگر لغت صدر کے معنی اصلی پر غور کر لیا جائے تو مضمون اور زیادہ صاف

بوجاتا ہے۔ اس نئے کہ جس طرح صدر الشی عن غیرہ کے معنی نشأ کے میں وہیں صدر کا ایک اور استعمال ہے، یہ ہے صدرت الماشیة عن الماء جانوروں کا پانی پر کر گھاث سے لوٹنا، اس لغوی معنی کے اعتبار سے صدرت الغزیۃ عن المشورة کے معنی یہ ہوں گے کہ عزمیت کو پیاسے جانور سے تشبیہ دی گئی ہے بچہ مشبہ ہے یعنی جانور کو حذف کر کے اس کا لازم یعنی صدرت استعارہ مکنیہ کے طور پر عزمیت کے لئے ثابت کیا گیا ہے، گویا عزمیت وہ پیاس رکھنے والی ذات ہے جو مشورہ کے گھاث سے پانی پی کر لوٹ رہی ہے اور اس کو مشورہ سے الگ رکھنا اس کو پیاسا چھوڑ دینا ہے۔

امام فخر الدین رازی تفسیر بکیر میں لکھتے ہیں۔

عزم کے معنی یہ ہیں کہ جب وہ رائے	المعنى انه اذا حصل الرأى للتأكيد.
حاصل ہو جائے جو مشورہ کے ذریعہ پختہ	المشورة فلما حجب ان يقع الاعتداد
ہوئی ہے تو اب اعتماد اس رائے پوہیں	عليه بل يحبث ان يكون الاعتماد على
بلکہ اعتماد اللہ کی مدد، اللہ کی پدایت	اعانة الله وتسديدة وعصمته
اور اللہ کی عصمت پر ہونا چاہئے۔	تفیر خبر صہیجہ۔

امام رازی نے بھی یہ فرمایا کہ یہ عزم آزاد نہیں ہے، عزم کے معنی ہی اس رائے کے ہیں جو مشوریٰ سے ہوئی ہے اور جب یہ رائے قائم ہو جائے تو اب رائے پر اعتماد کر کے نہیں بلکہ فدرا توہنی کر کے اقدام کرنا چاہیے، امام رازی نے اس عبارت میں عزم کے معنی بھی بیان فرمائے، اور یہ بھی واضح فرمایا کہ فاذا عزمت کامقصداً مل، عزم کو آزاد قرار دینا، یا عزم کے بارے میں کسی طرح کی رہنمائی نہیں

ہے، بلکہ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ رائے کتنی بھی منفع ہو لیکن ہر حال میں توکل اور اعتقاد صرف باری تعالیٰ کی ذات پر ہونا چاہئے، مشورہ سے آزاد ہو کر کسی ایک جانب کو ترجیح دینے کا مضمون بالکل زائد بات ہے۔

(۲) — قاضی بیضاوی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

غرضت کے معنی ہیں کہ جب آپ مشورہ	فاذاعزمت ای فاذاد طنت نفسك
کے بعد اپنی طبیعت کو کسی موقف پر	علی شمی بعد الشوری۔
مضبوط و مطمئن کریں۔	(تفسیر بیضاوی پڑی)

بنظاہر علم ہوتا ہے کہ مشورہ کے بعد، کسی موقف پر اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے عمل میں قاضی بیضاوی کا رجحان یہ ہے کہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ہے اور نیسا ہوتا اس میں مصالحتہ نہیں کیونکہ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو گی، لیکن بیضاوی کی اس عبارت کی تشرعی میں ان کے شارح شیخ زادہ نے یہ لکھا ہے۔

اذاعزمت کے معنی یہ ہیں کہ جب آپ	فاذاعزمت ای اذا اردت
اس چیز کے نفاذ کا ارادہ کریں جس کا	امضاء معاشر و ابہ
لوگوں نے آپ کو مشورہ دیا ہے اور	علیک و قد و طنت
آپ نے اپنی طبیعت کو اس کے مطابق	نفسك علیہ۔
مطمئن فرمایا ہے۔	(شیخزادہ آل علیان)

معلوم ہوا کہ عزم مشورہ سے الگ نہیں ہے، بلکہ مشورہ میں طے شد بات کی تنفیذ کا پختہ ارادہ عزم ہے۔

شیخ زادہ کی اس تشریع کے علاوہ خود بیضادی۔ امر ہو شوری بینہم

کے تحت لکھتے ہیں۔

امر ہم شوری کے معنی، امر ہم ذو شوری

ذو شوری بیشنہر

ہیں، یعنی دورائے میں انفرادی حیثیت

ذو شوری لا ینضر دون برای

اختیار نہیں کرتے حتیٰ کہ مشورہ کرتے

حتیٰ ینشاوردا و یجتمعوا علیه

ہیں اور آتفاق رات سے طے رتے ہیں

(بیضادی ۲۶۶)

شیخ زادہ کی تشریع، اور خود امر ہم شوری کے تحت بیضادی کی تشریف

سے واضح ہوا کہ "عزم" کے تحت دی گئی عبارت میں جوابہام تھا اس کا تعلق

اس شخصوں سے نہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم کے بارے میں مشوفے

آزاد اور بنے نیارہ بہ بلکہ اس کا مفہوم قاضی کی دوسری تشریف اور شیخ زادہ کی

عبارت سے رستین ہوا کہ مشودہ ہیں جو بات طے ہو جائے اسکی کی تغییر کا پختہ ارادہ

عزم۔ کہلاتا ہے

(۲) — ابو حیان اندلسی المتنی ۵۲، اپنی مشہور تفسیر البحر الحیط

میں لکھتے ہیں۔

یعنی جب آپ مشورہ کے بعد کسی چیز پر

ای فاذا عقدت قبلت

اپنے دل کو منبسط کر لیں تو اس سے

علی امر بعف الاستشارة

میں اپنے آپ کو خدا کے سپرد فرادیں

فاجعل تغییضك الی الله

کیونکہ خدا ہی آپ کے معاالم میں بہتر اور

فانہ العالم بالاصنة

خوب ترجیز کا جانتے والا ہے۔ مشورہ

والا رسشد لا مرک لا یعلمہ

دینے والا اس کو نہیں بانتا، یہ آیت
مشورہ کی اہمیت کی دلیل ہے، اور
مشورہ کے ذریعہ رائے کو پختہ کرنے
منع کرنے اور غور و فکر کرنے کی دلیل
بے اور اس سے یہ بات ثابت ہے کہ
مشورہ شرعاً مطلوب ہے، بلکہ ان بعض
اہل عبّر کے توبابھی مشورہ نہیں
کرتے تھے اور اپنی الفردی رائے پر
فی عاقبة (البخاری حیطہ ۹۹) انجام سے بے پرواہ کو عمل کرتے تھے۔
ابو حیان نے یہ فرمایا کہ باہم مشورہ نہ کرنا، یا مشورے کے باوجود اپنی رائے
کے نفاذ پر اصرار کرنا ان بعض اہل عبّر کا طریقہ ہے جن کے خلاف قرآن کریم
میں یہ ہدایت کی جا رہی ہے کہ مشورہ ضرور کیا جائے کہ اس سے رائے پختہ اور منع
ہو جاتی ہے اور جو حیر شرعاً مطلوب ہے اس کی تعییں ہو جاتی ہے۔
ابو حیان کی عبارت سے مشورے کی تاکید، مشورہ نہ کرنے یا بعض اپنی
رائے پر اصرار کرنے کی مذمت اور ان کی عبارت کے ابتدائی جملے اذاعقدت
قبلت علی امر بعد لاستشارة اور دیگر مصادر میں سے عزم کے مشورے کے تابع
ہونے کا مضمون ظاہر ہوتا ہے۔

(۵) — ابن کثیر جنہوں نے عزم کے معنی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
سے برداشت حضرت علی رضی اللہ عنہ مشاورہ اہل الراء (ثوابنا علیہ) بیان کئے ہیں

کر پہلے یعنی اوپر مرحوم میں اہل الرائے سے مشورہ لینا، پھر ان کی رائے کے مطابق
چنان عزم ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

یعنی جب آپ کسی معاملہ میں مشورہ
ای اذ اشادر تھوڑی الامر
فرمایں اور اس پر عزم کر لیں تو اس پر
وعزمت علیہ فتوح علی اللہ فیہ
توکل کر کے اقدام فرمائیں۔
(ابن کثیر ص ۲۲۶)

اس عبارت میں عزمت علیہ میں علیہ کی ضمیر امر کی طرف لوٹ رہی ہے
اور یہ امر وہ ہے جو مشورے کے ذریعے طے کیا گیا ہے، اس لئے اس عبارت کا مفہوم بھی
یہی ہو گا کہ عزم مشورے سے الگ اور آزاد نہیں ہے بلکہ عزم کو مشورہ کا ماحت
اور پابند ہونا چاہیے۔

۶) — روح المعانی میں ہے۔

یعنی جب آپ مشورہ کے بعد کسی کام اور
ای اذ اعقدت قلبك علی الفعل
اس کی تنقید کیتے دل کو منبوط فرمائیں
رمضانہ بعد المختارۃ کا
تو ذن بہ الفاء۔
(رد المحتار ص ۱۰۴)

اس عبارت کا مدعایہ ہے کہ شادر ہو اور فاذ اعزمت کے درمیان کلمہ فا کا لانا اس مضمون پر دلالت کرتا ہے
کو لایا گیا ہے، اور فاتحیقیب من الوصل یعنی ایک کام کے دوسرے کام کے فوراً بعد
آنے پر دلالت کرتی ہے، اس لئے معلوم ہوا کہ عزم کی منزل مشورے سے دور نہیں بلکہ
جس مجلس میں مشورہ ہو رہا ہے وہیں متصل اعزم بھی ہو جانا چاہیے، اس مضمون کا خلاصہ
بھی یہی ہوا کہ عزم مشورے سے آزاد نہیں بلکہ مشورہ کا تابع ہے۔

(۴) علامہ طنطاوی جو ہری اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے مشورہ کیا کہ مدینہ سے باہر نکل کر دشمن کا مقابلہ کریں یا مدینہ میں مقیم رہ کر دشمن کا انتظار کریں، خواب کی تعبیر مدینہ میں قیام کرنے کا رحمان پیدا کرتی تھی، لیکن آپ نے اکثر صحابہ کی رائے مدینہ سے باہر نکلنے کی دیکھی تو اکثریت کی بات مان لی اور معاملہ میں فیصلہ فرمایا، پھر جب آپ نے اپنی زرد پہن لی اور عزم فرمایا تو صحابہ نے اپنی رائے سے ہٹنا چاہا اور آپ نے ان سے انکار فرمادیا۔

استشارة صلی اللہ علیہ وسلم اصحابہ
یخرجون من المدينة فیلاقوں
العدو امینتظرونہ دعائی
تاویل الروایا ادعی للبقاء
بالمدينة فلماری اکثر اصحابہ
امیل الی الخروج من المدينة
اطاع الاغلبیة وحسم
بامرھو فی القضیة فلمان
لبس کامته و عن عزم الامرا دادوا
عنہ عدو لا، فقال لهم لا.

(تفیر الجواہر للطنطاوی)

علامہ طنطاوی رحمۃ اللہ نے اس عبارت میں مشورہ، فیصلہ اور عزم کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ میں علی تفسیر پیش کی ہے کہ غزوہ احمد کے موقع پر مشورہ طلب معاملہ یہ تھا کہ مدینہ میں رہ کر دشمن کا انتظار کیا جائے یا مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی تھی۔ لیکن جب آپ نے اکثریت کی رائے مدینہ سے باہر مدینہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، تو اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمایا، اس فیصلہ کے مطابق زرد پہن کر جب عزم فرمایا تو صحابہ نے اپنی رائے واپس لینا چاہی، مگر عزم کے بعد آپ نے

درخواست قبول نہیں فرمائی۔

معلوم ہوا کہ عزم مشورہ سے آزاد نہیں ہے، مشورہ کے تابع ہے، کیونکہ مشورہ میں اکثریت کی رائے معلوم کر کے جو فیصلہ کیا گیا اسی کے نفاذ کو عزم فرمایا گیا ہے اور آپ کی زندگی کی عملی تفسیر میں عزم جب مشورہ اور اکثریت کا پابند ہے تو دوسرے حضرات کو یہاں بدرجہ اولی عزم کو مشورہ کا پابند رہنا چاہئے۔

(۸) — ان ہاؤوالوں سے عزم کے جو عنیٰ ثابت ہوئے اسی کو عمدۃ المفرک حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔

مشادرت کے بعد جب ایک بات طے ہو جائے اور سچتہ ارادہ کر لیا جائے تو پھر خدا پر توکل کر کے اس کو بلا پس و پیش کر گزرے۔

(فوائد عثمانی بر ترجیح شیخ الہند م)

(۹) — ان تفاسیر کے علاوہ اس موصوع پر محدثین کرام جب گفتگو فرماتے ہیں تو وہ بھی عزم کو شوریٰ کا پابند کہتے ہیں۔ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے یہاں صرف علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی ایک عبارت پیش کی جا رہی ہے، لکھتے ہیں۔

یرید انہ صلی اللہ علیہ وسلم	مراد یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
بعد المشورة اذا اعزز مدعا	مشورے کے بعد جب کسی لیے کام کے
فعل امر مسمى و تعت علىه	کرنے کا عزم فرمائیں جو مشورہ میں طے نہوا
المشورة و شرع فيه لم يسكن	تھا اور اس کو شروع فرمادیں تو اب کسی
ل احد بعد ذلك ان	کے لئے اس کے خلاف مشورہ دینے کی
بشير عليه بخلافه نور و د	اجازت نہیں ہے کیونکہ سورہ حجrat کی

النهی عن التقدم بین يدی
الله و رسوله فی آیة الحجرات
آیت لانقد مو الایہ میں اللہ اور را کے
رسول کے سامنے پیش قدمی سے
مانعت آجکی ہے۔
(فتاویٰ الباری ۲۸۶)

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے بالکل وضاحت سے رقم فرمادیا ہے کہ عزم
مشورہ سے آزاد نہیں ہے بلکہ اسی چیز کا ہونا چاہئے جو مشورہ میں ملے ہوئی ہو۔
کیونکہ وہ عز و علی فعل امر مماؤتقت علیہ المشورۃ (یعنی جب آپ وہ کام
کرنے کا ارادہ فرمائیں جو مشورہ میں ملے ہوا ہے) فرار ہے میں، پھر یہ بھی خاص طور
پر بخوبی رہے کہ علامہ ابن حجر اس عزم کو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے بیان
فرار ہے میں کیونکہ وہ اس کے ساتھ یہ بھی لکھ رہے ہیں کہ اس طرح کے عزم کے
بعد اس کے خلاف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کچھ عرض کرنا بجا نہیں
کیونکہ سورہ حجرات کی آیت میں اللہ اور رسول کے رو برو پیش قدمی سے منع کر دیا
گیا ہے، اور مشورہ میں ملے شدہ کام کے عزم کے بعد عرض معروف پیش قدمی شمار ہو گا۔
ان معروفات کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پروردگار
عالم کی جانب سے حکم دیا گیا کہ آپ صحابہ کرام سے مشورہ فرمایا کریں، حضور پاک فضیل
الله علیہ وسلم نے اس حکم کی اس قدر تعمیل فرمائی کہ حضرت عائشہ اور حضرت ابو ہریرہ
کے بیان کے مطابق آپ سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی دوسرا ان کے علم میں نہیں
ہے متعدد مفسرین کو اہنے لفظ شادر ہو کے صیغہ امر کو وجوب پر محmol فرمایا
ہے، صحابہ نے آپ سے ان معاملات کے بارے میں سوال کیا جس میں قرآن و سنت
کا حکم معلوم نہ ہو تو آپ نے ایسے معاملات میں مشورہ کا حکم دیا اور یہ وضاحت فرمادی

کے انفرادی رائے کے مطابق فیصلہ ذکر ہا، آیت قرآنی میں جو فاذا عزمت کا لفظ آیا اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تھا کہ عزم کے کیا معنی ہیں تو آپ نے فرمایا کہ اب رائے سے مشورہ کرنا اور ان کی رائے کے مطابق عمل کرنا عزم کہلاتا ہے، عام مفسرین نے شاد مر ہم کے بعد عزمت کے ذکر سے یہ سمجھا کہ عزم آزاد نہیں بلکہ مشورہ کا پابند ہے۔ لیکن ان تمام تصریحات کے علی ارغم صرف حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نہیں بلکہ دنیا کے ہر پلا دست اور ما تحت امیر کے لئے یہ کہنا کہ وہ مشورہ کے استحباب پر عمل کرنے کے بعد، عزم کے مرحلہ میں داخل ہو تو اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو قبول کرنے کا مجاز ہے، یہ ایک ایسا نقطہ نظر ہے جس کا مقصود ہے کہ یہاں کوئی قائل نہیں۔

اصول فقہ کی روشنی میں

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورے کے حکم متعلق مندرجہ بالا تفصیلات، تفاسیر قرآن یا حدیث پاک اور اس کی شروح سے نقل کی گئی ہیں، اسکے ساتھ یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصول فقہ کی روشنی میں ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ زیر بحث آیت کے مختلف اجزاء سے جن مضمون پر استدلال کیا گیا ہے ان کا اصول فقہ کی اصطلاح میں کیا نام اور کیا درجہ ہے اور کس مضمون کے لئے کیا جانے والا استدلال درست ہے اور کس مضمون پر استدلال اصول فقہ کی روشنی میں درست نہیں ہے، آیت پاک سے جو مضمون ثابت کئے

جار ہے میں ان کی تفصیل یہ ہے کہ شادر ہو سے مندرجہ ذیل دو باتیں ثابت کی جا رہی ہیں۔

۱۔ شادر ہم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا ہے اور یہ حکم و جو布 یا سینت کے درجہ میں ثابت ہے۔

۲۔ امت کے دیگر افراد یعنی سلاطین و امراء کے لئے بھی مشورہ کا حکم اسی آیت سے ثابت ہے۔

اسی طرح دوسرے جزو فاذاعزمه سے بھی مندرجہ ذیل دو باتیں ثابت کی جا رہی ہیں۔

۳۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عزم فرمائیں تو امت کے کسی فرد کا مشورہ اپ کے عزم کے بعد قابل قبول نہیں۔

۴۔ امت کے دیگر افراد یعنی امراء و سلاطین بھی عزم قائم کرنے میں آزاد ہیں، کہ مشورہ کے بعد وہ اقلیت، اکثریت یا اپنی ذاتی رائے میں سے کسی بھی جانب کو ترجیح دیکر اس سے عزم متعلق کر سکتے ہیں۔

اب ہمیں ان چاروں مصائب کے بارے میں غور کرنا ہے کہ حنفیہ نے قرآن ہمی کیلئے جو اصول مقرر کئے ہیں، ان میں کون سا مضمون کس طرز استدلال سے ثابت ہے۔ اس جائزے کیلئے ضروری ہے کہ تم پہلے حنفیہ کے طرز استدلال کا خلاصہ پیش کر دیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں متقدمین و متاخرین کی عربی کتابوں کے بجائے عصر قریب کے مشہور اصولی مفسر حضرت مولانا فتح محمد تابع لکھنؤی کے الاحسان فی علوم القرآن کے اقتباسات پیش کر دئے جائیں موصوف

ان استدلالات کے بارے میں لکھتے ہیں۔

لفظ و عبارت سے معانی و مراد قرار دینے کے متعدد طریقے شعراً اور اہل زبان کے یہاں معتبر اور مستعمل ہیں، مگر علماء نے صرف وہی چار طریقے اختحاب کر لئے ہیں جن سے یقین ہو سکے کہ کلام کی یہی مراد ہے اور دوسرے طرق جو مفید یقین نہیں تھے ترک کر دیئے ہیں۔
چند لائنوں کے بعد لکھتے ہیں۔

پھر وہ طرق معمده علماء حنفیہ کے نزدیک چار ہیں، اسلئے کہ متكلّم جو کلام کرتا ہے اس سے ایک مقصود اس کا ضرور رہتا ہے اور وہ اقویٰ اور تم بے کل سے اور اسے عبارۃ النصلہ کہتے ہیں، یعنی وہ معانی جن لئے کلام جاری کیا گیا ہوا درسیاق سے ثابت ہوتا ہے۔

اور اگر صرف کلمات اپنے معنی لغویہ یا مراد متعارف فی الوازم سے ایک امر بتائیں مگر اس معنی کے لئے کلام مسوق ہو اور زمخالف مقصود متكلّم، درسیاق کلام کے ہوں تو یہ اشارۃ النصلہ ہے۔ اور اگر مراد ترجمہ لغوی سے سمجھی جائے مگر زاس طرح کردہ عین ترجمہ لغت ہو بلکہ ترجمہ سے بطریقی اولیٰ مفہوم ہو سکے تو اس دلالة النصلہ کہتے ہیں اور اگر اسیں بات کہی جائے جس کا صحیح ہونا عقلائی ایشروا ایک اور امر کے مان لینے پر

لہ اس جگہ نہ سے مراد کلام ہے۔
تے یہاں یہ وساحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ وہ بات جس کیلئے کلام لایا گیا ہے کبھی اصالۃ مقصود ہوتا ہے اور کبھی تبعاً کچھ علماء اصول، نے دونوں کو عبارۃ النصلہ قرار دیا ہے، جیسا کہ اصول نقہ کی متعدد کتابوں میں ماسیق الکلام لہ اصالۃ اور تبعاً کی تشریع موجود ہے، اور کچھ علماء اصول ماسیق الکلام را اصالۃ کو عبارۃ النصلہ کہتے ہیں، تبعاً کو انہوں نے اشارۃ النصلہ قرار دیا ہے ہماری اس بحث میں دوسرے نقطہ نظر کے مطابق کلام کیا گیا ہے۔

موقوف ہوتا اس دو سکے امر کو اقتضاء النص کہیں گے۔

(الاحسان فی علوم القرآن ص ۲۷ ملخص)

اس کے بعد حضرت مولانا فتح محمد صاحب نے خفیہ کے ان چاروں طرقی استدلال کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اور ایک ہی آیت پر ان چاروں انداز سے استدلال کرنے کے اس طریق استنباط کو ذہن نشین اور آسان کرنے کی کوشش کی ہے، مثلاً: قل ہوا اللہ
احد ہے چاروں طرق پر استدلال کرتے ہوئے لکھا ہے: قل ہوا اللہ احد یہ تما سوت
مسوق ہے توحید کیلئے پس یہ عبارت ہے، اور اشارت ہے کہ وہ صمد ہے اور کوئی اس
کا برابر والا نہیں اور دلالت سے سمجھا گیا کہ اللہ تعالیٰ حادث و فانی نہیں اس لئے
کہ جو بنی اسرائیل کا بنا یا ہوا درجہ اولیٰ نہ ہو گا اور اقتضا سمجھا گیا کہ
اللہ تعالیٰ واجب بالذات اور سمیع و بصیر و علیم و حی و مرید ہے ورنہ بے نیازی صحیح
نہ ہو گی۔ (۶۹ بحوالہ بالا)

حضرات احناف رحمہم اللہ نے قرآن کریم سے مفہامیں اور مسائل کے استنباط
کے لئے جو چار قابل اعتماد طریقے منتخب کئے ہیں ان کا حاصل یہ ہے کہ ہر آیت کا ایک
مرکزی مضمون ہوتا ہے جس کو بیان کرنے کے لئے وہ آیت نازل کی گئی ہو، پھر یہ کہ وہ
مرکزی مضمون آیت کے سیاق سباق سے ثابت بھی ہو رہا ہو اس مرکزی مضمون پر
آیت سے کیا جانے والا استدلال، عبارۃ النص کی اصطلاح سے ذکر کیا جاتا ہے، بقیہ
استدلال کے تینوں طریقے مرکزی مضمون کے علاوہ ہیں۔ اور ان کی تفصیل یہ ہے کہ
مرکزی مضمون کے علاوہ اگر ترجمہ لغت، یا مراد متعارف، یا لوازم سے کوئی مضمون اس
طرح سمجھا جائے کہ وہ مسلم کے مقصد اور سیاق کے مخالف نہ ہو اس کو اشارۃ النص

کی مسلطان تھے بیان کی بنا تاہے اور اگر مرکزی مضمون یا ترجمہ لغت مراد متعارف درد ۲۰۰۰ سے لے لئے خمون درجہ اوپر میں سمجھا جائے تو اس درجہ اوپر سے سمجھے گئے خمون برداشت نے والا استدلال دلالۃ النفس کے نام سے موسوم ہے اور اگر مرکزی مضمون یا ترجمہ لغوی وغیرہ سے ثابت مضمون یا درجہ اوپر سے سمجھا جانے والا مضمون عقلایا شرعاً کسی اور امر کے ان لینے پر موقف ہو تو عقلی یا شرعی موقف علیہ پر کیا جانے والا استدلال استدلال باقتضال النفس کہلاتا ہے ان چاروں طریق استدلال کا خفیر کے یہاں اعتبار ہے اور کسی کا نہیں۔

آیت پر اصول کا اجرام اور پہلے مضمون پر استدلال

اس مختصر تہیید کے بعد غور کرنا ہے کہ آیت شادر ہم فی الامر فاذا عزمت اللہ
سے جن چار صفات میں پر استدلال کیا جا رہا ہے وہ حقیقیہ کے طریق استدلال میں کس طرز استدلال سے ثابت ہیں اس مقصد کے لئے ضروری ہے کہ پوری آیت نقل کی جائے ارشاد خداوندی ہے۔

سوی ائمہ کی رحمت ہی ہے کہ آپ ان کے
حق میں نرم خود واقع ہوئے ہیں اور اگر
آپ تن خواہ درست دل ہوتے تو یہ
آپ کے پاس سے منتشر ہو جاتے تو آپ

فی بار حمہ من اللہ لنت له
ولو عنت فظا غنیمۃ
القلب لانفَضُوا مِنْ
حولَكَ فاعْمَنْ عن هر

وَاسْتَغْفِرْهُ وَسَادِرْهُمْ
فِي الْأَمْرِ، فَإِذَا عَزَمْتَ
فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ، إِنَّ
اللَّهَ يَحْبُبُ الْمُتَوَكِّلِينَ

(سورہ آل عمران آیت ۱۵۹)

ان کو معاف کر دیں، ان کے لئے استغفار
کریں اور ان سے کام میں مشورہ فرمایا
کریں، پھر جب آپ کام کا عزم کر لیں تو
الشے پر بھروسہ کریں، بے شک اللہ تعالیٰ
کو توکل پیشہ لوگوں سے محبت ہے۔

اس آیت کا مرکزی مضمون، اصالۃ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام کے
حق میں نرم خود اقوع ہونے کا بیان ہے، اور اس زم خوی کی تفصیلات میں بھی بیان
کیا جا رہا ہے کہ جب آپ رحمت خداوندی سے ان کے حق میں نرم خویں تو آپ
ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائیں، ان کے لئے پروردگار سے بھی مغفرت طلب کیں
اور ان سے معاملات میں مشورہ بھی فرماتے رہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں اس
آیت سے مشورہ کے حکم پر استدلال، عبارۃ النص سے کیا جانے والا استدلال ہے،
اس لئے کہ مضمون مرکزی مضمون بیان رحمت کی تفصیل میں لا یا گیا ہے۔

عبارۃ النص کی اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کلام اس مقصد کے لئے لا یا گیا
ہوا درودہ سیاق سے بھی ثابت ہو، چنانچہ اس آیت کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ
آیت میں بنیادی طور پر یہ فرمایا جا رہا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی طبع
صحابہ کرام کے حق میں رحمت خداوندی ہے اور اس کی تفصیل میں یہ بیان کیا جا رہا
ہے کہ غزوہ احمد کے موقع پر اگرچہ ان بزرگوں سے اجتہادی لغزش ہوئی ہے مگر
آپ تقاضائے رحمت میں معاف فرادیں اور اللہ سے بھی ان کے حق میں مغفرت

کی دعا کریں اور ان سے مشورہ بھی فرمایا کریں، پھر جب مشورہ میں کوئی بات طے ہو جائے اور اس کا عزم فرمائیں تو اب توکل اعلیٰ اللہ اقدام فرمائیں۔

اس لئے یہ کہا جائیگا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نے مشورہ کا حکم۔
اس آیت کی عبارۃ النص سے ثابت ہے۔

وَنُكْرِمْهُمْ وَنَبْرَأْنَاهُمْ

رب امت کے دیگر افراد کے لئے اس آیت سے مشورہ کے حکم کا ثبوت، تو
وہ ذمہ داری مضمون ہے ن ترجمہ لغوی سے ثابت ہے بلکہ امت کے دیگر افراد کے
بارے میں یہ کہا جائیگا کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ کا حکم دیا گیا جبکہ
آپ کو معلومات کے سب طاقتوں ذریعہ یعنی وحی پر دسترس حاصل ہے، یعنی جب
پیغمبر علیہ السلام کو وحی کی طاقت پیغمبرانہ بصیرت، کمال عقل و دانش اور حظیرہ
القدس سے براہ راست رابطہ کے باوجود صحابہ کرام سے مشورہ کا حکم دیا گیا تو
امت کے دیگر افراد کے بارے میں مشورہ کا حکم شادر ہم کی دلائل النص سے ثابت
ہے۔ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں۔

کسی بھی کام کے ذمہ دار کو مشورہ سے بے نیاز قرار نہیں دیا جا سکتا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر علیہ النسلوہ والسلام کو مشورہ کا حکم دیا ہے تو آپ کے علاوہ دیگر حضرات کیلئے بذریعہ اولیٰ مشورہ کا حکم	laghni lomli al-amrun المشاورة فان اللہ امر بها نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم نفیرہ اولی بالمشورۃ (السیاست الشریفہ)
--	---

ثابت ہو گا۔

معلوم ہوا کہ آیت شادرہم سے مشورہ کا حکم حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عبارۃ النص ہے، اور دیگر سلاطین و امراء کیلئے دلالۃ النفس سے ثابت ہے۔

تیسرا اور چوتھے مضمون پر اسلام

بحث کے آغاز میں جن چار مصائب کا تعین کیا گیا تھا ان میں سے پہلے مضمون آیت کے پہلے جملے شادرہم کی عبارۃ النص ہے، اور دوسرا مضمون اسی جملے کی دلالۃ النص سے ثابت ہے، اب تیسرا مضمون یعنی پیغمبر علیہ السلام کے عزم اور چوتھے مضمون دیگر امراء کے عزم کے بارے میں آیت کے دوسرے جملے فاذا عنمت پراسوں استنباط کا اجر کریا جائے تو بات منقح ہو جائے گی چنانچہ بات صاف ہے کہ فاذا عنمت کام کر زی مضمون حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزیمت کا بیان نہیں ہے، مرکزی مضمون تو یہاں بھی امت کے حق میں پیغمبر علیہ السلام کی زم خونی اور شفقت کا بیان ہے البتہ ترجمہ لغوی سے ضمنی طور پر بات معلوم ہوئی کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مشورہ میں طے شدہ بات کا عزم فرمائیں تو اب اللہ پر توکل کر کے اقدام فرمائیں۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ عزم کے مشورے سے آزاد ہونے کی نفعی پر دلائل گذر چکے ہیں، لیکن مجازاً مع الخصم کی قبیل سے ہم چند قدم دو سے نقطہ نظر کے ساتھ چیز تو بھا جائے گا کہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام جنہیں پیغمبرانہ بصیرت حاصل ہے جنہیں وحی پر دسترس حاصل ہے جن کی عقل و دانش کائنات

جن و انس کی عقل و دانش سے بدرجہا فائق ہے، وہ جب عزم فرمائیں توب کسی کے لئے ان سے تعریض کرنا جائز نہیں، اب وہ عزم کے بعد تو کلآلی اللہ اقدام فرمائیں گے اور امت کے دیگر افراد کا ان کے عزم کے سامنے سرسیم خم کرنا ضروری ہو گا۔ گویا پیغمبر علیہ السلام کے عزم کے سلسلے میں کیا جانے والا استدلال چونکہ آیت کے ترجمہ نجی فی متعلق ہے اس کے اصطلاح میں اس کو اشارۃ النص کیا جائے گا، لیکن عزم کے اپنی معانی کو اگر ہم دیگر سا اپنی دامت اور بارے میں جاری کرنا چاہیں تو اس کی تعبیر اس طرح ہو گی کہ جب پیغمبر علیہ السلام کو وحی کی طاقت پیغمبرانہ بصیرت، عقل و دانش کے کمال کے سبب یہ بات حاصل ہے رآپ کے عزم کے بعد کسی کو اختلاف رائے کی گنجائش نہیں تو امت کے دیگر امرا و سلطنتیں جوان اوصاف کے حامل نہیں ہیں ان کو بھی بدرجہ اویٰ یہ امتیاز حاصل ہو گا کہ ان کے عزم کے بعد کسی تأمل یا مشورہ کی گنجائش نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ عزم کے بارے میں دلالۃ النص کے اجراء سے دیگر امرا کے بارے میں یہ حکم ثابت نہیں ہوتا۔

عور کرنے کا مقام ہے کہ شادر ہو کی دلالۃ النص سے امت کے دیگر افراد کے بارے میں مشورہ کا حکم درجہ اویٰ میں ثابت تھا، لیکن اذاعنمت کی دلالۃ النص سے امت کے دیگر افراد کے بارے میں استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ حفظہ مولانا بدر عالم صاحب میرٹھی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

رسول مجلس مشاورت کی رائے کا تابع نہیں ہوتا، دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔ (ترجمان السنہ جلد اول ۲۳)

مطیعہ دلکش اور سفر و تجربہ کا صاحب کر جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ کو اعتماد تھا۔
کی رائے یقینی کہ غزوہ احمد کے موقع پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کی تھی چاہئے
مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ
سے باہر نکل کر جنگ کرنی چاہئے تو آپ نے اکثریت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے
باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہمی ترجیح دی اور اس عمل اسوہ حسنہ کو اپنے مسطورہ ذیل
ارشاد مبارک سے مکمل و مضبوط بنادیا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابہ نے یہ استفسار کیا ماما
العزیز میا رسول اللہ ؟ اے خدا کے رسول ! قرآن میں مذکور فاذ اعزمت میں
عزم سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مثادرۃ اهل الہی شرعاً تبعاً ہم اہل
الرأی نے شورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پسیرا
ہونے کا نام عزم ہے۔ (قصص القرآن بجلد چہارم صفحہ ۲۵۵)

رسولؐ کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق

حضرت مولانا حافظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ کے بیان میں دونوں ایام صفا
ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے فاذ اعزمت کی جو تفسیر سانے آئی
ہے وہ اکثریت کی رائے کے مطابق آپ کا عزم فرمانا ہے، اور چونکہ حضرت علیؑ کرم اللہ
وجہہ کی روایت میں بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ نے عزم کے معنی ہی مثادرۃ اهل
الرأی شرعاً تبعاً ہم بیان فرمائے ہیں اس لئے دیگر امرا و سلاطین کے حق میں بھی عزم
کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ بھی اہل رائے سے مشورہ کرنے کے بعد انہی کی رائے کے

کے حق میں عزم کا یہ مضمون کردہ عزم میں مشورے کے پابند نہیں ہیں، آیت قرآنی سے خفیہ کے معین کردہ طرق استدلال میں کسی طریقے سے ثابت نہیں اسلئے اگر عزم کے یہ معنی مراد بھی لئے جائیں کہ مشورہ کا پابند نہیں ہے تو یہ صرف حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہو گی، دیگر امرا و سلاطین کے حق میں اس کو عام کرنا خفیہ کے مقرر کردہ فہم قرآن کے طریقوں کی رو سے درست نہیں ہے جیسا کہ تفصیل کے ساتھ عرض کیا جا چکا ہے۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے عزم کے جو امتیازی معنی آیت کی اشارۃ النص سے ثابت قرار دئے گئے ہیں، وہ بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں اس طرح موجود نہیں ہیں، بلکہ پروردگار عالم نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو شاہد ہیوفی الامر کے ذریعہ مشورہ کا حکم دیا، اور آپ نے حکم خداوندی کی اس طرح تعییل کی کہ صحابہ کرام کو یہ شہادت دینا پڑی کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کسی کو مشورہ کا پابند نہیں پایا، پھر یہ کہ آپ نے ہمیشہ مشورہ دینے والوں کے مشورہ کو اہمیت دی، عام طور پر تو ایسا ہوا کہ مشورہ میں کوئی ایک بات طے ہو گئی اور اسی کے مطابق عزم فرمایا گیا، اور ایسا بھی ہوا کہ مشورہ میں اتفاق رائے نہ ہو سکا، تو آپ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف اکثریت کی رائے کو قبول کرتے ہوئے اس کے مطابق عزم فرمایا، غزوہ احمد کے موقع پر آپ کا طرز عمل ہمارے دعویٰ کی سب سے مضبوط شہادت ہے کہ آپ نے اپنی اور حلیل القدر صحابہ کی رائے کو قبول فرمایا۔ تفسیر ابن کثیر میں ہے۔

و شادر هر فی احد فان
یقعد فی المدینة او
یخرج ای العدد فاشار
جمہور هم بالخرد ج الیم
فخر بـ الیهـ

(تفسیر ابن کثیر ج ۳۷)

اکثریت کی رائے پر عمل کرنے کی اس مضبوط شہادت کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقع پر اپنی رائے سے بھی مطلع کر دیا تھا اور اس کی تائید میں ایک خواب بھی بیان فرمایا تھا۔ فتح الباری میں ہے۔

آپ نے ہتھیار بند ہونے سے پہلے صحابہ کرام کو یہ بتا دیا تھا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں نے ایک مضبوط زرد پہن رکھی ہے۔ میں نے اس کی یہ تعبیر لہے کہ ہبہ میں قیام مناسب ہے یہ بسند حسن ثابت ہے، اور امام احمد داری اور نسائی نے حماد بن سلمہ سے برداشت ابی زبیر حضرت جابر سے بھی یہی ضمنوں نقل کیا ہے، اور کتاب التعبیر میں اس کی طرف اشارہ گذر چکا ہے، اور اس کی

دکان ذکر لہم قبل ان
یلبس اکلا اۃ اف رأیت
اٹی فی دراع حصینۃ فادلتہا
المدینة و هذاسند
حسن و اخرج احمد و
الداری والنسائی من طریق
حmad بن سلمة عن ابی الزید
عن جابر من حجۃ و تقدیمت
الاشارة الیہ فی کتاب
التعبر و سند مصحیح

سندھج ہے اور امام احمد کے الفاظ یہ
ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے
فرمایا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ میں
ایک مضبوط از رہ پہنچ ہوئے ہوں اور
میں نے ایک گائے کوڈنچ ہوتے ہوئے
دیکھا ہے اور میں نے زرہ کی تعبیر میں نہ

لفظ احمد ان النبي صلی اللہ علیہ وسلم قال
رأیت صافی ف درع
حصینة درأیت بقرات تحر
فأولت الدفع الحصينة
المدينة۔

فتح الباری (۲۸۳) م ۱۴۰۲

ان حوالوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی
رائے کا اظہار فرمایا، پھر خواب سننا کراس کی تعبیر سے مطلع کیا، لیکن اکثریت کی رائے
پھر بھی مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے ہی کی رہی، جس پر آپ نے اپنی رائے
کے خلاف، اکثریت کی رائے قبول فرمائے باہر نکلنے کا عزم فرمایا۔

اسی مضمون کو حضرت مولانا حافظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ قصص القرآن
میں بیان فراتے ہیں۔

امیر خلیفہ اور اس کے نائبین کا فرض ہے کہ اہم امور میں مسلمانوں سے
مشورہ کرے اور باتفاق رائے یا بکثرت رائے حوصلہ ہوا سی کو اپنا عزم بنائے
بنی صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولی وحی ہوتا تھا اس لئے اگر آپ صحابہ کرام رضی اللہ
عنہم سے مشورہ نہ بھی فرمائے تو کوئی قباحت نہ تھی تاہم اسوہ حسنة کو شواربنا نے
کے لئے آپ اہم امور میں برابر مسلمانوں سے مشورہ فراتے رہے چنانچہ غزوہ احمد
میں بھی مشورہ فرمایا اور اس مشورہ کی یہ خصوصیت ہے کہ خود ذات اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم اور معمود تجربہ کار صحابہ کہ جن کی قوت و اصابت رائے پر آپ کو اعتماد تھا۔ کی رائے یہ تھی کہ غزوہ احمد کے موقع پر مسلمانوں کو مدینہ سے نکل کر جنگ نہیں کرنی چاہئے مگر اکثریت کے لحاظ سے ان صحابہ کی تعداد بہت زیادہ تھی جن کا اصرار تھا کہ ہم کو مدینہ سے باہر نکل کر جنگ کرنی چاہئے تو آپ نے اکثریت کے فیصلے کو برقرار رکھتے ہوئے باہر نکل کر جنگ کرنے کو ہی ترجیح دی اور اس عمل اسوہ حسنہ کو اپنے مسطورہ ذیل ارشاد مبارک سے محکم و مضبوط بنایا۔

حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک صحابی نے یہ استفسار کیا مَا العزْم يَأْرِسُولُ اللَّهُ؟ اے خدا کے رسول! قرآن میں مذکور فاذاعزمت میں عزم سے کیا مراد ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ مشاورۃ اہل الْأَیٰ شوَّابِعَهُمْ اہل الرائے نے مشورہ کرنے کے بعد (امام و خلیفہ کا) ان کی دی ہوئی رائے پر عمل پسیرا ہونے کا نام عزم ہے۔ (قصص القرآن جلد چہارم ۵۵)

رسولؐ کے عزم اور دیگر امراء کے عزم میں فرق

حضرت مولانا حافظ الرحمن صاحب رحمہ اللہ کے بیان میں دونوں باتیں صاف ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے فاذاعزمت کی جو فسیر سانے آئی ہے وہ اکثریت کی رائے کے مطابق آپ کا عزم فرمانا ہے، اور چونکہ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کی روایت میں بھی یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ آپ نے عزم کے معنی ہی مشاورۃ اہل الوائی شوَّابِعَهُم بیان فرمائے ہیں اس لئے دیگر امرا و سلاطین کے حق میں بھی عزم کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ بھی اہل رائے سے مشورہ کرنے کے بعد انہی کی رائے کے

مطابق عزم کرنے کے پابند ہیں۔

یکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عزم کے جو معنی بیان فرمائے ہیں مثلاً ذریعہ اہل الرأی ثم ابتداء عہد و عزم کے لغوی معنی نہیں ہیں بلکہ عزم کی تفسیر فرمائا اپنے مشورہ کرنے والوں کو یہ بُدایت دینا چاہتے ہیں کہ وہ اپنا عزم کسی چیز سے متعلق کریں کیونکہ عزم کے لغوی معنی یہ کسی کام کا پختہ ارادہ کرنا، یہ پختہ ارادہ قلب میں آنے والی باتوں کا وہ آخری درجہ ہے جسے حقیقت کے اعتبار سے قلب کا عمل کہنا چاہئے، عمل کا اطلاق جوارح کے اعمال کے ساتھ قلب کے اعمال پر بھی ہوتا ہے، شیخ عبدالحق محدث دہلوی امام الاعمال بالذیات کی تشرع میں لکھتے ہیں۔

تحقیق یہ ہے کہ لفظ "اعمال" افعال

والتحقیق انہا (الاعمال)

جوارح اور افعال قلوب دونوں بی کو

تعمل افعال الجوارح و افعال

القلوب (لماعت التفییج ۵۵)

باب الوسوسة میں ان اللہ تعالیٰ عز امی ما و سوت به صدد رہا

پر کلام کرتے ہوئے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فقہاء محدثین کی طرف یہ بات

نسب کی ہے کہ عزم قلب کا وہ فعل ہے جس پر احکام مرتب ہوتے ہیں فرماتے ہیں

والصواب الذي عليه اكثرا

وہ درست موقف جسے اکثر فقہاء د

الفقهاء والمحدثين انه

محمد بن نے اختیار کیا ہے یہ کہ انسان

يواخذ ذم على العزم دون

سے عزم کے بارے میں موافذہ کیا جائیگا

الله . د ت خ ف ي ق ه ا ن م ا

ہم (عزم سے نیچے کا درجہ) پر نہیں کیا

جائیگا، اس کی تحقیق یہ ہے کہ جو باتیں
قلب میں اچانک بلا اختیار آتی ہیں
جسے بعض حضرات نے حاجس کا نام
دیا ہے وہ تم امتوں سے معاف ہے
کیونکہ اس میں اختیار کا دخل نہیں ہے
پھر اگر یہ بات دل میں باقی ہے اور دل
ہی دل میں گھومتی رہے اور اس کو خاطر
کہتے ہیں ایسی بھی اللہ کے فضل اور حضور
اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت افزائی کے
سبب اس امت محمدیہ سے معاف ہے
اور یہ وہ نیان کے حکم میں ہے جو اس
امت محمدیہ سے معاف کر دیئے گئے ہیں
پھر جب انسان معصیت کا ارادہ (ہم)
کرے اور اس کے دل میں اس کی محبت
ولذت محسوس ہونے لگے جیسے مشلاً وہ
کسی محبوب عورت سے ملنے کا ارادہ کرے
تو یہ درج بھی اس امت محمدیہ سے اسوقت
تک معاف ہے جب تک کہ وہ عمل میں
نہ لالے بلکہ اگر ارادہ کے باوجود وہ اپنے

دقع فی القلب بغۃ
من غیر اختیار و سماه
بعضه رالها جس فهو
معفوع جمیع الامم
لعدم الاختیار فيه
شو اذا استمر دجال
ف الصدر دیستی
الخاطر فهو معفو عن
هذه الامة فضلاً
من الله و تحریماً
لنبیه و صلی الله علیہ
و سلود هو في حکم السهو
والنسیان الذين رفعوا
عن هذه الامة شو
اذ اهم بالمعصية في قلبه
بالمحبة والمتلذذ كما يقصد
الوصول الى امرأة يحبها
نهذا ايضا مرنوع و سا
یكتب ما لم یعمل بل یكتب

آپ کو عمل سے روکے رکھتے تو اسے
نامہ اعمال میں نیکی کا اندر راج کیا جاتا
ہے اور اس سلسلے میں متعدد احادیث
وارد ہوئی ہیں۔ اور یہاں ایک
قسم اور ہے اور اس کو عزم کہتے
ہیں وہ یہ ہے کہ انسان کا نفس کسی
معصیت کیلئے بالکل آمادہ ہو جائے
دل پختہ ارادہ کر لے، اس کی شدید
خواہش پیدا ہو جائے اور یہ باتیں اس
درجہ میں ہوں کہ اُنھیں صرف خارجی سبب
کافراً ہم نہ ہزارہ جائے ورنہ اس کی
طبعیت میں کوئی مانع، نفرت یا کراہیت
باتی نہ رہے، یہ وہ درجہ ہے جس پر موافقہ
ہے کیونکہ یہ قلب کا عمل ہے اور انسان
سے اعمال کے باقی میں موافقہ کیا
جائیگا، فاسد عقائد اور برے اخلاق
اسی قبیل سے ہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ عزم صرف ارادہ کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ قلبی ارادہ کا وہ آخری
درجہ ہے جس میں اگر خارجی اسباب ہیتاں ہوں تو فعل وجود میں آ جاتا ہے اور اسباب

حسنۃ اذا هربها وکف
نفس عن العمل
وقد ورد فيه احادیث
متعددة وهنها قسو
اخرو هو العزم وهو
توطین النفس على
العصبية وعقد القلب
به والتھالك عليها
بحیث لا يمنعه
عنها الا عدم تھیث
الاسباب من خارج و
ليس في نفسه مانع و
كرامة و نفرة منها ينواخذ
عليه لانه من اعمال القلب
والعبد مواخذ عليه ومن هذا
القبيل العقائد الفاسدة ومساوى
الاخلاق اذ (المعات النفع ۲۳)

ہیزان ہونے کی صورت میں انسان فعل کو وجود دینے سے قاصر ہتا ہے۔ اگر یہ محضیت کی قبیل سے ہے تو اس پر منجانب اللہ گرفت اور موافذہ ہے اور اگر یہ طاعات کی قبیل سے ہے تو اس پر تعیناً اجر و ثواب ہے۔

مندرجہ بالا شرعاً کے مطابق عزم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو یا دیگر امرا، دشمنین کا، یہ ارادہ قلبی کی وہ آخری منزل ہے جسے جوارح کے اعمال کی طرح قلب کا عمل قرار دیا گیا ہے، اب غور کرنے کی بات ہے کہ عزم جب ایک عمل کا نام ہے تو جو فرق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل اور دیگر امرا کے عمل میں ہے وہی فرق آپ کے عزم اور دیگر امرا کے عزم میں ہو گا، یعنی مش

معامل میں جب اہل مشورہ کی رائے کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرایا تو اب اس جانب کو عمل رسول متعلق ہونے کی بنیاد پر سنت ہے درجہ حاصل ہو گیا اور آپ کی سنت علی سے محدث ہمار کے بیان کے مطابق سنت مؤکدہ تک کے احکام ثابت ہوتے ہیں، پھر اگر عزم کے ساتھ آپ کا کوئی قولی ارشاد بھی ہے تو اس سے صرف سنت مؤکدہ ہی تک نہیں بلکہ وجوہ تک کا ثبوت ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امور مشورہ طلب میں کسی جانب سے آپ کا عزم متعلق ہو جانے کے بعد وہ تمام مسلمانوں کے لئے واجب الاتساع ہو جاتا ہے اور اس سلسلے میں مشورہ دینا بھی جائز نہیں رہتا زماں اس موقع پر نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے، امور مشورہ طلب میں آپ کا عزم متعلق ہونے سے پہلے اور عزم کے متعلق ہونے کے بعد فرق کے لئے حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کا ارشاد ملاحظہ ہو، المقدمۃ السنیۃ میں لکھتے ہیں۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابے سے
ان معاملات میں مشورہ فرمایا کرتے تھے
جن میں وحی کا نزول نہ ہوا جیسا کہ آپ
نے اسiran بدر اور زادن کے عالم میں
مشورہ فرمایا اور صحابہ کے لئے یہ جائز
تھا کہ آپ کی موجودگی میں رائے دیں
اور جس کو بہتر سمجھیں وہ آپ کی سامنے
پیش کریں خواہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم اپنی رائے صحابہ کی رائے کے خلاف
دے چکے ہوں جب تک کہ آپ نے
عزم نہ فرمایا ہوا اور حکم کونا فذ نہ کیا ہو بھر
جب آپ حکم نافذ فرمادیتے اور عزم کر لیتے
تو صحابہ کیلئے پیروی کرنا لازم ہو جاتا
اور کسی کیلئے اختلاف کی گنجائش باقی
نہ رہتی۔

وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدِيسًا وَرَسُولًا
فِي الْوَيْوَحِ إِلَيْهِ كَمَا شَاوَرَ
فِي أَسَارِي بَدْرٍ وَفِي قَصَّةٍ
الْأَذَانِ وَكَانَ لِلصَّحَابَةِ
رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَإِنْ تَكُلُوا
فِي حَضُورِهِ وَلَا يَرْضُوا عَلَيْهِ مَا
رَأَوْهُ خَيْرًا وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَدَمَ
لِهِمْ مَا يَخَالِفُ رَأِيهِمُ الْمُرْ
يَعْنِي مَعْلَى شَيْءٍ وَمَا الْوَيْمَضُ
الْحَكْمُ بِهِ فَإِذَا أَمْضَى وَعْدَهُ
لِزَمَانِ الْأَتَابَاعِ وَلَوْبَكَنْ لَاحِدٌ
بِحَالِ الْأَخْتِلَافِ۔

(المقدمة السنیہ ۲۵)

اس سے یہ واضح ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کسی جانب کا عزم فرما لیں تو بس اب وہی جانب حق ہے، آپ کے عزم کے تعلق کے بعد اس پر نظرثانی کی گنجائش نہیں رہتی بلکہ امت کے لئے ضروری ہے کہ اسی جانب کو سنت عمل کا درجہ دے کر قبول کر لے بلکہ اگر عزم کے ساتھ قولی وضاحت بھی ہے تو

ہو سکتا ہے کہ اس نقطہ نظر کو صرف سنتِ علیٰ نہیں و جوب کے درجہ میں بھی لایا جائے۔

جب کہ دیگر امراء کے عزم کو یہ فوقيٰت حاصل نہیں ہے، یہ حضرات بھی عزم کے سلسلے میں اس کے قبапنڈ ہیں کہ یہ عزم اہل مشورہ کی رائے کے مطابق کیا جائے گا یعنی اہل مشورہ کی رائے کے مطابق پختہ ارادہ کے باوجود، ان کے عزم کو بدیہی طور پر سنت کا درجہ نہیں دیا جا سکتا کیونکہ سنت صرف عمل رسول کا نام ہے اور اسی لئے دیگر امراء کے عزم پر ہمہ وقت نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے اگر دوسری مصلحتیں سامنے آ جائیں اور اہل رائے خود اپنے معین کردہ نقطہ نظر پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس کریں تو شرعاً اس میں کوئی تنسیگی نہیں، بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس تجزیہ کے مطابق یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ عزم رسول فعل قلب ہونے کی بنی پر سنت علیٰ کے درجہ میں ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس حق کا معیار ہے، آپ کا ہر عمل جحت ہے، آپ کے عمل پر نظر ثانی کی گنجائش نہیں، جبکہ دیگر امراء کی یہ شان نہیں، ان کے پسندیدہ اور اختیار کردہ عزم پر ہمہ وقت نظر ثانی کی گنجائش رہتی ہے، یہ نتیجہ برآمد ہیں ہوتا کہ دیگر امراء کو عزم کے معاملہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح تفوق دیدیا جائے کردہ عزم کے معاملہ میں آزاد ہیں کہ مشورہ کے بعد اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی جانب کو ترجیح دی دیں اور ترجیح دینے کے بعد اس پر غور و فکر کا دروازہ بند سمجھا جائے، کیونکہ دیگر امراء کی یہ شان نہیں ہے کہ خود ان کی ذات کو

معیار حق قرار دیا جائے، بلکہ ان کے عزم کے درست ہونے یا نادرست ہونے کا معیار ان کی ذات نہیں بلکہ منصوص مسائل میں کتاب و سنت کے معیار کے مطابق اور غیر منصوص جزئیات میں مجلس شوریٰ کے حکم کے مطابق درست ہونا ہے

عہد رسالت میں مشورہ طلب مسائل اور فریضہ کا طریقہ

پہلے صفحات میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیے مشورہ کی شرعی جیش مشورہ کے مقاصد وغیرہ پر گفتگو کی جا رہی تھی، اسی ذیل میں عزم کی بحث شروع ہو گئی اور اس پر فضیل کلام کیا گیا، اب پھر مقصود کی طرف عود کرتے ہوئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں مشورہ طلب مسائل اور اختلاف رائے کی صورت میں پہلے کے طریقہ پر گفتگو کا آغاز کیا جا رہا ہے۔

— تمام علماء امت کا اتفاق ہے کہ عہد رسالت میں منصوص مسائل میں نہ مشورہ کی ضرورت تھی اور زایسے معاملات میں مشورہ جائز تھا جن میں وحی نازل کردی گئی ہو۔ امام رازی قدس سرہ لکھتے ہیں۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ تمام امور
جن میں اللہ کی جانب سے وحی نازل
ہو گئی ہو ان میں رسول کیلئے یہ جائز
نہیں کرامت سے مشورہ کر کے کیونکہ جب
نصیل گئی تواریے اور قیاس باطل ہو گیا۔

اتقواعلى ان حکل ما
نزل فيه دح من عند الله
لديجن للرسول ان يشاور فيه الله
لانه اذا جاءه النفي بطبل الرأى
والقياس (تفصیر بکیر مجہہ)

معلوم ہوا کہ وحی کے نزول کے بعد، مشورہ کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں بلکہ مشورہ جائز ہی نہیں رہتا، البتہ اس سلسلے میں تفصیل ملحوظ رہے کہ وحی کی دو صورتیں ہیں ایک وحی جلی، اور دوسرے کے وحی خفیٰ، مشورے کے عدم جواز یکے دونوں کا ایک ہی حکم ہے، نیز یہ کہ نفس کی موجودگی میں مشورہ کا عدم جواز عہد رسالت ہی میں نہیں ہے بلکہ امت کے لئے بھی یہی حکم ہے کہ نفس کے ہوتے ہوئے مشورہ جائز نہیں۔

البتہ اگر کسی معاملہ میں وحی کا نزول نہ ہوا ہو تو معاملہ دینی ہو یاد نیوی، دونوں ہی صورتوں میں مشورے کی ضرورت ہے، امام رازی ملکتے ہیں اور تحقیقی بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اولاً ابصار کو عبرت حاصل کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اے آنکھوں والوں عبرت حاصل کرو، اور اللہ تعالیٰ نے مسائل کا استنباط کرنے والوں کی درج کی اور فرمایا کہ (اگر وہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کرتے تو) وہ لوگ جان لیتے جو تم میں سے استنباط کرنے والے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انسانوں میں عقل و ذکاء تک اعتمدار سے فائق تھے اس سے یہ بات

والتحقیق فی القول ان
الله امر اولی الابصار
بالاعتبار فقال فاعتبروا
یا اولی الابصار و مدح
المستبطئين فقال لعلمه
الذین يستبطونه
منکو و عمان اکثر اناس
عفلا و ذکاء و هذا
بدل على انه عمان
ما موسى ابا لاجتهاد
اذ لا ينزل الوجه

علوم ہوتی ہے کہ آپ کو اس وقت اجتہاد
کا حکم دیا گیا تھا جب وحی نازل نہ ہوئی ہو
اور اجتہاد بحث و نظر سے قوت حاصل
کرتا ہے اسلئے آپ کو مشورہ کا بھی حکم دیا
گیا تھا چنانچہ آپ نے بدر کے
قیدیوں کے سلیے میں مشورہ کیا، جب کہ
ی معاملہ ایک دینی معاملہ تھا۔

علوم ہوا کہ غیر منصوص معاملہ میں دینی ہو یا دینیوی مشورہ کیا جائے گا۔ اور
مشورے کے ذریعہ میتوں تک پہنچنے کی کوشش کی جائے گی۔

۲ ————— مشورے کے دوران اگر وحی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ختم کر دیا
جائے گا اور وحی کے طبق عمل کرنا ضروری ہو جائے گا کیونکہ مشورہ صحی صورت تک
پہنچنے کی کوشش تھی اور اب اس کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ امام بخاری فرماتے ہیں
اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ
رضی اللہ عنہا پر تہمت تراشی کے سلیے میں
حضرت علی لہر حضرت اسماہ سے مشورہ
کیا اور ان دونوں کی رائے معلوم کی حتی
کہ قرآن نازل ہو گیا تو آپ نے تہمت
لگانے والوں پر حد جاری فرمائی اور اہل
مشورہ کے اختلاف رائے پر توجہ نہیں دی

والاجتہاد یعنی بالنظر
والمباحثة فلهذا سکان
سامورا بامشاورة وقد
شادر هر يوم بدیف
المساری و سکان من
امور الدین۔

(تفسیر کبیر مفتاح)

دشادر علیا و اسامة
فبیارف به اهل الافک
عائشۃ فسم متهماحتی
نزل القرآن فجحد
الرامین دلرسبلقت
اللہ تعالیٰ عہدو سکن
حکومبا امره اللہ۔

(بخاری شریف جلد شانی ص ۱۹۵) یکن امر خداوندی کے مطابق حکم نافذ فرولیا۔ معلوم ہوا کہ دورانِ مشورہ اگر وحی نازل ہو جائے تو مشورہ ختم کر دیا جائے گا اور وحی کے مطابق عمل درآمد کرنا ضروری ہو جائیگا، جیسا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں ہوا کہ مشورہ کے دورانِ وحی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ترک کر دیا گی، لیکن جس معاملہ میں وحی جلی یا خفی کی رہنمائی نہ ہو، اور اسیں مشورہ کی نوبت آجائے پھر مشورہ کے دوران بھی وحی کا نزول نہ ہو تو اہل مشورہ کی رائے کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا۔ استقرائی طور پر اس کی تین صورتیں ہوتی ہیں (الف) ایک صورت تو یہ ہے کہ ابتداءً خواہ وہ رائے اقلیت یا ایک ہی فرد کی ہو یکن اس کو تمام اہل رائے کی تائید حاصل ہو جائے اور اسی ایک رائے پر سبک اتفاق ہو جائے، ہمدردیات میں اس کی متعدد نظریتیں ہیں، غزوہ خندق کے موقع پر خندق کی رائے تنہا حضرت مسلمان فارسی کی جانب سے پیش کی گئی، لیکن اس سلسلے میں کسی کا اختلاف منقول نہیں بلکہ سنبھلے اس کو قبول کر لیا اور اسی کے مطابق عمل درآمد کیا گیا۔

(ب) دوسری صورت یہ ہیکہ امر مشورہ طلب میں اہل رائے کا اختلاف ہو جائے۔ لیکن رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کثرت رائے کے مطابق فیصلہ قبول فرمایا ہو جیسا کہ اسی رین بدر کو فدیہ لے کر رہا کرنے کے مسئلہ میں، یا غزوہ احد کے موقع پر مدینہ طیبہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے مسئلہ میں اپنے کثرت رائے کا لحاظ فرماتے ہوئے فیصلہ فرمایا۔

(ج) تیسرا صورت یہ ہے کہ اختلاف رائے کے موقع پر رسول اکرم صلی اللہ

اللہ علیہ وسلم نے اکثریت کی رائے ترک فرمائی، اقلیت کی برا بپنی ذاتی رائے کو ترجیح دیدی ہو، از روئے عقل اس کی بجا طور پر گنجائش ہے، کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر ا时报ار سے جو امتیاز حاصل ہے اس کے سبب آپ کو اس کا حق ہونا چاہئے لیکن نقلی طور پر پورے ہمدرسالت میں اس کی کوئی واضح نظر نہیں ملتی، کہ آپ نے اختلاف رائے کے باوجود اقلیت کی برا بپنی رائے کو ترجیح دی ہو، کیونکہ جن واقعات کو اقلیت کی رائے کی ترجیح کے سلسلے میں پیش کیا جاتا ہے وہ در اصل ہمی صورت کی نظیر ہیں کہ ابتداء وہ رائے اقلیت کی تھی لیکن دوران مشورہ اس کو اکثریت کی تائید حاصل ہو گئی، اسی طرح جن واقعات کو ذاتی رائے کی ترجیح کی دلیل قرار دیا جاتا ہے وہ در اصل وحی خفی کی نظیر ہیں ہیں، کران میں معاملہ مشورہ طلب نہیں تھا جیسا کہ صلح حدیبیہ کے بارے میں ہوا، یہ بحث اپنے مقام پر آرہی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمدرسالت میں امور مشورہ طلب میں فیصلہ تک پہنچنے کے دو طریقے بالکل صاف ہیں ایک یہ کہ اہل رائے کا کسی نقطہ نظر پر اتفاق ہو جائے، دوسرے کہ اختلاف رہے تو اکثریت کی رائے کو ترجیح دیدی جائے البتہ ان تمام مشورہ طلب امور میں یہ بات ملحوظ رہے کہ مشورے کا وقت آپ کے عزم سے پہلے ہے جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مشورہ فرمانے کے بعد عزم کر لیں اور آپ کا عمل قلب کسی جانب سے متعلق ہو جائے تو مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور تمام مونین کے لئے آپ کے عزم کے مطابق عمل کرنا سنت کے درجہ میں آ جاتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ واقعہ قرطاس

کی وضاحت میں فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاغذ طلب فرلنے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حسیناً کتاب اللہ فرمایا اسکی کیا وجہ ہے؟۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ طلب قرطاس سے ابھی آپ کا عزم متعلق نہیں ہوا ہے اگرچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یحیا نبی سے وہ بات پیش آپ کی تھی جس سے عزم کا متعلق ہونا ظاہر ہوتا تھا، اور بسا اوقات صحابہ آپ کے سامنے اپنی رائے پیش کرتے تھے جبکہ اللہ تعالیٰ پیغمبر علیہ السلام پر پیش کردہ صورت حال کے علاوہ دوسری صورت واضح کر جکا ہوتا تھا اور ایسے میں آپ صحابہ کے مشورہ کو قبول نہ فرماتے تھے میسا کہ حدیث یہ میں ہوا، لیکن صحابہ ان قرآن کے سبب جو مشورہ کے وقت کا باقی رہنا ظاہر کرتے تھے مغذور تھے خواہ نفس الامر میں مشورہ کا وقت باقی نہ رہا ہو کیونکہ مجتہد کو خطا کے باوجود اجر ملتا ہے۔

اسناد وجہہ ائمہ رضی اللہ عنہ علمو ان الامر غیر معن و م دان سیان قدم صلی اللہ علیہ وسلم ما ظاهره العزم دس بما عرضوا عليه و قداره اللہ غير ما عرضوا عليه فلم يلتفت الى اقوالهم كما وقع في الحديبية لكنهم بسبب ما ظهر لهم بالقرآن من ان وقت المشاورۃ باق دان لعدیکن باقيا في نفس الامر معذ و م دن للمجتهد بحر دان اخطاء۔

(المقدمة السنیہ ۲۶)

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ کے مضمون کا خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم فرمانے کے بعد مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور جہاں جہاں صحابہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مشورہ دیا ہے وہاں ان حضرات نے بھی سمجھا ہے کہ مشورہ کا وقت باقی ہے۔

زیرِ بحث موضع متعلق امام بخاری کا ترجمہ الباب

مشورہ سے متعلق امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب کے ایک ترجمہ الbab میں مختلف مضامین بیان فرمائے ہیں کہ مشورہ کا وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم فرمانے سے پہلے ہے، آپ کے عزم فرمانے کے بعد مشورہ کا وقت ختم ہو جاتا ہے، اسی ترجمہ میں امام بخاری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر خلفاء کے مشورہ کے درمیان فرق بھی واضح کر دیا ہے، اور بھی اس ترجمہ میں مزید فوائد ہیں، ہم نے یہاں سہولت کے پیش نظر ان تمام افادات پر الگ الگ نمبر ڈال دئے ہیں تاکہ اس موضوع سے متعلق امام بخاری کے افادات کا جزیرہ کیا جاسکے۔ امام بخاری فرماتے ہیں۔

قرآن کریم نے اقویوں کے لئے قانون مقرر کیا ہے کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں گے اور رسول کیلئے بھی مشورہ کا حکم ہے لیکن یہ مشورہ

— باب قول اللہ وامرہم
شوریٰ بینہم و شادرہم
فی الامر و ان المشادرة قبل
العزم والتبیین لقوله

کا حکم رسول کے عزم کرنے سے پہلے اور خدا کی جانب سے صورت حال کی وضاحت سے پہلے ہے کیونکہ اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب آپ عزم کر لیں تو انہر پر بول کریں چنانچہ اگر سبیر علیہ السلام عزم فرمائی تو اب مشورہ دینا خدا اور رسول کے سامنے تقدم اور پیش دستی شمار ہو گا جس کی اجازت نہیں۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزڈہ اصر کے موقع پر مدینہ طیبہ میں رہ کر یا باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے سلسلے میں مشورہ فرمایا تو صحابہ نے باہر نکلنے کا مشورہ دیا پھر جب آپ نے زرہ پہن لی اور عزم فرمایا تو صحابہ نے عرض کیا کہ آپ مدینہ میں قیام فرمائیں لیکن عزم فرمانے کے بعد آپ نے ان کے اس مشورے کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ نبی کی شان سے بعید ہے کہ زرہ پہن لینے کے بعد اس کو حکم خدا کے بغیر اتار دے۔

فَإِذَا عَزَّمْتْ فَتُوكِلْ
عَلَى اللَّهِ فَإِذَا عَزَّمْ
الرَّسُولُ لَمْ يُكِنْ لِبْشَرَ
الْقَدْمُ عَلَى اللَّهِ وَرَسُولُهُ

— دشادر النبی
صلی اللہ علیہ وسلم
اصحابہ یوم احد
فِ الْمَقَامِ وَالخَرْدُج
فَرَأَوَ اللَّهَ الْخَرْدُجَ فَلَمَّا
لَبِسَ لَأْمَتَهُ عَزْمَ قَالُوا
أَفَرْفَلُو يَمِيلُ إِلَيْهِ بَعْدَ
الْعَزْمِ وَقَالَ لَا يَنْبَغِي لِلْبَنِي
لَبِسَ لَأْمَتَهُ فَيَضْعُهَا
حَتَّى يَحْكُمَ اللَّهُ۔

اسی طرح حضرت عائشہ پر تہمت طرازی کے واقعہ میں آپ نے حضرت ملیٰ اور حضرت اسماء سے مشورہ کیا، انکے مشوروں کو بغور سنائیکن جب قرآن نازل ہو گیا اور حکم واضح ہو گیا تو اپنے تہمت لگانے والوں پر حد جاری فرمائی اور مشورہ دینے والوں کے اختلاف رکھ کو اہمیت نہیں دی بلکہ امر خداوندی کے مطابق حکم نافذ کر دیا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء کا بھی یہ معمول تھا کہ وہ مباح چیزوں میں امت کے امانت دار اہل علم سے مشورہ کیا کرتے تھے تاکہ شریعت کے عطا کردہ یہ سر پر عمل کر سکیں پھر جب مشورہ میں کتاب و سنت کا کوئی حکم واضح ہو جاتا تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدار کے مطابق کسی دوسری چیز کو اختیار نہ فرلتے اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے زکوہ سے قتال کا ارادہ فرمایا تو حضرت عمر بن کعبہ

— وشاور علیت اور اسامہ فیمار میں بہ اہل الافک عائشہ فسم منہما حقی نزل القرآن بخشد الرامین ولهم یلتفت الی تنازعہم ولکن حکم بما امرہ (للہ)۔

— وَكَانَتِ الْأُمَّةُ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتَشِرُونَ رَبِّ الْأَمْنَاءِ مِنْ أَهْلِ الْعِلْمِ فِي الْأُمُورِ الْمَبْاحَةِ يَأْخُذُونَ بِآبَا سَهْلِهَا فَإِذَا وَضَعُمُوا كَتَابُ وَالسَّنَةَ لَمْ يَتَعَدُوا إِلَى غَيْرِهَا افْتَدَاهُ بِالنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

— وَسَأَلَ أَبُوبَكْرَ قَاتَلَ مَنْ مِنْ النَّبِيِّ فَقَالَ عَمَّرٌ

کہ اپ کیسے ان لوگوں سے قتل کر سکتے
ہیں جبکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد
فرمائے ہیں کہ مجھے لوگوں سے قاتل کا
حکم دیا گیا ہے تا اینکہ وہ کلمۃ توحید کا اقرار
کر لیں تو انہوں نے مجھ سے اپنی جان
و مال کو محفوظ کر لیا الایہ کر جان و مال کا
کوئی حق باقی رہ جائے اور ان سے محابیہ
اللہ کرے گا، تا حضرت ابو بکرؓ نے جواب
دیا کہ بخدا! میں ان لوگوں سے ضرور
قتل کروں گا جنہوں نے ان چیزوں کے
حکم میں فرق کر دیا ہے جن میں حضور صلی
اللہ علیہ وسلم نے فرق نہیں کیا تھا، پھر
حضرت عمرؓ کا یہ بھی ان کے موافق ہو گئی
یہاں حضرت ابو بکرؓ نے کوئی مشروہ قبول
نہیں کیا کیونکہ ان کے پاس نماز اور زکوٰۃ
کے درمیان فرق کرنے والوں کے بارے
میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود
تھا اور دین و احکام میں تبدیلی کرنے
والوں کے بارے میں حکم موجود تھا کیونکہ

کیف تقاتل الناس وقد
قال رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ أَمْرَتُ أَنْ تَقْاتِلُ النَّاسَ
حَتَّى يَقُولُوا إِلَّا إِلَهُ إِلَّا إِلَهُ فَإِذَا
قَاتَلُوكُمُ الَّذِينَ لَا إِلَهَ إِلَّا إِلَهُكُمْ عَصَمُوا
مِنْ دِمَاءِ هُرُودٍ وَمَا وَاهَمُوا إِلَّا
بِحَقِّهَا وَحْسَابُهُمْ عَلَى اللَّهِ
نَفَّالِ أَبُوبَكْرٌ وَاللَّهُ لَا يَقْاتِلُ
مِنْ فَرْقَ بَيْنِ مَا جَمِعَ
رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ شَوَّهُ تَابِعَهُ بَعْدَ
عُمُرٍ فَلَمْ يَلْتَفِتْ أَبُوبَكْرٌ
إِلَى مَشْوَرَةٍ إِذَا كَانَ
عِنْدَهُ حَكْمُ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى
اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الَّذِينَ
فَرَقُوا بَيْنَ الصَّلَاةِ وَ
النِّسَكَةِ وَأَدْوَاتِ تَبْدِيلِ
الدِّينِ وَاحْكَامِهِ
وَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ

دسلو من بدل دینہ فاقتلوا
حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے
کہ جو اپنادین تبدیل کرے اسکو قتل کرو
اور حضرت عمرؓ کے اصحاب مسحورہ عملہ
ہوتے تھے، وہ عمر رسیدہ ہوں یا جوان ہو
اور حضرت عمر خدا کی کتاب کے سامنے
پڑانداز ہونے والے خلیفہ تھے۔

— وحیان القراء
اصحاب مسحورہ عمر کھولا کافوا
او شبانا وحیان و قافا عند
كتاب اللہ عزوجل (دیکھاری شریف ۲۹۶)

امام بخاریؓ کے ترجمہ الباب کے مضمون

امام بخاریؓ کے اس ترجمہ الbab سے کئی باتیں ثابت ہوتی ہیں سب سے پہلے جز میں امام بخاری نے یہ واضح فرمایا ہے کہ مسحورے کیلئے قرآن کریم میں دو آیتیں ہیں ایک آیت کا تعلق امت سے ہے کیونکہ اس آیت میں امر ہم شوری فرمایا گیا ہے اور ہم کی ضمیر مونین کی طرف لوٹ رہی ہے، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ قرآن کریم نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے تمام اہم معاملات مسحورے کے ذریعے طے کریں، اسی آیت کو امام بخاری نے مقدم ذکر فرمایا ہے، اور دوسری آیت کا تعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے کیونکہ اس دوسری آیت میں شاورہ ہم صیغہ امر کے مخاطب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، اس آیت کو امام بخاری نے موخر ذکر کیا ہے۔

پھر امام بخاری رحمہ اللہ نے واضح کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے

جو مشورہ کا حکم ہے وہ بھی پیغمبر علیہ السلام کے عزم فرمان سے پہلے اور حکم خداوندی کی وضاحت سے پہلے ہے، اگر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام مشورے کے بعد کوئی عزم فرما لیں یا مشورے کے دوران وحی جلی یا وحی خفی سے صورت حال واضح ہو جائے تو مشورہ کی نہ صرف یہ کہ ضرورت ہنسی رہتی بلکہ مشورہ جائز ہی ہنسی رہتا، وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کے بعد مشورہ کی ضرورت کا باقی نہ رہنا تو ظاہر ہے اس لئے امام بخاری نے اس پرستعل کوئی دلیل قائم ہنسی کی، البته پیغمبر علیہ السلام کے عزم کے بعد مشورہ جائز ہونے کو امام بخاری سورہ حجرات کی آیت۔

یا ایها الذین امنوا لاقدوا اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسول بین یہ دی (اللہ) در رسول (سورہ مجہات آیت) کے سامنے پیش قدی کی جرأت نہ کرو، سے ثابت فرماتے ہیں، یا یہ کہنا چاہئے کہ امام بخاری وحی کے ذریعہ وضاحت، اور عزم کے قائم ہونے کے بعد، دونوں ہی صورتوں میں مشورہ جائز ہونے کو اس آیت ہی سے ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس وحی آجائے یا آپ عزم فرما لیں تو اب مشورہ دینا، خدا اور رسول کے سامنے پیش قدی کی جرأت کرنا ہے جس کی قرآن کریم میں ممانعت ہے، امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ مضبوط استدلال بتلارہا ہے کہ وہ فاذاعتمت کو ان معنی میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت شمار کر رہے ہیں کیونکہ اگر معاملہ کسی دوسرے امام یا امیر کا ہو تو اس کے عزم کے باوجود مشورہ دینے میں خدا اور رسول کے مقابلے پر پیش قدی کی جرأت کا الزام نہیں ہوتا دوسرے جز میں امام بخاری نے پیغمبر علیہ السلام کے عزم فرما لینے کے بعد مشورہ کی منفوع پیش قدی کی جرأت کرنے کی مثال دی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

نے غزوہ احمد کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا کہ مدینہ کے اندر رہ کر دشمن کا انتظار کرنا چاہئے یا باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہئے؟ صحابہ کرام کی اکثریت نے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کی رائے دی، اس کی تفصیل معلوم ہو چکی ہے کہ یہ آپ کی رائے کے خلاف تھا، لیکن آپ نے اکثریت کی رائے کے مطابق جب عزم فرمایا تو اب صحابہ نے عرض کیا کہ آپ اپنی رائے کے مطابق مدینہ میں مقیم رہ کر مقابلہ فرمائیں، تو آپ نے عزم فرمانے کے بعد اس درخواست پر مشورہ پر توجہ نہیں دی بلکہ یہ فرمایا کہ پیغمبر کیلئے منسخ ہونے کے بعد تھیا کھوں دینا درست نہیں ہے، گویا آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ مشورے کی منزل گذر چکی ہے عزم کرنے کے بعد مشورہ قبول نہیں کیا جائیگا۔

تیسرا حز میں امام بخاری نے تبیین وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کی مثال پیش کی ہے کہ جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر الزام کا افسوسناک واقعہ پیش آیا تو آپ نے اس سلسلہ میں حضرت اسامہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مشورہ فرمایا، ابھی آپ ان حضرات کے مشوروں پر غور ہی فزار ہے تھے کہ قرآن کریم حضرت عائشہؓ کی برات متعلق نازل ہو گیا تو آپ نے مشورہ کے اندر پائی جانے والی متفاہداتوں سے صرف نظر فرمایا کہ الزام تراشی کرنے والوں پر حد قذف جاری فرمادی معلوم ہوا کہ زیر مشورہ مستلا متعلق اگر حکم خدادندی کا نزول ہو جائے تو مشورہ ختم ہو جائیگا اور حکم خدادندی کے مطابق عمل کرنا ضروری ہو گا۔

یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ یہ صورت بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پساتھ خاص ہے کیونکہ مشورہ کے دوران حکم خدادندی کا نزول پیغمبر علیہ السلام پر ہی ممکن ہے آپ کے بعد یہ صورت پیش نہیں آئے گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی صورت میں قرآن و

حدیث کے حکم کی طرف ڈہن مبندوں نہ ہونے کے سبب مشورہ کیا جائے ہوا دراہل مشورہ میں سے کسی کا ذہن ادھر منتقل ہو جائے تو حکم خدا یا حکم رسول سامنے آئی کے بعد مشورہ ختم ہو جائیگا جیسے سقیفہ بنو ساعدہ میں خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں ہماجرین والنصار مشورہ کے لئے جمع ہوئے، انصار بھی اپنے آپ کو خلافت کا مستحق سمجھ رہے تھے لیکن جب ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد الائمه من قویش سنایا تو انصار نے فوراً اس حکم کو قبول فرمایا

چوتھے جز میں امام بخاری، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد، خلافت راشدہ میں مشورہ کی نوعیت کو واضح فرمائے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلفاء راشدین کا معمول یہ رہا کہ وہ غیر منصوص اور مباح معاملات میں دیانت و امانت کے حامل اہل علم اکابر سے مشورہ کرتے تھے تاکہ ان معاملات میں شریعت کی عطا کردہ یسر و سہولت کی روشن کو اختیار کر سکیں، چنانچہ مشورہ کے دوران جب کتاب و سنت کا حکم واضح طور پر سامنے آجاتا تو اس کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کر لیتے اور کسی دوسری جانب قدم نہ بڑھاتے کیونکہ ان کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی اسوہ تھا۔

اس چوتھے جز میں خلفاء راشدین کا معمول بیان کرتے ہوئے امام بخاری رحمہ اللہ نے عزم کا تذکرہ نہیں فرمایا، گویا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین یا ان کے بعد آنے والے امام اور امیر کے بارے میں امام بخاری کی رائے یہ نہیں ہے کہ وہ اگر مشورہ کے دوران یا مشورہ کے بعد کوئی عزم کر لیں تو وہاں بھی مشورہ دینے والوں کو پیش قدمی کی اجازت نہ ہوگی۔ بلکہ یہاں امام بخاری کے

نزویک صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال اگر مباح امور سے تعلق رکھتی ہے تو اب اہل مشورہ ماجعل علیکو فی الدین من حرج اور الدین یسر کی عام تسبیلات کے مطابق تبادلہ خیال کریں گے اور کوشش کریں گے کہ کتاب و سنت سے اس تازہ صورت حال کا حکم معلوم کریں، اور پروردگار عالم نے چون کوئی دین اسلام کی تکمیل کا اعلان فرمادیا ہے اس لئے ضرور کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل ہو جائے گی جیسا کہ خلافت راشدہ کے دور میں ہوتا رہا ہے۔

گویا امام بخاری کے نزویک مشورہ طلب امور میں فیصلہ کی صورت امیر کا عزم نہیں، کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے، البتہ یہ ضرور ہے کہ امام بخاری نے یہاں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کا طریقہ بیان نہیں فرمایا، نہیں اس کا موقع تھا بلکہ پچ یوچھے تو امام بخاری کے تراجم ابواب کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کی تفصیلات ہی پر مشتمل ہیں کہ وہ ایک ایک روایت سے دس دس اور بیس میں سائل کا استنباط فرماتے ہیں اور یہ کام ائمہ مجتہدین نے پوری بیدار مغزی سے انجام دیدیا ہے کہ کس طرح تازہ صورت حال کو قرآن و حدیث کے سامنے پیش کر کے حکم معلوم کیا جاتا ہے، امام بخاری نے اس کی تفصیل تو نہیں کی البتہ انہوں نے اس ترجمہ کے پانچویں جز میں تازہ صورت حال میں حکم معلوم کرنے کی ایک مثال پیش کی ہے۔

اس پانچویں جز میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں ان عین زکوٰۃ کا مسئلہ پیش آیا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف یہ تھا کہ ان کے مقابلہ میں جہاد کرنا چاہئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا موقف و مراجحت تھا، حضرت عمر نے اپنے نقطہ نظر پر رسول کرم علیہ السلام کی اس حدیث

سے استدلال کیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تمام انسانوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ کلمہ توحید کا اقرار کر لیں، جب وہ اقرار کر لیں تو اپنی جان وال کو محفوظ کریا گویا کلمہ توحید کے اقرار کے بعد کسی انسان کے جان وال سے تعرض جائز نہیں اور ان کے مقابلہ پر جہاد و قتال کی گنجائش نہیں، لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دو چیزوں یعنی نماز اور زکوٰۃ کو ایک جگہ جمع فرمایا ہے میں ان دونوں کے درمیان فرق کرنے والوں سے ضرور قتال کر دوں گا، پھر حضرت ابو بکر صدیق کے اس نقطہ نظر سے حضرت عمر بھی متفق ہو گئے، امام بخاری فرماتے ہیں کہ چونکہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس صلوٰۃ و زکوٰۃ کے درمیان فرق کرنے والوں کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم موجود تھا اس لئے حکم رسالت کے سامنے انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورے کو اہمیت نہیں دی، کیونکہ ان یعنی زکوٰۃ دین اور اس کے احکام میں تبدیلی پا ہوتے تھے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرما چکے ہیں کہ جو اپنے دین تبدیل کرے اس کو قتل کر دیا جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ما نعین زکوٰۃ کے بارے میں تفصیل خلفاء راشدین کے بارے میں ذکر کردہ طرز عمل کی مثال میں پیش کی ہے۔ خلفاء راشدین کا طرز عمل یہ رہا ہے کہ وہ مشورے میں کتاب و سنت کی طرف رجوع کرنے کے علاوہ کوئی اور راہ اختیار نہیں فرماتے تھے، یہاں امام بخاری عزم کا ذکر نہیں کرتے، یعنی مشورے کے باب میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی تفصیل میں انہوں نے فرمایا و ان المشورة قبل العزم والتبیین کسر کار و عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں

مشورہ، آپ کے عزم فرمانے سے پیشتر، یا صورتِ حال کی وجہ علی یا اخفیٰ کے ذریعہ وضاحت سے پیشتر دیا جاسکتا ہے، اگر آپ عزم فرما لیں یا صورتِ حال وجوہ سے واضح ہو جائے تو مشورہ کی بات ختم ہو جائے گی۔

لیکن امام بخاری جب مشورے کے باب میں خلفاء راشدین کے عمل کی تفصیل کرتے ہیں تو وہاں عزم کا ذکر نہیں کرتے بلکہ صرف یہ فرماتے ہیں کہ مباحث اور غیر منصوص امور میں اہل علم سے مشورہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ شریعت کا آسان حکم معلوم ہو جائے اور فاذ اوضاع الكتاب والسنۃ لعیتعددۃ الی غیرہ یعنی جب کتاب و سنت کا حکم واضح ہو جاتا تو پھر کسی دوسری جانب قدم نہ بڑھاتے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوہ کے بارے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سلنے آنے کے بعد کسی جانب التفات نہیں فرمایا۔

جب خلفاء راشدین بھی نئے مسائل میں صرف کتاب و سنت ہی کی جانب رجوع کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو ان کے بعد آنے والے امام دامیز بھی مشورہ میں اسی کے پابند ہیں کہ اہل مشورہ سے کتاب و سنت میں پائے جانے والے حکم کی تلاش میں مدد لیں اور جب تفصیل یا اجال سے حکم جائے تو اسی کے مطابق عمل ختیار کریں چھٹے جزوں میں امام بخاری نے ارباب مشورہ کے اوصاف، اور مشورہ لینے والے کے آداب کی طرف توجہ کی ہے، فرمایا ہے کہ حضرت عمرہ کی شوری میں عمر کی قید نہیں تھی بلکہ وہ قرآن کریم کا زیادہ علم رکھنے والوں کو شوری کے لئے منتخب فرماتے تھے اور خود ان کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ قرآن کریم کے احکام کے سامنے سراسری ختم فرماتے رہے۔

امام بخاری کے ترجمہ اباب میں دئے گئے اجزاء پر تفصیلی کلام اس لئے کیا گیا تاکہ
یہ واضح ہو جائے کہ مشورے کے بارے میں امت اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے
درمیان فرق ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعہ وضاحت یا عزم قائم
فرمانے کے بعد مشورہ نہیں فراہیں گے، البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امت
اگر کسی تازہ اور نئی صورت حال سے دوچار ہو جائے تو اس کے لئے قرآن و حدیث
ہی کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، اس کے علاوہ ان کے لئے کوئی دوسری راہ نہیں
ہے۔ واللہ اعلم۔

کتاب و سنت کی اطراف مراجعت کا طریقہ

گویا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو حیثیت اور طاقت آپ
کی ذات کو حاصل تھی آپ کے بعد وہی طاقت اب سنت رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کو حاصل ہے، قرآن کریم میں بھی یہ بات تصریح کے ساتھ موجود ہے کہ
عام حالات میں بھی اور اختلاف رائے کی صورت میں بھی قرآن کریم اور سنت
رسول کی طرف رجوع کرنا ضروری ہے، ارشاد باری ہے۔

اے ایمان والو! اللہ کا حکم باذ و اور ان	یا ایها الذین آمنوا اطیعوا اللہ
او لو الامر کا جو تم میں سے ہوں، پھر اگر	و اطیعوا الرسول و اولی الامر
کسی چیز میں او لو الامر سے اختلاف ہو جائے	منکوف ان تباذ شتم فی شی
تو اس سلسلے میں اللہ اور رسول کی طرف	فرد وہ الى اللہ والرسول

رجوع کرو اگر تم اشد پر اور قیامت کے
ان کنتو تو مون با اللہ والیوم الاخر، ذلك خير و احسن تاویلا .
دن پر یقین رکھتے ہو، یہ بات بہت
آچھی ہے اور اس کا انجام بہت بہتر ہے
(سورۃ النازہ، آیت ۵۹)

آیت پاک میں حکم دیا جا رہا ہے کہ اہل ایمان اللہ کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کریں اور اگر کسی معاملہ میں اختلاف کی صورت پیدا ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی طرف رجوع کریں، ظاہر ہے کہ یہ اختلاف اللہ اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ہو گا بلکہ اختلاف صرف اولو الامر سے ہو گا، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر کسی معاملہ میں خفا ہو، یا حکم خداوندی اور حکم رسالت کی جانب ذہن کی رسائی نہ ہو یا صورت حال واقعہ بالکل نئی ہو اور اس کا حکم منصوص نہ ہو اور اختلاف کی نوبت آجائے تو یہ اختلاف کسی بھی صورت میں ہو اس کا حل جو صرف ایک ہی ہے کہ اس پیش آمدہ صورت حال میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی طرف رجوع کیا جائے۔

امام ابو بکر جعفر صافی رحمہم اللہ کا ارشاد

امام ابو بکر جعفر صافی، اس آیت کے تحت اپنی مشہور تفسیر احکام القرآن میں لکھتے ہیں۔

کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی
والرَّدُّ إلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ
یکون من وجہین احمدہا دو صورتیں ہیں، ایک صورت تو ہے کہ

اس حکم کی طرف مراجعت کی جائے جو لفظ
و معنی دونوں حیثیت سے نص میں ذکر ہو
دوسری صورت یہ ہیکہ قیاس اور نظائر کے
طريقوں میں کسی طریقہ کے استعمال
اور دلالت کی کسی قسم کے طور پر کتاب و
سنۃ کی طرف مراجعت کی جائے گا۔ واللہ
اور والی الرسول کے الفاظ کا عالم و دونوں
ہی صورتوں کو شامل ہے اسکے گھر کسی
معاملہ میں اختلاف ہو تو ہمارے لئے کتاب
و سنۃ کی نصوص کی طرف مراجعت ضروری
ہے اگر اختلافی مسئلہ کا حکم کتاب و سنۃ
کی نصوص میں مل جائے تو بہتر ہے اور اگر
نص میں نہ لے تو کتاب و سنۃ کی نظر کی
طرف مراجعت ضروری ہو گی اسکے کہیں
ہر صورت حال میں کتاب و سنۃ ہی کی طرف
مراجعة کا حکم دیا گیا ہے۔

الى المخصوص عليه المذکور باسعه
و معناه . والثالث في الرد اليهما
من جهة الدоказة عليه واعتباره
به من طريق القياس والنظائر
وعلوم اللغتين ينتظر
الامرین جميعاً فوجب اذ
تنازعنا في شيء الرد الى
نص الكتاب والسنة ان
وجدنا المتنازع فيه
منصوصاً على حكمه في
الكتاب والسنة وإن لم يوجد
فيه نصاً منهما وجوب ردّه
إلى نظيره منهما لأن
ما مورون بالرد في محل حال
(أحكام القرآن ۷۶۳)

امام ابو بکر جعاص المتوفی ۲۳۴ھ نے فرمایا کہ کتاب و سنۃ کی طرف مراجعت
کی دو صورتیں ہیں پہلی صورت یہ ہے کہ خود اس مسئلہ ہی سے متعلق کتاب و سنۃ
میں تصریح پائی جاتی ہو، اس صورت میں ظاہر ہے کہ حکم خداوندی یا حکم رسالت ہی کی

میں ضروری ہوگی، حکم صریح نہ ہو تو اسی صورت میں بھی کتاب و سنت ہی کی طرف مراجعت کی جائے گی مگر اس کا طریقہ یہ ہو گا کہ قرآن فہمی کے معتبر طریقوں میں سے کسی طریقہ کے مطابق استدلال کیا جائیگا یا قیاس کے ذریعہ حکم معلوم کیا جائیگا، امام ابو بکر نے اس بجھ پر دونوں استعمال کئے ہیں ایک من جملہ الدلالۃ علیہ جس کے معنی یہ ہیں کہ دو جوہ استدلال میں سے کسی معتبر طریقہ استدلال کی بنیاد پر حکم معلوم کیا جائے، اور دوسر الفاظ ہے داعتبارہ بہ من طریق القياس والانتظائر کر حکم منصوص کی علت کا استخراج کر کے، حکم کو علت کے ساتھ متعدد کیا جائے، اما ابو بکر فرماتے ہیں کہ کتاب و سنت کی طرف ہر حال میں مراجعت کا حکم عام، ان دونوں ہی صورتوں کو شامل ہے، اس لئے اگر کسی تازہ صورت حال میں اختلاف واقع ہو تو کتاب و سنت ہی کی جانب رجوع کرنا ضروری ہو گا، اگر مسئلہ کتاب اشیاء سنت رسول اللہ میں منصوص مل گیا تو اسکے مطابق عمل کیا جائے گا، اور اگر کتاب و سنت میں صریح نص نہیں مل سکی تو کتاب و سنت کا حکام کو قابلِ عتماد طریقوں کے مطابق متعدد کیا جائے گا، اس کے علاوہ کوئی اور صورت اختیار نہیں کی جائے گی، کیونکہ ہمیں ہر حال میں کتاب و سنت ہی کی طرف رجوع کا حکم دیا گیا ہے۔

مُهْسِرْ قَرْآنُ قَاضِيٌّ بِيَضَاوِيٌّ كَا إِرشَادٌ

اس موضوع سے متعلق قاضی یضاوی کا تفسیری نوٹ بھی ملاحظہ فرمایا جائے وہ بھی اسراً آیت کے تحت لکھتے ہیں۔

فَانْتَنَزَ عَنْهُ اسْتَدَرَ
او لوا الامر منکر في شيء من
امور الدين فرداً وراجعوا
فيه الى الله المستعان
والرسول بالسؤال عنه في
زمانه والمراجعة الى
سنة بعدها۔

(بیضاوی سورۃ النازل پڑھنے)

او لوا الامر سے اختلاف رائے کی صورت میں اللہ اور رسول کی طرف مراجعت کا طریقہ کیا ہے، اس کو قاضی بیضاوی نے سوال وجواب کے انداز میں بیان کیا ہے۔

اس آیت سے منکرین قیاس نے استدلال کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اختلافی معاملات میں صرف اللہ اور رسول کی طرف مراجعت کا حکم دیا ہے قیاس کا نہیں، مگر اس کا جواب یہ ہے کہ اختلافی چیزوں میں منصوص علیہ کی طرف مراجعت کا طریقہ ایک نظر پر دوسری نظر کا قیاس کرنا یا تو امر کلیہ پر بنانا کرنا ہے، اور اسی کو قیاس دیوبندی ذلك الامر به

وأستدل به منکروالقياس
وفالوا انه تعالى اوجب سداد
المختلف الى الكتاب والسنة
دون القياس واجيب بان
رد المخالف المنصور عليه
انما يكون بالتمثيل والبناء
عليه وهو القياس

وبيتد ذلك الامر به

کہتے ہیں اور اس کی تائید اس طرح ہوتی ہے کہ ائمہ اور رسول کی اطاعت کے بعد مستقل اس مراجعت کا حکم دیا گیا ہے جس سے مجھا جا سکتا ہے کہ احکام تین طرح کے ہیں ایک وہ جو کتاب اللہ سے ثابت ہوں دوسرے وہ جو سنت سے ثابت ہوں اور تیسرا وہ جو قیاس کے طور پر کتاب و سنت کی طرف مراجعت سے ثابت ہو۔

بعد الامر بطاعة الله تعالى وطاعة الرسول صلی الله علیہ وسلم فانه يدل على ان الاحكام ثلاثة مثبتة باكتاب ومثبتة بالسنة ومثبتة بالرد اليه مما على درجہ القیاس۔

(بیضاوی جلد دوم سورۃ النساء)

اس عبارت میں قاضی بیضاوی نے اختلافی معاملات میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کا جو طریقہ بیان کیا ہے، اس میں دو لفظ اس تعالیٰ کے ہیں ایک بالقییل اور دوسرے والبناء علیہ، پہلے لفظ بالقییل کی مراد وہی ہے جو احکام القرآن میں امام ابو بکر جصاص نے وجہ ردة الی نظیرہ منہا میں بیان کی ہے یعنی یہ دیکھا جائیگا کہ کتاب ائمہ یا سنت رسول ائمہ میں اس کی کوئی نظیری ملتی ہے یا نہیں، اگر نظیری ملتی ہے تو ضروری ہو گا کہ کتاب و سنت کا حکم اس سلسلے میں قبول کر کے اختلاف ختم کر دیا جائے دوسرے لفظ والبناء علیہ میں قاضی بیضاوی نے ایک اور بات کہی ہے جو امام ابو بکر جصاص کے کلام میں مذکور نہیں تھی، اس کا مفہوم یہ ہے کہ اختلافی مسائل کی بناء قرآن و حدیث پر کی جائے بنائی دوسریں میں ایک حکم منصوص کی علت کا استخراج کر کے، علت کا تعذر کرنا، اور جہاں علت

پائی جائے وہاں حکم ثابت کر دینا، دوسرے یہ کہ قرآن و حدیث میں جو کلی قواعد اور اصولی فضایل بے بیان کئے گئے ہیں، اختلافی مسائل کو ان قواعد میں سے کسی کے ذیل میں لا کر اس کا حکم معلوم کرنا۔

امام ابو بکر اور قاضی یوسف اوسی کے ارشادات سے یہ بات بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اختلافی معاملات میں یعنی جنی معاملات میں خود اولو الامر کے درمیان اختلاف ہو جائے یا عوام اور اولو الامر کے درمیان، یا امیر اور اولو الامر کے درمیان اختلاف ہو جائے وہاں اولو الامر یا امیر کی رائے کی جانب مراجعت کی کوئی بُدایت نہیں ہے بلکہ ان تمام معاملات میں صرف ایک ہی حکم ہے کہ کتاب و سنت کی جانب رجوع کیا جائے۔

اس کی عملی صورت یہ ہو گی کہ ارباب حل و عقد یا اہل مشورہ ٹھیکیں اور طے کریں کہ اس غیر منصوص جزئیہ کو قرآن و حدیث کی روشنی میں کیسے حل کیا جائے، واضح رہے کہ قرآن و حدیث کی روشنی میں انکہ مجتہدین یا ان کے مقلدین نے جو جزئیات قلم بند فرا دئے ہیں ان کی طرف مراجعت بھی بلا شک کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہی کہلاتی ہے، اور ان حضرات کا انت مرحومہ پر احسان ہے کہ انہوں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غیر منصوص جزئیات کا حکم کتاب و سنت کی روشنی میں یہاں فرمایا کہ اسلام کی بُدایت کا منحہ بولتا ثبوت پیش کر دیا ہے۔

علامہ شاطریؒ کے ارشادات

اختلافی مسائل میں قرآن و سنت، یا قرآن و سنت کی روشنی میں مرتب کردہ فقیہ جزئیات ہی کی طرفہ مراجعت ضروری ہے اور اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہو گا کہ اسکے علاوہ کوئی اور راہ اختیار کرنے کی مسلمانوں کو ضرورت ہی نہیں، اس موضوع پر علامہ شاطری الموافقات میں لکھتے ہیں۔

قد مکلت قواعد الشریعة في
القرآن والسنة فلو يختلف عنها
شئ ولا استقرار عبدين ذلك
(المواقفات بیہم)

یعنی قرآن و حدیث میں ہر ضرورت کی تکمیل کر دی گئی ہے، اس مضمون کو مثال سے واضح کرنے کیلئے علامہ شاطری نے مزید چند لاماؤں کے بعد لکھا ہے
فإ القرآن إن نص على بعض
التفاصيل كالتيم والقصر فإذا
والآفال النصوص على رفع
العرج فيه كافية ولله مجتهد
اجراء القاعدة

والترخص بحسبہا۔

(الموافقات ۲۶)

گیا ہے ان سے حکم علوم کیا جائے اور
محمد کیلئے جائز ہو گا کہ قاعدة کیا اجراء
کر کے رخصت پر عمل کرنیکا حکم بیان کرے

اس عبارت میں مضمون بالکل واضح ہے کہ تم، قصر اور افطار کے بارے
میں جو تفصیلات منصوص ہیں اگر ان سے صورتِ مسئلہ میں حکم واضح نہ ہو تو ما
جعل علیکم من حوجہ کا قاعدة کیلئے جاری کر کے رخصت کے احکام
بیان کئے جائیں گے، البتہ یہ کام عوام یا عام علماء کا نہیں ہے، بلکہ اس اجراء
کے لئے قوتِ اجتہاد کی ضرورت ہے، قواعد کیلئے پر جزئیات کی تطبیق کے سلسلے
میں علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے الاعتصام میں اس سے زیادہ تفصیلی کلام
کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

بے شک اللہ تعالیٰ نے شریعت کو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس
طرح نازل کیا ہے کہ اس میں ہر وجوہیز
بیان کر دی گئی ہے جس کی مخلوق کو،
خدا کی بیان فرمودہ ذمہ داریوں کی
انجام دہی اور ارشد کی مقرر فرمودہ
عبادتوں کی ادائیگی میں ضرورت تھی
سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات
بھی اس وقت تک نہیں تھی جب تک

ان الله انزل الشريعة على
رسوله صلى الله عليه وسلم
فيها بيان كل شيء يحتاج
إليه الخلق في تكاليفهم
التي أمروا بها و تبعد انهم
التي طووها في اعتقادهم
ولو عمت رسول الله صلى
الله عليه وسلم حتى
يحمل الدين بشهادة

دین مکمل نہیں ہو گیا، خود اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت دی ہے، یعنیکہ ارشاد فرمایا ہے کہ: آج میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا، اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کے طور پر قبول کرنے سے میں راضی ہوں۔ اب اگر کوئی شخص یہ گمان کرتا ہے کہ دین میں کوئی باتی رہ گئی ہے تو وہ باری تعالیٰ کے تکمیل دین کے ارشاد کی تکذیب کر رہا ہے۔

تکمیل دین کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو فرائض منصبی کی ادائیگی اور عبادات کی بجا آوری میں جن احکام کی ضرورت تھی وہ سب مکمل طور پر نازل کر دے گئے ہیں، اگر کوئی یہ خیال کرتا ہے کہ ابھی کچھ بیان کرنا باقی ہے تو وہ گویا ابیوم امکلت لکم کا منکر ہے۔

اس کے بعد علامہ شاطی نے ایک سوال انٹھایا ہے کہ تازہ واقعات اور نئے مسائل کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ منصوص نہیں ہیں اور کتنے ہی اجتہادی مسائل ایسے دکھلائے جاسکتے ہیں جن میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی نصوص میں حکم نہیں ہے تو کیسے یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان فردریات کی حد تک تمام چیزوں کا بیان شریعت میں ہو چکا ہے؟ لیکن

(الله تعالیٰ بذ لف حجت
قال تعالیٰ (الیوم امکلت
لکو دینکو و اتمت
علیکو تعصی و راضیت
لکو الاسلام دینا)
فعل من زعماً انه
بق في الدين شفاعة
فقد كذب بقوله
(الیوم امکلت لکو دینکو)

(الاعظام ۲۵)

اس کا جواب دیتے ہیں۔

و ان قولہ تعالیٰ دالیوم
امکلت لکو دینکو اف
اعتبرت فیها الجزئیات
من المسائل والنوازل فھو
کا اراد تحر و لکن المراد
کلیاتھا، فلو بقى للدین
قاعدۃ بحاجة اليها
فی الضروریات والعلجات
او التكمیلات الا وقد
بینت غایة البيان
نعم و بقى تنزیل الجزئیات
على تلك الصلیات
موھو لا الى نظر المجهود

موقوف ہے

اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ غیر منصوص معاملات میں امراء کے عزم پر محول کرنے
کا مضمون کہیں نہیں ہے، بلکہ اولو الامر سے اختلاف پیش آجائے کی صورت میں
امام ابو بکر جعفرا ص، قاضی بیضاوی اور علامہ شاطبی کی عبارتوں سے یہ
حقیقت ثابت ہوئی کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت کے ملاude اور کوئی

حل نہیں ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ مراجعت کا یہ عمل ان اہل علم کے ذریعے انجام پائے جنہیں مراجعت کا سلیقہ ہو اور وہ شریعت کے احکام کے استنباط کا ایسا سلیقہ رکھتے ہوں جس پر اعتماد کیا جاسکے۔

کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے قابل اعتماد طریقے

مندرجہ بالا عبارتوں سے یہ حقیقت بھی واضح ہوئی کہ کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے کئی طریقے قابل اعتماد ہیں۔ مثلاً۔

① سبے بہلی اور واضح صورت تو یہ ہے کہ کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں یہ حکم صراحت کے ساتھ مل جائے، گویا ابتداءً ذہن اس کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا، لیکن جب معاملہ اہل مشورہ کے درمیان آیا تو حکم صریع کی طرف رہنا ہی ہو گئی۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ واضح الفاظ اور صریح حکم تو نہ ہو لیکن قرآن و حدیث کے الفاظ سے معنی مرادی پر دلالت کے جو معتبر طریقے قرار دئے گئے ہیں ان طریقوں میں سے کسی طریقے کے مطابق تازہ صورت حال کا حکم معلوم ہو جائے۔

③ تیسرا صورت یہ ہے کہ نہ واضح الفاظ ہوں نہ صریح حکم

ہو، نہ معتبر طریقوں میں سے کسی طریقے کے مطابق حکم معلوم ہو، لیکن قرآن و حدیث میں تازہ صورت حال کی نظریں جائے اور اس منصوص نظری کا حکم، غیر منصوص نظری میں متعدد کر دیا جائے۔

(۴) چوتھی صورت یہ ہے کہ منصوص حکم کی علت مستبط

کی جائے اور پھر اس علت کے تعداد کے ساتھ حکم متعدد کر دیا جائے۔

(۵) پانچویں صورت یہ ہے کہ اگرچہ پیش آمدہ جزئیہ کیلئے

لفظ و معنی کی صراحت نہیں ہے، معتبر طرق استدلال میں سے کسی طریقے کے ذریعہ حکم معلوم کرنے کی صورت بھی نہیں ہے، نظر بھی نہیں ہے، اور علت کا تعداد بھی نہیں ہے، لیکن قرآن یا حدیث میں جو کلی قواعد بیان کئے گئے ہیں تازہ جزئیہ کو ان عام قواعد میں سے کسی قاعدے کے تحت لاکر حکم معلوم کر دیا جائے۔

غرض یہ ہے کہ غیر منصوص معاملات میں یہ بات بالکل نہیں ہے کہ امیر کی رائے پر حکم کو محول کر دیا گیا ہو، بلکہ ایسی ہام صورتوں میں شریعت کا حکم صرف ایک ہی ہے کہ اولو الامر اور علماء کی شوریٰ میں بات رکھی جائے اور وہ مذکورہ بالا طریقوں میں سے کسی طریقے کے مطابق حکم شرعی معلوم کر دیں اور کتاب و سنت سے جو حکم ثابت ہو جائے اس کو نافذ کر دیں۔

والله اعلم

خلافتِ راشدہ میں مشورہ کی نوعیت

امام بخاری رحمہ اللہ کے ترجمہ الباب سے یہ بات واضح کی جا سکی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور امت کے دیگر امراء کے درمیان فرق ہے کیونکہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے باعثے میں یہ بات ثابت ہے کہ آپ اس وقت مشورہ فرماتے تھے جب حکم شرعی واضح نہ ہوا اور خود آپ کا عزم بھی قائم نہ ہوا ہو، آپ کا عزم تو اُنم ہو جاتا یا حکم شرعی دھی جلی یادھی خنی کے ذریعہ واضح ہو جاتا تو مشورہ قبول نہ ہیں فرماتے تھے۔ جیسا کہ مثلاً غزوہ احمد میں اپنی رائے کے خلاف لپنے خواب کی تعبیر سے صرف نظر فرماتے ہوئے اکثریت کی رائے کے مطابق عزم فرمایا تو اس کے بعد مشورہ قبول نہیں فرمایا، یا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں مشورے کے دوران، اُن کی پاک دامانی پر مستقل دھی کا نزول ہو گیا تو مشورہ ترک فرمایا کہ حکم شرعی نافذ کر دیا گی۔

لیکن آپ کے بعد خلفائے راشدین اور دیگر امراء کی تابع "عزم" کے مضمون سے خالی ہے، وہاں امام بخاری صرف یہ فرماتے ہیں کہ خلفاء اہل علم سے مشورہ فرماتے اور کتاب و سنت کا حکم واضح ہو جاتا تو اس کے مطابق ہی عدل ایام کیا جاتا، اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں تھی، امام بخاری کے اسی ترجیح اہل بنا کے مطابق، قابل اعتماد مفسروں نے فدوہ الى اللہ والرسول کے تحت یہی مضمون بیان کیا کہ تمام نزاعی معاملات کا حل، صرف کتاب و سنت کی طرف مراجعت کے ذریعہ تلاش کیا جائے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ خلافتِ راشدہ میں عملی طور پر

کیا صورت رہی؟ کیا ایسا ہوا ہے کہ خلیفہ المؤمن نے عزم کرایا تو سب نے اس کو
تسلیم کریا؟ یا ایسا ہوا ہے کہ حکم شرعی کتاب و سنت میں تلاش کیا گیا اور
اس کے مطابق عمل درآمد ہوا؟

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا عہد خلاشت

خلیفہ اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میمون میں مشورہ کی کیا نوعیت
تھی، اس کے بارے میں حضرت شاہ ولی اللہ حمد اللہ لکھتے ہیں:

عن میمون بن مهران، قال: كان
ابوبکرا اذا ورد عليه الخصم نظر
في كتاب الله، فان وجد فيه ما يقضى
بنيهـ قضـى بهـ وـ ان لـ هـ يـ كـ يـ نـ فـ
الكتـابـ وـ عـلـوـمـ رـسـوـلـ اللـهـ
صلـيـ اللـهـ عـلـيـهـ وـ سـلـمـ فـ ذـ لـكـ الـ اـ
سـنـةـ قـضـىـ بـهـ فـاـنـ اـعـيـاـهـ خـرـجـ
فـسـأـلـ مـسـلـمـيـنـ وـقـالـ : اـتـافـ
كـذـ اوـكـذـ اـفـهـلـ عـلـمـتـ اـنـ رـسـوـلـ
الـلـهـ صـلـيـ اللـهـ عـلـيـهـ وـ سـلـمـ قـضـىـ
فـ ذـ لـكـ بـقـضـاءـ ؟ فـرـبـماـ اـجـتـمـعـ
اـلـيـهـ النـفـرـ كـاهـمـ يـذـ كـرـمـنـ

میمون بن مهران سے روایت ہے کہ حضرت
ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی
مقدم پیش ہوتا تو وہ کتاب اللہ میں غور فرماتے
اگر کتاب اللہ میں اس مقدم کے لئے کوئی
چیز فیصلہ کرنے مل جاتی تو فیصلہ فرمادیتے،
اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز نہ طی اور اس
سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی
علم میں آتی تو سنت کے مطابق فیصلہ فرماتے
اگر وہاں بھی ناکام رہتے تو مختلف لوگوں
ملاقات فرماتے اور سکانوں پر چھپتے کہ میرے پاس یا
ایسا مقدم آیا ہے کیا تمہارے علم میں کہ رسول اللہ
نہ اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ فرمایا ہو، چنانچہ اس اوقات

ایسا بھی ہوا کہ ایک جماعت نے یہ تبلیغ کر لیا
ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں فیصلہ فرمایا ہے، ایسی صورت میں حضرت ابو بکر فرماتے کہ الحمد للہ ربہارے درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو محفوظ رکھتے ہیں، اگر اس طرح بھی سنت کے علم میں ناکام رہتے تو سربراورہ اور منتخب صحابہ کرام کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ کرتے جب ان سب اہل مشورہ کا کسی ایک انسان پر تفاق ہو جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرمادیتے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ قضاۓ فیقول ابو بکر الحمد للہ الذی جعل فینا من یحفظ علی نبیتنا فان اعیاہ ان یجدا فیہ سنتہ من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حکلہ جمع رؤس الناس و خیارہم فاستشارہم فاذا اجتمع رایہم علی امر قضی به (حجۃ اللہ البالغ ص ۱۳۹)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باشے میں جو تفصیل دی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انہوں نے مشورہ کر کے، اہل مشورہ کی رائے کو اہمیت نہیں دی یا اہل مشورہ ہی نے مشورہ کے بعد ان کو اختیار دے دیا کہ وہ اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں کسی کے مطابق عزم فرمائیں۔ بلکہ صورت یہ ہے کہ ہر چیز مدد مسئلے میں سب سے پہلے خود قرآن و سنت کی جانب مراجعت فرماتے ہیں، اگر ناکام رہتے ہیں تو اہل علم سے خود رجوع فرماتے ہیں کہ کسی کے پاس اس سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہو تو بیان کرے، سنت مل جاتی ہے

تو خدا کی حمد فرماتے ہیں اور سنت کی حفاظت کرنے والوں کی بہت افزائی فرماتے ہیں اور اگر اس طریقی کار میں بھی کامیاب نہیں ہوتی تو علماء و فقہاء کو مشورہ کے لئے جمع فرماتے ہیں اور مشورہ میں جب کسی رائے پر تفاق ہو جاتا ہے تو اس کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ مضمون صفت حجۃ اللہ الباخث میں نہیں ہے بلکہ ہر چند حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باسے میں یہی تفصیل ہے، اعلام المؤعین میں ہے :

"حضرت ابو بکر کے سامنے جب کوئی اہم معاملہ درپیش ہوتا تو اس کو کتاب سنت میں تلاش کرتے، اگر وہاں سے کامیابی حاصل نہ ہوتی تو امت کے بہترین افراد کو جمع کر کے ان سے رائے لیتے اور تفاق رائے سے جو طے ہو جاتا اس بر فیصلہ صادر فرمادیتے"

(اعلام المؤعین ج اصہاد مطبوع مصر بحوالہ مقام ابو منیف)

امام عبد اللہ بن عبد الرحمن دارمي المتوفى ۲۵۵ھ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باسے میں یہی مضمون نقل کیا ہے اور اس کے آخری الفاظ میں یہ فذ اذا جتمع رأيهم على أمر قضى به جب اهل مشورہ کا اتفاق رائے ہو جاتا تو س کے مطابق فیصلہ فرماتے۔

(داری ج ۱ ص ۵۵)

علام ابن حجر نے بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے باسے میں یہی مضمون بیان فرمایا ہے اور اس کے آخر میں بھی صراحت ہے کہ حضرت عمر کا طرز عمل بھی یہی تھا۔

آخر ج ابن بیهقی بسند صحیح عن میمون بن مهران قال
صحیح نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق
کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش آتا تو وہ
کان ابو بکر الصدیق اذا ورد

کتاب ائمہ میں تلاش کرتے اگر اس میں
کوئی فیصلہ مل جاتا تو وہ نافذ فرمادیتے
اور اگر کچھ نہ ملتا رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی سنت اس سلسلہ میں مل جاتی تو نافذ
فرمادیتے اور اگر کچھ نہ ملتا تو علماء ملاقات
کرتے اور مسلمانوں سے سنت کے بارے میں
معلوم کرتے، اگرابھی ناکام رہتے تو سر
بر آور دہ مسلمانوں اور علماء کو بلا کر مشورہ کرتے
اور حضرت عمر بن الخطاب بھی یہی عمل فرماتے

تھے۔

علیہ امر نظر فی کتاب اللہ فأن
و جد فیه ما یقضی به قضی بینہم
و ان علمہ من سنۃ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قضی به
و ان لم یعلو خرج فسأل مسلمین
عن السنۃ فان اعیاہ ذلک
دعاؤں مسلمین و علماء هم
واستشارہم و ان عمر بن
الخطاب کان یفعل ذلک

(فتح الباری ج ۱۳ ص ۲۸۵)

علام ابن حجر کے بیان میں مشورہ کی تفصیلات نہیں ہیں کہ اقلیت، اکثریت
اور اپنی رائے میں سے کیا چیز اختیار کی جاتی تھی، لیکن یہ بات امام بخاری کے حوالہ
سے واضح کی جا سکی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر امراء کے درمیان فرق
ہے، آپ کے یہاں عزم بھی ایک چیز ہے، لیکن دیگر امراء کے یہاں کتاب و سنت
سے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مشورہ مخفی سلطے
ہوتا تھا کہ کتاب و سنت کی رہنمائی حاصل ہو جائے اور اسی کے مطابق عمل کیا جائے
یہ نہ ہے، نہیں تھا کہ مسئلہ کے مختلف پہلو سامنے آئیں اور پھر امیر کی حیثیت ہے جناب
کو چاہیں ترجیح دیں، بلکہ یہاں یہ وضاحت کبھی مناسب ہو گی کہ عہد خلافت میں
اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ اکثریت کی بنیاد پر کبھی شاذ و نادر ہی ہوا ہے ورنہ

عام طور پر یہا ہے کہ اہل مشورہ نے کسی ایک صورت پر اتفاق کر لیا ہے جسے اصطلاح میں اجماع کہتے ہیں، تاریخ التشريع الاسلامی میں علامہ خضری بک نے، حضرت ابو بکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے مشورہ کا طریقہ ذکر کیا ہے اور وہی بات نقل کی ہے جو حجۃ الشرا بالغہ دارمی اور فتح الباری کے حوالہ سے ذکر کی گئی ہے اور اس کے بعد لکھا ہے:

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر جب کسی معاملہ میں	کان النبیخان اذ استشارة
فقہاء کی جماعت سے مشورہ فرماتے اور یہ لوگ	جماعۃ فی حکم فاششار و افیہ
اس معاملہ میں کوئی رائے دیتے تو سب لوگ	برائے تبعہ الناس ولا یسون
اس رائے کی موافقت کرتے اور کسی کو اس	لأخذ ان یغالفة و سی ابداع الاری
رائے سے اختلاف کا موقع نہ رہتا اور	بعدذا الشکل اجماعاً.
اس شکل میں رائے کے انہار کو "اجماع"	تاریخ التشريع الاسلامی } ص ۱۲۹ مطبوعہ مصر }

کہا جاتا ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عام طور پر فیصلہ کا طریقہ یہ "اجماع سکوتی" ہے کہ اہل مشورہ کو جمع کرنے کے بعد کوئی ایک بات منقح ہو گئی، عام طور پر لوگوں نے اس کے اتفاق کر لیا، اور مخالفت کسی نے نہیں کی۔

حضرت ابو بکرؓ کے عہد خلافتؓ کے چند واقعات کی صحیح تصویر

مندرجہ بالاوضاحت سے یہ بات بالکل منقح ہو جاتی ہے کہ خلافت راشدہ میں اہل مشورہ سے مشورہ کرنے کے بعد، فیصلہ کا اختصار امیر اور اس کے غرض پرپیں ہے

بلکہ صورت یہ ہے کہ امیر بھی اہل مشورہ کے ساتھ شریک مشورہ ہے، اور تلاش یہ ہے کہ اس سلسلے میں کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کامنہائی ملتی ہے، مجلسیں شوری میں جب ذہن حکم خداوندی یا حکم رسالت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے تو تمہاری ہی اہل مشورہ کا اتفاق رائے ہو جاتا ہے۔

مثلاً امیر کے عزم کا مضمون بیان کرنے والے بڑے اعتماد کے ساتھ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے ہمدرد خلافت کے دو واقعات نقل کرتے ہیں، ایک ان عین زکوٰۃ کے ساتھ قتال کا مسئلہ ہے اور دوسرا حضرت اسامہؓ کے سریہ کی روائی کا واقعہ، ان دونوں واقعات میں بڑے شدومہ کے ساتھ یہ ترجیحی ترجیحی کی جاتی ہے کہ یہ امیر کے عزم یا استبداد بالائے کے واقعات ہیں کہ اہل مشورہ کی رائے قتال کی نہیں ہے، سریہ کی روائی کی نہیں ہے، لیکن حضرت ابو بکر صدیقؓ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عزم کے مطابق فیصلہ فرمایا، لیکن بیان نظر علما کے نقطہ نظر سے یہ حقیقت کی صحیح ترجیحی نہیں ہے بلکہ واقعات کی الٹی تصویر ہے ان دونوں واقعات میں بھی یہی ہوا ہے کہ مشورہ کیا گیا اور کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی روشنی میں جو حکم شرعی معلوم ہوا، اس پر عمل درآمد کیا گیا۔ تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے صرف ایک مصنف کی عباریں پیش میں، علامہ شاطبی المواقفات میں لکھتے ہیں۔

ولما منعت العرب الزكاة حب کچھ اہل عباد نے زکوٰۃ کی آذائی
عزم ابو بکر علی قتالہم سے انکار کیا تو حضرت ابو بکر نے قتال کا ارادہ فرمایا، حضرت عمر نے ان سے فکلمہ عمر فی ذالک:

اس سلسلے میں گفتگو کی، لیکن حضرت ابو بکر
نے ترک قتال کی پیش کردہ مصلحت پر
توجه نہیں دی، کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کے
پاس ان مصلحتوں کے خلاف نص شرعی
موجود تھی، اسی طرح حضرت اسامہؓ کے
سریّہ کی واپسی کا سوال کیا تاکہ ان سے
اور ان کے رفقاء سے مریدین سے قتال
کے سلسلے میں مددی جائے تب بھی حضرت
ابو بکرؓ نے انکار فرمادیا کیونکہ ان کے پاس
سنّت رسولؐ کی صحیح دلیل موجود تھی کہ
جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نافذ فرمائچکے تھے وہ اس کو نہیں روک سکتے۔

فلو بیلتفت الی وجہ المصلحة
فی ترك القتال اذ وجد
النص الشرعی المقتضی لخلافة
وسائلاه فمرد اسامۃ
لیستعين به وبمن معه
على قتال اهل الراہ فابقی
لصحۃ الدلایل عندہ بمفع
مرد ما الفذہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

(الموافقات للاثابی ۱۹۵)

گویا عبد صدیقؓ کے آن دونوں واقعات کی صحیح تصویر یہ نہیں ہے کہ حضرت
ابو بکر صدیقؓ کی رائے اور اہل مشورہ کی رائے میں اختلاف رہا ہوا اور پھر حضرت
ابو بکرؓ نے بحیثیت امیر اپنے عزم سے ایک جانب کو ترجیح دی ہو بلکہ ان واقعات
کی صحیح تصویر یہ ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے قرآن اور حدیث کی روشنی
میں فیصلہ کیا، حقیقت حال پر مطلع نہونے کے سبب ابتداً کچھ حضرات نے دوسرا
مشورہ دیا، لیکن جب حضرت ابو بکر صدیقؓ نے اپنے موقف کی تائید میں قرآن یا حدیث
کو پیش فرمایا تو تمام عجائب کرام کا اتفاق ہو گیا

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تو بلاشبہ افضل الصحابة ہیں، ان کی زندگی واقعات کو امیر کے استبداد بالرائے کی نظر میں پیش کرنا ان کے ساتھ انصاف نہیں ہے، امام بخاری رحمہ اللہ نے بھی مانعین زکوٰۃ کے اس واقعہ کو حضرت ابو بکر صدیق کی زندگی میں کتاب و سنت کے احکام کی پیروی کی مثال میں پیش کیا ہے علامہ شاطبی حضرت ابو بکر صدیق ہی نہیں تاًم صحابہ کرام کے بارے میں تحریر فرمائیں ہیں ہم یقین رکھتے ہیں کہ صحابہ کرام نے غیر منصوص واقعات میں اپنی نظر کو، کتاب و سنت سے ثابت شدہ اصول کی جانب مراجعت ہی میں مخصر کھاتے ہیں ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ میں نے یہ فیصلہ اس لئے کیا ہے کہ میری طبیعت کا میلان یہ تھا یا یہ بات میری محبت اور رضا کے مطابق ہے اور اگر کسی نے یہ بات کہی ہوتی تو اس پر (صحابہ کی جانب ہم کے سے) شدید نکیر کی جاتی اور کہا جاتا کہ یہ حق آپ کو کہاں پہنچتا ہے کہ اللہ کے بندوں پر محض طبعی میلان اور خواہش نفس کے مطابق حکم لگائیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں

وَإِنَّا نَعْلَمُ أَنَّ الصَّحَابَةَ
حَصْرُوا نَظَرَهُمْ فِي الْوَقَايَةِ
الَّتِي لَا نَصُوصُ فِيهَا فَ
الْأَسْتِبْطَاطُ وَالرَّدُّ إِلَى مَا فَهَمُوا
مِنْ أَلَّا يَصُوبُ الشَّابِّةُ وَلَمْ
يَقُلْ أَحَدٌ مِنْهُمْ إِذْ حَكَمَ
فِي هَذَا بَكَدْنَاهُ لَاتَّ طَبَعِي
مَا لَمْ يَبْلُغْ إِذَا وَافَتْ
حُبْتَي وَرَضَانِي وَلَوْقَالْ
ذَلِكَ لَا شَتَدَ عَلَيْهِ النَّكِيرُ
وَقَيْلَ لَهُ مِنْ أَيْنَ لَكَ
إِنْ تَحْكُمُ عَلَى عِبَادِ اللَّهِ
بِمَحْضِ مَيْلِ النَّفْسِ وَهُوَ
الْقَلْبُ؟ هَذَا مَقْطُوعٌ بِبَطْلَانِهِ

یہ گمان یقیناً باطل ہے۔ (الاعتصام بِهِ)

علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے صرف جلیل القدر صحابہ ہی نہیں، تمام صحابہ کرام کے بارے میں یہ فرمایا کہ غیر منصوص معاملات کا حکم معلوم کرنے کے لئے ان سب کا طریقہ کا صرف کتاب و سنت کی طرف مراجعت ہے، اپنے ذاتی میلان یا طبعی بجوان کے مطابق فیصلہ ان بزرگوں کی زندگی میں نہیں ہے، اور اگر بالفرض ایسا ہوا مبتدا تو ضروری تھا کہ ان بزرگوں ہی کی جانب سے اس کی تردید بھی بوجگی ہوئی۔

علامہ شاطبی نے الاعتصام میں کئی صفحات اس موضوع پر قلمبند فرمائے ہیں کہ شریعت میں فیصلے کا انحصار دلائل شرعیہ یعنی کتاب و سنت پر ہے، افراد پر نہیں ہے، اور اس موضوع پر کلام کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد مبارک کے ان دونوں واقعات کی صحیح ترجیحی بھی آگئی ہے اس لئے ہاں ان کی عبارت کا مختصر ترجمہ پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

گذشتہ مفہامیں کا خلاصہ یہ ہے کہ افراد حکم شرعی معلوم کرنے کا ذریعہ ہیں، احکام شرعیہ کے علم میں واسطہ ہونے کی وجہ سے صرف نظر کر کے افراد کو معیار قرار دینا ہی ضلال ہلاتا ہے کونکہ جدت قطعی اور حاکم اعلیٰ صرف شریعت ہے پھر تم یہ عرض کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا مذہب یہی ہے، جس شخص نے ان کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے احوال پڑھے ہیں وہ یقیناً صحابہ کرام کے اس انداز سے واقف ہو گا، غور کا مقام ہے کہ سیفہ نبوس اعد میں امارت کے مسئلہ میں نزع اے حتیٰ کہ بعض النصاریہ فرار ہے ہیں کہ ایک امیر ہم میں سے ہو گا اور ایک امیر تم میں سے ہو گا، لیکن جب ان کے سامنے حضور اکرم

صلوات علیہ السلام ، مذاہب اسلامیہ اور اسلامیہ اور اسلامیہ اس سیسی میں سے ہوں گے تو انہوں نے نورانیہ اور اسکے رسول کے حکم کے سامنے تسلیم ختم کر دیا اور دوسرے نقطہ نظر کی جانب اسکے تفاسیں فرمایا، کیونکہ وہ جانتے تھے کہ حق انسانوں کی رائے پر مقدم ہے اور جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ سے قبال کا ارادہ کیا تو بعض صحابہ نے حدیث مشہور سے ان کے موقف کے خلاف استدلال کیا یعنی قوال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا إله الا الله فاذ اقالوا لا الله الا الله عصموا من دماءهم و اموالہم لا بحقها و حسابہم على الله لیکن حضرت ابو بکر صدیق نے بھی اسی روایت کے لفظ الابعدها سے استدلال فرماتے ہوئے کہا کہ زکوٰۃ بھی مال کا حق ہے اور جب تک یہ حق ادا نہ کیا جائے عصمت ثابت نہیں ہوتی، پھر فرمایا کہ اگر یہ زکوٰۃ نہ دینے والے وہ رستی اور پچھہ بھی روکنا چاہیں گے جس کو وہ عہد رسالت میں دیا کرتے تھے تو میں ضرور قبال کروں گا۔

لہ امام بخاری کے ترجیح الباب میں یہ بات مندرجہ اضافہ کے ساتھ گذر چکی ہے کہ الابعدها سے استدلال کے ملاوہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا استدلال یہ بھی تھا کہ نماز اور زکوٰۃ کے حکم میں فرق نہیں کیا جائیں گا کونکہ قرآن کریم میں ان دونوں کو ایک ساتھ اقامو الصلوٰۃ و اتوا الزکوٰۃ دیغرو بھی بیان کیا گیا ہے اس لئے ترک زکوٰۃ کا دو ہی حکم ہو گا جو ترک صلوٰۃ کا ہے۔ امام بخاری نے یہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق کے نقطہ نظر سے مانعین زکوٰۃ کا یہ عمل احکام دین میں تسبیٰ تھا، جب کہ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے من بد ل دینہ فا قاتلہ، یعنی جو دین تسبیٰ کرے اس کو قتل کر دو۔ نیز نسانی شریف میں حضرت انسؑ کی روایت میں ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نماز اور زکوٰۃ کے بارے میں اس حکم کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوٰ مانقل کیا ہے۔

(دیکھئے نائل شریف کتاب المغاربہ ص ۲۷)

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں پائے جانے والے طرز عمل میں ادنیٰ تبدیلی کو راہ نہیں دی اور اس سے میں کسی تادیل کو قبول نہیں فرمایا، اس لئے کہ مانعین زکوٰۃ میں سے جو مرتد نہیں ہوئے تھے وہ تادیل ہی تو کہ رہے تھے اور صحابہ کرام کا اختلاف مرتدین کے بارے میں نہیں بلکہ صرف ان لوگوں کے بارے میں تھا جو تاویل کر کے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر رہے تھے۔ لیکن حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تادیل کرنے والوں کو مendum و قرار نہیں دیا بلکہ ان کی نظر حقیقت واقعہ پر رہی اور انہوں نے فرمایا کہ اگر وہ ادنیٰ ادائیگی سے بھی باز رہیں گے تو میں نصیر قتال کروں گا۔ ت **الاعتمام** ۷۴۔

اس کے بعد لکھتے ہیں

حالانکہ جو لوگ حضرت ابو بکر کو ترک قتال کا مشورہ دے رہے تھے وہ بھی ایک ظاہری مصلحت کے مطابق مشورہ دے رہے تھے اور ان کے مشورے کو بھی شرعی سائل اور اصولی قواعد کی تائید حاصل تھی۔ لیکن حضرت ابو بکر کے سامنے شریعت کی صریح دلیل بالکل ظاہر تھی اور ان لوگوں کی رائے اس موضع دلیل کے مقابل قوی نہیں تھی

مع ان الذين اشاروا علىه
بتراك قتالهم انما اشاروا
عليه بما مر مصلحي ظاهر
تعضده مسائل شرعية
دقوا عد اصولية لكن
الدليل الشرعي الصربي
كان عند ظاهره فهو
تقوع عند آراء الرجال
ان تعارض الدليل

اس لئے حضرت ابو بکر صدیق نے اس صریح دلیل کا استرام کیا، پھر تک قتال کا مشورہ دینے والوں نے بھی حق کو مقدم کرتے ہوئے حضرت ابو بکر صدیق کی صحیح دلیل کی طرف رجوع کر لیا۔

چند لائنوں کے بعد وہ سکر واقع کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ واقع بھی آتا ہے کہ صحابہ نے حضرت ابو بکر کو اس جیشِ اسامہ کو واپس ملائیں کا مشورہ دیا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اسامہ بن زید کی کردار میں رواز فرمایا تھا مگر یہ شکر ابھی تک منزل کی طرف رواز نہیں ہو سکا تھا۔ واپسی کا مشورہ اس لئے دیا گیا تھا کہ اس شکر سے مرتدین کے قتال میں مدد ملے گی، لیکن حضرت ابو بکر نے انکار کیا اور فرمایا کہ میں اس شکر کو واپس نہیں بلکہ اس کو خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نافذ فرمائیں گے، حضرت ابو بکر صدیق حکم خداوندی کے سامنے پر انداز ہو گئے

الظاهر فالزمرة ثور رجع
المشيرون عليه بالقراء
إلى صحة دليله تقديمها
للحاكم الحق وهو الشرع
(الاعظام ب ۲۵)

وجاء في القصة أن
الصحابة أشارة واعليه
برد البعث الذي بعثه
رسول الله صلى الله عليه
 وسلم مع اسامه بن
 زيد ولو يكونوا بعد
 مضاوجتهم به لو يكونوا
 معه عونا على قتال
 اهل الردة فابى من ذلك
 وقال ما كنت لام بعثا
 انفذه رسول الله صلى
 الله عليه وسلم فوقف
 مع شرع الله ولو يحيى كونه

(الاعتصام بـ ۳۵)

اور کسی دوسری چیز کو انہوں نے حاکم
ہمیں قرار دیا۔

بہر حال مانعین زکوٰۃ سے قتال اور جیش اسامہ کے معاملہ میں حضرت ابو بکر
صدیق رضی اللہ عنہ کا عمل استبداد بالرائے کی نظر ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ دونوں
واقعات کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی واضح مثالیں ہیں، امام بخاری بھی
یہی فرمایا ہے میں، علامہ شاطبی بھی یہی سمجھ رہے ہیں اور واقع بھی یہی ہے، یہ
کیسے ہو سکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تو لا تقصوا براہی واحد یعنی
کتے دکے کی رائے پر فیصلہ کی مانع فرمائیں اور صحابہ کرام آپ کے حکم کی تیل
ذکریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کے تمام واقعات
فان تنا من عتر في شئ فردوه الی الله والرسول یعنی نزاعی معاملات میں
کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی واضح تین مثالیں ہیں، اور اس کے ساتھ
یہ وضاحت بھی پیش نظر ہنی چاہئے۔

دکذلک یعنی
یہی طرز عمل حضرت عمر رضی اللہ عنہ
کارہا۔
(تاریخ الشریع الاسلامی ۲۸)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شوری کو جو طاقت حاصل ہوئی
وہ بالکل ایک باضابطہ شکل ہے، حضرت شاہ ولی اشہ صاحب لکھتے ہیں۔

کلمہ امرہم شوری بنیهم سے حضرت عمر کی ذات کی طرف اشارہ ہے کیونکہ مشورہ ان کے اوصاف حمدہ میں سبے نیاں اور مشہور وصف ہے کہ ان کے زمانہ خلاف میں تمام امور علماء صحابہ کے مشورے سے نافذ ہوتے تھے اور امت اسلامیہ کے جامی مسائل کا بیشتر حصہ وہی ہے جس پر خفتر فاروق اعظم کی رائے اور تدبیر سے اجلاع و اتفاق ہو لے۔

وکلمہ امرہم شوری بنیهم اشارہ است بناروق اعظم زیراک اشهر اوصاف او آن بود کہ در زمان خلافت او جمیع امور مکبشوہ علماء صحابہ نافذ می شد و معظم اجاتا عات در ملت اسلامیہ ہاں امت کرا جماع و اتفاق برآں بد بیر فاروق اعظم و برائے او واقع شد (راز الدلائل الخفافیہ ۲۳۴)

یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو مشورہ کا مسیول تھا ہی یکن حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں نہ صرف یہ کہ وہ باقی رہا بلکہ اس کو باضافہ شکل دیدی گئی اور حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے یہ فرمایا کہ آیات قرآنی امرہم شوری بنیهم کا اشارہ ہی حضرت عمر فاروق کی ذات کی جانب معلوم ہوتا ہے اس اجمالی کی تفصیل علماء شبیلی نعمانی سے سنئے۔

ہ اسلام میں خلافت یا حکومت کی بنیاد اگرچہ ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے عہد میں پڑی یکن نظام حکومت کا دور حضرت عمر کے بعد سے شروع ہوتا ہے، حضرت ابو بکر کی دوسال خلافت میں اگرچہ بڑے بڑے ہمایات کا فیصلہ ہوا یعنی عرب کے مرتدوں کا خاتمہ ہوا اور بیرونی فتوحات شروع ہوئیں تاہم حکومت کا کوئی خاص نظام قائم نہیں ہوا اور نہ اتنا مختصر زمان اس کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔

پھر چند لائنوں کے بعد حضرت عمر کے طرز حکومت کے بارے میں لکھتے ہیں۔
 ۷ اگرچہ وقت کے اقتدار سے اس کے (حکومت کے) تمام اصول و فروع مرتب
 ۸ نہ ہو سکے تاہم جو چیزیں حکومت کی روایت میں سب وجود میں آئیں، ان میں سب
 ۹ کا اصل الاصول مجلس شوریٰ کا انعقاد تھا، یعنی جب کوئی انتظام پیش آتا تھا
 ۱۰ تو ہمیشہ ارباب شوریٰ کی مجلس منعقد ہوتی تھی اور کوئی امر بغیر مشورہ اور کثرت
 ۱۱ رائے کے عمل میں نہیں اسکتا تھا، تمام جماعت اسلام میں اس وقت دو گروہ
 ۱۲ تھے جو کل قوم کے پیشوائتھے اور جن کو تمام عرب نے گویا اپنا قائم مقام تسلیم
 ۱۳ کر دیا تھا یعنی بہاجرین و انصار، مجلس شوریٰ میں ہمیشہ لازمی طور پر ان دونوں
 ۱۴ گروہ کے ارکان شریک ہوتے تھے، انصار بھی و قبیلوں میں منقسم تھے اوس
 ۱۵ و خزرج، چنانچہ ان دونوں خاندان کا مجلس شوریٰ میں شریک ہونا ضروری تھا
 ۱۶ مجلس شوریٰ کے تمام ارکان کے نام اگرچہ ہم نہیں بتا سکتے تاہم اس تدریجی معلوم
 ۱۷ ہے کہ حضرت عثمان حضرت علی، حضرت عبدالرحمن بن عوف، معاذ بن جبل، ابی
 ۱۸ بن کعب، زید بن ثابت اس میں شامل تھے (الفاروق ۲۰)

حضرت عمر کے عہد خلافت میں مجلس شوریٰ کے باضابطہ صورت اختیار
 ۱ کرنے ہی کافی تجویز ہے کہ زندگی بھر مجلس شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی فرماتے
 ۲ رہے، مذہبی مسائل میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت اور انتظامی معاملات
 ۳ میں اپنی ذاتی رائے پر نہیں بلکہ مجلس شوریٰ کی متعین کردہ رائے کے مطابق عذر آمد
 ۴ کرتے رہے۔ اور اسی کا دوسرا متجوز ہے کہ بوقت دفاتر بھی خلیفہ کے انتخاب کے
 ۵ لئے باقاعدہ، چند نفری مجلس شوریٰ نامزد فرمائی جس نے اہل مدینہ کی کثرت رائے

معلوم کر کے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو خلافت کے لئے منتخب فرمایا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں مشورہ کی پابندی فرمائی لیکن چونکہ بیشتر معاملات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں مشورہ کے ذریعہ، کتاب و سنت کی طرف مراجعت کی بنیاد پر طے ہو چکے تھے اس لئے عام طور پر حضرت عمر کی سُنت کی پابندی کی گئی البتہ ان کے عہد خلافت میں جب کوئی نیا معاملہ پیش آیا تو اس پر فضور مشورہ کیا گیا، چنانچہ حیثیت خلیفۃ المؤمنین ذمہ داری قبول کرنے کے بعد سب سے پہلا مشورہ ہر زمان کے قتل کے سبب، حضرت عبد اللہ بن عمر کے بارے میں کیا گیا اور جو مشورے میں طے ہوا اس پر عمل درآمد کیا گیا، جمع قرآن کے سلسلے میں بار بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع کر کے مشورے کے جاتے رہے اور بالآخر کثرت رائے سے جو طے ہو گیا اس کے مطابق عمل درآمد ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا عہد خلافت بھی مشورہ کی طاقت سے معورہ ہے بلکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ارشادات میں جو باتیں صوبہ مثل کے طور پر مشورہ میں ان میں شوریٰ کی اہمیت پر ان کا یہ مقولہ بھی موجود ہے
لاصواب مم ترک المشورۃ مشورہ ترک کرنے کے ساتھ، راہ
رازاۃ الغفار مجوہ (۲۹۳)

نمواب ہاتھ نہیں آتی۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں چونکہ حکومت کی باضابطہ تشکیل ہو رہی تھی اس لئے دو اورن کی ترتیب، مختلف مکہم کے اجراء، اموال غنیمت کی تقسیم، عہد داروں کے تقرر اور امور سلطنت کی تمام جزئیات پر کتاب و سنت کی روشنی میں مشورے کے ساتھ فیصلے کئے گئے، اور حضرت

عثمان و حضرت علی رضی اللہ عنہما کے عہد میں ان فیصلوں پر عمل درآمد کے سبب مجلس شوریٰ کی اتنی ضرورت نہیں محسوس کی گئی لیکن جب بھی کوئی تازہ صورت حال پیش آئی تو ارباب مشورہ کو جمع کر کے فیصلہ کیا گیا، اور ان تمام معاملات میں عام طور پر وہ حضرت شریک کئے گئے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وقت وفات انتخاب خلیفہ کے لئے نامزد فرمادیئے تھے۔

خلیفہ کے انتخاب کی مدت حضرت عمرؓ کی سماں فرمی مجلس شوریٰ

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی جانب سے انتخاب خلیفہ کیلئے سات نفری مجلس شوریٰ کی نامزدگی تاریخ اسلام کا آنفانی واقعہ نہیں ہے کہ وہ اچاک زخم کاری پسختنے کے سبب غور و فکر کے بعد نتیجہ تک پہنچنے میں متاثر رہے ہوں، اور اس بنیاد پر نامزدگی کی نوبت نہ آئی ہو، بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بیل القدر اقدام حکم خداوندی کی تعییں، اور حضرت عمرؓ کے خلافت کے باب میں زندگی بھر کے غور و فکر کے بعد طے کردہ نقطہ نظر کی تکمیل کے طور پر تھا، ارشاد خداوندی ہے۔

ان اللہ یا مرکوان توددا بیشک اللہ تعالیٰ تمکو حکم دیتا ہے کہ انسیں
الامانات الی اهلہما (سورہ نہاد) الیت رکھنے والوں کی طرف منتقل کرو۔

اس مجلس شوریٰ کو کسی نے چھ نفری کی سمجھا ہے، اور کسی نے سات نفری، کیوںکہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کو اس مجلس میں بعض چیزوں میں شریک رکھا گیا، اور بعض چیزوں میں شریک نہیں رکھا گیا، اس لئے ابن عمرؓ کو اس کارکن قرار دیں تو، سات نفری ہے، ان کے بغیر چھ نفری ہے۔

یعنی ذمہ داری کا کوئی بھی کام صرف اہلیت کی بنیاد پر سپرد کیا جانا چاہیے تعلق اس
ذمہ داری اور مراکعات کا عمل، ذمہ داریوں اور مناصب کی تقسیم میں شرعاً
کے خشائے مطابق نہیں ہے، خلافت عالیہ سبے بڑی ذمہ داری کا منصب ہے
اور اس میں بھی معیار شرعاً کی نظر میں اہلیت ہی ہے البتہ اس اہلیت کی
توثیق کا سبک بہتر طریقہ یہ ہے کہ وہ امت کے نمائندہ اربابِ شوریٰ کی جانب
سے عمل میں آئے قرآن کریم میں ہے۔

وامر هو شوریٰ بینہم
مسلمانوں کے معاملات مشورے
ر شوریٰ آیت ۷۳) سے طے ہوتے ہیں۔

اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ضروری سمجھا کہ آنے والے خلیفہ کی اہلیت کی
تصدیق فرد واحد کے بجائے اربابِ شوریٰ کی جانب سے ہو اور جسے مجلسِ شوریٰ
اہلیت کی بنیاد پر نامزد کرے وہ خلیفۃ المؤمنین کے طور پر خدمت انجام دے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں جو وضا ختنیں فرمائی ہیں
ان میں بخاری شریف میں ایک تفصیلی بیان موجود ہے، جب حضرت عمر زندگی
کے آخری ایام میں حج کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں ان کے علم میں یہ بات
آئی کہ فلاں صاحب یہ کہتے ہیں کہ اگر عمر کا انتقال ہو جائے تو میں فوراً فلاں
شخص سے بیعت کر لوں گا اور وہ اس طرح خلیفہ نامزد ہو جائیں گا، حضرت ابو بکر
صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت بھی اسی طرح اچانک منعقد ہوئی تھی اور اس کو
مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے علم میں یہ بات آئی تو
غضب ناک ہوتے اور فرمایا کہ میں آج ہی شام کو تقریر کر دوں گا، اور اس میں

لوگوں کو اس طرح کے ارادوں کی غلطی سے مطلع کروں گا۔ لیکن حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا کہ آپ اس عوامی اجتماع میں تقریر نہ کریں کیونکہ آپ کے تردیدی بیان سے ہو سکتا ہے کہ عوامی مجمع کی بنیاد پر غلط فہمیوں کو رامٹے۔ چنانچہ مشورہ قبول فرماتے ہوئے حضرت عمر نے اس دن تقریر نہیں کی، جب مولیہ طبیہ تشریف لے آئے تو ذی الحجہ کی آخری تاریخوں میں جمع کے دن منبر پر نہایت پُر درد اور اثر انگیز خطبہ دیا اور اس کی تمہید میں نہایت طاقتور الہاظہ اشارہ فرمائے۔ میں آج ایک ایسی بات کہنا پا جاتا ہیں۔

افی قائل لکھ مقالة قد
قد تدری لی ان اتو لهالا ادری
لعلهابین یدی احبل
فمن عقلها و عواما
فلیحدث به احادیث
انتہت به راحله۔

(د بخاری ج ۹ ص ۱۰۹)

گویا آج کی تقریر میں جو باتیں ارشاد فرمانا چاہتے ہیں ان کی اہمیت بیان فرمائے ہیں اور ان کی اشاعت بھی چاہتے ہیں کہ جو اس مضمون کو یاد رکھے اور سمجھ لے وہ اس کو جہاں تک ممکن ہو بیان کرے، چنانچہ مسلمانوں نے اس ارشاد کو اتنی اہمیت سے محفوظ رکھا کہ وہ اصع اکتب بعد کتاب اللہ میں محفوظ ہے، اس تقریر میں حضرت عمر نے بہت اہم باتیں ارشاد فرمائیں اور خلافت کے بارے میں جس نقطہ نظر کی وضاحت کی وہ یہ ہے۔

پھر یہ کہ مجھکو یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ تم
میں سے کسی نے یہ بات کہی ہے کہ بخدا
اگر عمر کا انتقال ہو جائے تو میں فلاں
سے بیعت کروں گا، ہرگز کوئی انسان
اس بات سے دھوکا نہ کھائے اور یہ
کہے کہ حضرت ابو بکر کی بیعت اچانک
ہوئی تھی اور کامیاب رہی، خبردار!
کہ اگرچہ اسا ہی ہوا تھا کہ وہ اچانک
تحقیق مگر اللہ تعالیٰ نے اس عاجلانہ طرز
عمل کے نقصان سے محفوظ رکھا اور اب
تم میں کوئی حضرت ابو بکر جیسا نہیں جس
کی فضیلت کا اعتراف دور دور تک کیا
جاتا ہو، خبردار! کہ اگر کوئی مسلمانوں
کے مشورے کے بغیر کسی سے بیعت خلافت
کرے تو اس کی بیعت نہ کی جائے

(بخاری ص ۱۰۹)

وفات سے چند دن پہلے کی یہ الہامی تقریر جس میں اپنی وفات کی بھی
پیشین گوئی ہے خلافت کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے
کافی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ مجھے یہ علم ہوا ہے کہ کسی نے میرے
انتقال کے بعد اپانک کس کے ہاتھ پر بیعت کر کے اس کی خلافت کے انعقاد کی تباہ

شوانہ بلغتی ان قائلہ
منکم يقول والله لومات
عمر با یعت فلانا
فلا یغترن امره اون
یقول انسما کانت
بیعة ابی بکر فلتة
و تنت . الا و انها
قد کانت کذ لک
ولکن الله وحی شرهها
ولیس منکومن تقطع
الاعناق المیہ مثل
ابی بکر من با یع
رجلا من غیر مشورة
من المسلمين فلا یبا یع هو

ظاہر کی ہے اور اس کو یہ دھوکا ہول ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد بھی اچانک ہی عمل میں آیا تھا اور وہ خلافت کامیاب رہی تھی، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ وضاحت فرمائی گئی اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی بیعت اچانک ہوئی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم اور حضرت ابو بکر کی فضیلت کے سبب اسکے نقصانات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھا، اب مسلمانوں میں حضرت ابو بکر صلی اللہ علیہ وسلم و بالا کوئی شخصیت نہیں ہے جس کی عظمت و فضیلت پر قریب و بعد سب کااتفاق ہو، اسلئے اب حکم یہ ہے کہ مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر اگر کسی کی بیعت کا کوئی ارادہ رکھتا ہے تو اس سے بیعت نہیں کی جائے گی۔

اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی اس معرکہ الاراد تقریب میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی تفصیلات بیان فرمائی ہیں کہ اس وقت یہ صورت پیش آئی تھی ہم ان تفصیلات میں نہ جاتے ہوئے صرف مذکورہ بالاحص کے چند پہلوؤں پر توجہ دلانا چاہتے ہیں۔

۱ — سب سے پہلے حضرت عمر نے یام حج میں علم میں آنے والی بات پر ناراٹگی کا اظہار فرمایا اور اس کو فریب اور دھوکا قرار دیا کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی اچانک بیعت سے استدلال کرنا فریب نفس ہے۔

۲ — پھر حضرت عمر نے فرمایا کہ اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کا انعقاد اچانک عمل میں آیا تھا لیکن اس میں کچھ مجبوریاں تھیں، اچانک کا مفہوم یہ ہے کہ اس سلسلے میں پہلے باقاعدہ مشورے کی مہلت نہیں تھی، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ عقروی صاحب علم و فضل اور قریب و بعد سب کے نزدیک محبوب اور پسندیدہ

انسان کہاں میسٹر ہو گا، لیکن ان اوصاف کے باوجود، باقاعدہ مشورے کے بغیر اس عمل میں نقصانات کا احتمال تھا، یہ اللہ کا فضل و کرم ہے کہ اس نے مسلمانوں کو اس کے نقصان سے محفوظ فرمادیا، لیکن جس طرز عمل میں نقصانات کا اندر ہے، وہ اس کا دوبارہ تجربہ کرنا درست نہ ہو گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اگرچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے بارے میں اسی قدر ارشاد فرمایا ہے لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے واضح اشارے موجود تھے اس لئے مسلمانوں کا یہ انتخاب خیر و برکت اور مسلمانوں کے لئے فلاح کا سبب بن گیا۔

۳ — اس تہمید کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کسی شخص کو خلیفہ بنانے کی جدوجہد قطعاً غلط ہے اور اس کی بیعت نہیں ہونی چاہئے۔

بخاری شریف کی اس روایت کے علاوہ بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت کے بارے میں جو اسلامی نقطہ نظر پیش کیا ہے وہ ان الفاظ میں محفوظ ہے **خلافة الا عن المشورة** خلافت (کا انعقاد اور بقا) مشورے کے بغیر نہیں ہے۔ (کنز العمال ج ۶)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت عمر نے خلافت کیلئے جو سات نفری مجلس شوریٰ نامزد کی تھی وہ کوئی اتفاقی عمل نہیں تھا بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت ہی یہ فرمائی

ہے کہ خلیفہ کا انتخاب مجلس شوریٰ ہی کا کام ہے، اور ان کی وفاحتوں سے یہ بات سمجھی گئی ہے کہ خلیفہ کے انتخاب کے لئے مجلس شوریٰ ہی اصل ہے، اور مجلس شوریٰ کو خلفاء رسول اطین پر بالادستی حاصل ہے۔

سَلَّمَ طِينَ پَرْ شُورِيٰ کَبَالاَدَتِ قَرَآنِ مِنْ

انتخاب اخیلفہ کیلئے مجلس شوریٰ کی بالادستی کے سلسلے میں حضرت عمر کے پیش کردہ اسلامی نقطۂ نظر کے لئے اگر کوئی اور تائید نہ بھی ہوتی تو بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد

علیکم بسنّتی و سنتہ الخلفاء میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت
الراشدین (مشکوٰۃ یہ) کو لازمی طور پر اختیار کرو

کے مطابق اس کو لازمی طور پر قبول کرنا ضروری تھا، لیکن حضرت عمر کا یہ نقطۂ نظر جن نصوص پر مبنی ہے ان میں سے چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) اس سلسلے میں سب سے پہلے قرآن کریم کی نصوص کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، قرآن کریم کی آیات سے جو استدلال کے معبر طریقے مقرر کئے گئے ہیں ان کے مطابق امت کے عالی دماغ علماء کرام نے لاحدہ دو مسائل مستنبط کئے ہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ مجتہدین کرام کے مقرر فرمودہ اصول استنباط ہی کے ذریعہ قرآن کریم کے وصف امتیازی لاشقضی بحاجت ہے (کہ اسکے حیرت انگریز پہلو کبھی اختتام پذیر نہ ہوں گے) کا ثبوت فراہم ہوتا رہتا ہے۔

قرآن کریم میں شوری کے سلسلے میں دو آیات ہیں، ایک کا تعلق براہ راست رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ہے یعنی شادر ھو فی الامر فاذ اعزمت فتوح ھل علی اللہ، اور دوسری آیت کا تعلق امت سے ہے یعنی امرہم شوری بینہم اور دونوں ہی آیتوں سے شوری کی بالادستی ثابت ہے۔

یہ بات بھی واضح کی جا سکی ہے کہ احناف کے یہاں قرآن فہمی کے چار طریقے میں، عبارۃ النص، اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضار النص، یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ شادر ھو کی عبارۃ النص سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم معلوم ہوتا ہے، اور اسی کی دلالۃ النص سے امت کے لئے مشورہ کا وجوب ثابت ہوتا ہے، اور اب قابل اعتقاد علماء کی تصریحات سے یہ پیش کیا جا رہا ہے کہ انھی آیات کی دلالتوں سے یہ مضمون بھی صحیح طور پر ثابت ہے کہ سلاطین پر شوری کو بالادستی حاصل ہے چنانچہ عبد الوہاب خلاف نے شورہم کی اشارۃ النص سے یہ مضمون مستنبط کرتے ہوئے لکھا ہے۔

المثال الثالث لاشارة

اشارة النص کی تیسری مثال فاعف

النص، فاعف عنہم	عنہم واستغفر لهم وشادرهم ف
واستفغ لهم وشادر ھو ف	الامر یفھوم منه بطريق
الامر یفھوم منه بطريق	الاشارة ایجاد ایجاد
طائفۃ من الامة تستلهمها	جو امت کی نمائندہ ہوا ورجس سے امت
و تستشار فی امرهالان	کے معاملات میں مشورہ کیا جائے اسلئے

تفیذ الامر و مشاورہ الاممہ کر مشورہ کے بعد، حکم کی تفیذ کا مضمون
یستلزم ذلك (اصول لغة خلاف م۱۳۶) اس کو مستلزم ہے۔

اشارة النص کے بارے میں یہ بتلایا جا چکا ہے کہ آیت پاک کے مرکزی
مضمون کے علاوہ جوبات ترجمہ لغت یا معنی التزامی سے صحیح جائے اس کو
اشارة النص کہتے ہیں، اسلئے عبدالواہب خلاف کے اس استنباط کا مطلب ہوا
کہ آیت پاک میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا جائز ہا ہے کہ آپ مشورہ فرمایں
اس لئے خود حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مشورہ کا حکم اس آیت کی عبارۃ
النص سے ثابت ہوا اور جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کمال عقل و دانش، نور
 بصیرت، پیغمبرانہ عظمت اور سب سے زیادہ طاقتوز دار یعنی علم یعنی وحی پر دسترس کے
باوجود مشورہ کے امور ہیں تو امت کے بقیہ امراء بدرجہ اولیٰ مشورہ کے پابند
ہیں کہ وہ تمام غیر منصوص معاملات میں مشورہ کریں، لیکن مشورہ کی بنیاد پر احکام
کا فیصلہ اور ان کی تفیذ اس بات کو بدہی طور پر مستلزم ہے کہ تمام مشورہ طلب
معاملات کے تفصیل کے لئے علماء کی شوری مقرر ہو، اگر شوری مقرر نہیں کی جاتی
تو قرآن کریم کی اشارة النص سے جو حکم ثابت ہو رہا ہے اسکی تعین نہیں کی جاسکے گی،
عبدالواہب خلاف یہی کہنا چاہتے ہیں کہ حضرات احناف رحمہم اللہ کے مقرر
کردہ اصول استنباط میں، اشارة النص، صحیح نتیجہ تک پہنچانے والا طریقہ ہے
او معنی التزامی کے طور پر یہ آیت دلالت کرتی ہے کہ امت کی نمائندہ ایک ایسی
جماعت کا ہونا ضروری ہے جس سے امت کے اہم معاملات میں مشورہ کیا جاتا
رہے، اور مشورہ کے بعد احکام کی تفیذ عمل میں آیا کرے۔

(۲) عبدالوهاب خلاف نے شادرہم پر اشارۃ النص کا اجراء کر کے جو مضمون بیان کیا ہے، مصر کے دو سے مشہور قابل اعتماد عالم شیخ ابو زہرہ مصری نے وہی مضمون امرہو شوری بینہو پر اشارۃ النص کا اجراء کرتے ہوئے مستنبط کیا ہے فرماتے ہیں و من ذلك (امثلة اشارة
النص) امرہو شوری بینہو
فاته افاد بالعبارة ان
الحكوم الاسلامي يقوم على
الشورى بين جماعة المسلمين
ويفيد بطريق الاقتراهم
وجوب تخيير الامة
بجماعة تراقب الحاكم و
تشاركه في سنن الظاهرة الحكم
شريك كارهه۔

(راصول الفقة ابو زہرہ ۱۳۵)

شیخ ابو زہرہ امرہو شوری بینہو کے بارے میں حضرات احباب۔

رحمہم اللہ کے طریق استنباط کے مطابق لکھتے ہیں کہ امرہو شوری بینہو میں چونکہ صحابہ کرام کے اوصاف حمیدہ کا بیان ہے اس لئے عبارۃ النص سے تو یہ معلوم ہوا کہ غیر منصوص تمام معاملات، جن میں خلافت و حکومت شبک اہم معاملہ ہے شوری کی بنیاد پر طے ہونے ضروری ہیں، لیکن اس حکم خداوندی کی تعیل کے لئے یہ لازم ہے کہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسی جماعت کا انتخاب مل میں آئے جو حاکم

اور سلطان پر بالا دست ہوا اور اس کے تمام معاملات کی نگرانی کرے اور نظام حکومت کی تشكیل میں سلطان کے ساتھ شریک کار رہے۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ ایک اصولی عالم امر ہو شوری بینہو اور دوسرے اصولی عالم شاد صہب کی اشارۃ النفس سے مجلس شوری کا وجوب اور اس کی حاکم پر بالادستی ثابت کر رہے ہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی یہی نصوص میں جن کی بنیاد پر وہ اس اعلان پر مجبور ہوئے کہ خلافت کا مشورے کے بغیر کوئی تصوریں اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کی بیعت درست نہ ہوگی۔

(۳) پچھلی صدی کے مشہور محقق علام طنطاوی، جن کی تفسیر کے بارے میں ہمارے اکابر دیوبند میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری سے بڑے و قیچی الفاظ منقول ہیں وہ ایک دوسری آیت اطیعو اللہ و اطیعو الرسول و اولی الامر منکو پر لکھتے ہیں۔

ارشاد باری داولی الامر منکو میں
مراد امام اسلامیہ کے ارباب حل و عقد میں
جن کے درمیان تمام معاملات مشورے
سے طے ہوتے ہیں اور اکثریت کی رائے
کے مطابق عمل ہوتا ہے یہاں داولی الامر
میں لفظ الامر کا الف لام عہد خارجی کا
ہے اور اس کی مراد وہ امر ہے جو امر ہو
شوری بینہو میں مذکور ہے اس لئے

وقوله راولی الامر منکو ہم اهل
الحل والعقد ف الامر
الاسلامیة الذين يكون الامر
بينہو شوری ويكون الراي
الغالب معمولا به و ا. ل.
في الامر للعهد والمعهود
ذلك في قوله تعالى و
امر ہو شوری بینہو فهذا

او لو الامر ملک سے مراد وہ امر ہے جو امر ہو
شوری میں مذکور ہے۔

(طنطاوی ۵۶)

علام طنطاوی کے ارشاد کا مفہوم یہ ہوا کہ او لو الامر سے مراد وہ ارباب
حل و عقد ہیں جو مشورہ طلب امور کا فیصلہ مشورے سے کرتے ہیں اور او لو الامر
میں الامر پر داخل الف لام کا اشارہ امر ہو شوری بینہو کی طرف ہے۔

علام طنطاوی دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں

غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء
میں کیا حکم دیا ہے کہ اے ایمان والو !
اللہ کی اطاعت کرو، رسول کی اطاعت
کرو اور اولی الامر کی۔ یہ او لو الامر کون
ہیں؟ یہ وہی ہیں جو مسلمانوں کے دریان
”اہل شوری“ کے نام سے معین ہیں جن
کا ذکر اس سورت سے پہلے نازل ہوئے
والی سکی سورت میں وامِم شوری بینہم
میں فراہدیا گیا ہے۔ اس حکم کے مطابق ہر
اسلامی مملکت میں مجلس شوریٰ اور
بالفاظ دیگر مجلس نمائندگانہ ہوئی ضروری
ہے اور یہ وہ مجلس ہوگی کہ امور مملکت
میں اسی کا فیصلہ ناطق اور نافذ ہوگا اور

انظر ماذا قال اللہ تعالیٰ ف
سورة النساء ۱۴۱ ایها الذین
امنو اطیعوا اللہ و اطیعوا
الرسول و ادّلی الامر منکرو من
ھر او لی الامر، هر المعمودون
عندھو هم اهل الشوری
المذکورون فی السورة النازلة
قبلھا فی مکتہ و امروھو شوری
بینہو فلیکن فی کل
بلد اسلام فی مجلس للشوری
و بعبارۃ اخری نواب
و هذَا المجلس له القول
الفصل فی امرا البلاد

فی فعل ما يشاء و يحكم بما يريد اور وہ کلی اختیارات کے ساتھ احکام
 کی تنقید کرے گی۔ (تفیر ابوہ لطفنطادی مبہم)

یہاں علامہ طنطاوی نے یہ ارشاد فرمایا کہ امرہم شوری بینہم کا نزول کہ
 مکرہ میں ہوا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کے تمام معاملات میں امر کی طاقت
 شوری کے ہاتھ میں دی گئی ہے، پھر مذینہ طبیہ میں دوسری آیت اطیعوا اللہ، و
 اطیعوا الرسول داولی الامر منکو نازل کی گئی جس کا مفہوم یہ ہوا کہ شوری کے
 ذریعہ جن لوگوں کو امر کی طاقت تفویض کی جائے وہی داول الامر ہیں اور ان کے
 احکام کی اطاعت واجب ہے۔

اس ترتیب سے علامہ طنطاوی مرحوم یہ صحیح نتیجہ اخذ فرار ہے میں کہ ان
 دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہر حملکت اسلامی میں مجلس شوریٰ کا قیام ضروری
 ہے جس کے ہاتھ میں مکمل اختیارات ہوں۔

ان دونوں آیتوں کو مربوط کرنے کے لئے علامہ طنطاوی نے دو چیزوں سے
 استدلال کیا ہے، ایک خوبی اصطلاح ہے کہ داول الامر میں لفظ الامر پر جو الف
 لام داخل ہے وہ عبد خارج کے لئے ہے جس کی مراد متعین ہے اور وہ مراد متعین
 امرہم شوری میں ذکور ہے، اور دوسرہ استدلال یہ ہے کہ امرہم شوری کا نزول
 پہلے کہ مکرہ میں ہوا ہے جب کہ اطیعوا اللہ، و اطیعوا الرسول کا نزول مذینہ
 طبیہ میں ہوا ہے۔

سلطین پر شوری کی بالادستی کے سلسلے میں قرآن کریم کی آیات سے کئے
 گئے یہ تین استدلال نہایت صاف ہیں کیونکہ پہلے دو استدلال جو آیات قرآن کی

اشارةِ انسن سے کئے گئے ہیں، حضرات احناف رحمہم اللہ کے مقرر فرمودہ طریق استنباط کے بالکل مطابق ہیں، اور حضرات احناف نے قرآن کریم سے معانی کے استنباط کے لئے جو طریقے مقرر کئے ہیں وہ صرف وہی ہیں جو یقینی طور پر صحیح ہیں جن طرق استنباط کا صحیح نتیجہ تک پہنچانا غیر یقینی اور مشتبہ تھا ان کو خفیہ نے قرآن فہمی کے بارے میں قبول نہیں کیا، بلکہ اصول فقہ میں وجہ فاسدہ کے نام سے جو بحث کی جاتی ہے یہ انھیں طرق استدلال کی وضاحت ہے جن کا صحیح مراد تک پہنچانا یقینی نہیں ہے۔

تیسرا استدلال جو علامہ طنطاوی نے کیا ہے وہ بایں معنی مضبوط ہے کہ اس میں اولو الامر کے لفظ الامر سے وہ معنی مراد لئے گئے ہیں جو قرآن کریم کی دوسری آیت امرہم شوریٰ بینہم میں مذکور ہے، اول تو مفسرین کرام کا عام اصول یہ ہے کہ القرآن یفسر بعضہ بعضاً اور وہ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم کی سبے مضبوط تفسیر وہی ہے جو قرآن کریم سے کی جائے، پھر ان کو ان معنی کی تعین کے لئے یہ دلیل بھی لگی کہ جس آیت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ زمانہ نزول کے اعتبار سے مقدم ہے اور مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ دوسری آیت زمانہ نزول کے اعتبار سے مورخ ہے۔

بہر حال قرآن کریم سے استدلال کے قابل اعتماد طریقوں سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ شوریٰ کو خلفاء و سلاطین پر بالادستی حاصل ہے۔



سلاطین پر شوری کی بالادستی ہدایت میں

قرآن کریم میں سلاطین پر شوری کی بالادستی کے ناقابل انکار دلائل کے بعد، اب ذرا حدیث پاک پر نظر ڈال لیں، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلیفہ کے تصریح کا دستور اور معیارِ اہمیت اس طرح بیان فرمایا ہے۔

— عن أبي هريرة قال قال
رسول الله صلى الله عليه وسلم
اذ اعوان امراء کو خيارة کو و
اغنياء کو سعاده کو و اموال کو
شوری بینکو فظہر الارض خير
لکو من بطنها و اذا كان
امراء کو شرائركو و اغنياء کو
بغلاء کو و اموال کو الى نسائلکو
فبطن الارض خير لکه من فظہرها
(ترمذی ج ۵)

لئے زمین کی پشت سے بہتر ہے۔

آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ امت کی خیر اس میں ہے کہ امراض کے انتخاب میں معیارِ انتخاب خیر و صلاح اور اہمیت کو ہونا چاہئے اور دولت مندوں کو کرم پیشہ اور سخنی ہونا چاہئے تمام معاملات بشرط خلافت مشورے سے طے

ہونے چاہیں، اگر صورت حال یہ رہتی ہے تو تمہاری زندگی موت سے بہتر ہے لیکن اگر خدا نخواستہ نوبت یہ آجائے کہ امراض کا انتساب اس طرح کیا جائے کہ بدترین افراد مناصب پر آجائیں اور اغذیاء میں سخن کا مرض پیدا ہو جائے اور معاملات مشورے کے بجائے عورتوں کے سپرد کئے جانے لگیں تو تمہارے لئے موت زندگی سے بہتر ہے۔

اس ارشاد میں امور کو شوری بینکو بالکل عام ہے کہ تمام معاملات کا مشورہ کی بنیاد پر فیصلہ ہونا چاہئے، اگر خدا نخواستہ یہ وصف ختم ہو گیا تو امت کو زوال سے کون بچا سکے گا، اصول فقہ کی اصطلاح میں اس کی تعبیر اس طرح کی جائے گی کسی حکم کے ساتھ اگر کوئی حدیا و عید وارد ہو جاتی ہے تو اس سے وجوب ثابت ہو جاتا ہے، اور یہاں مشورے سے معاملات ٹے نہ کرنے پر شدید وعید آئی ہے کہ تمہارا مر جانا بہتر ہے اس لئے آپ کے اس ارشاد سے شوری کا وجوب سمجھا جائیگا کہ قیام شوری واجبات میں سے ہے، اس لئے آپ کا یہ ارشاد تمام امور کے مشورے سے طے کئے جانے پر نص ہے لیکن خلافت کے ساتھ مشورہ کے ربط پر اس سے بھی زیادہ صریح ارشاد موجود ہے۔

۲۔ — قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لوکن مسْتَخْلِفًا احْدًا
آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں مشورے کے بغیر کسی کو خلیفہ بناتا تو ابن ام عبد عزیز مشورہ لاستخلفتا بزمِ عبد (عبداللہ بن مسعود) کو خلیفہ نامزد کرتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بلاشک خصوصی اختیارات حاصل ہیں اور اس ارشاد کا رسول کوئی فیصلہ کر دے تو تمام مسلمانوں کو صریح حکم ہے کہ وہ آپ

کے احکام کو بے چون وچرا تسلیم کریں ماصنانِ مونم ولامؤمنہ اذا قضی اللہ
ورسوله امراء ان يَحْكُمُوا لِهُوَ الخَيْرَةُ مِنْ امْرِهِ کسی مومن یا مومنہ کو
انے تمام معاملات میں اللہ اور اس کے رسول کے فیصلہ فرمادینے کے بعد کوئی اختیار
باقی نہیں رہتا، اس لئے اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی بھی شخص کو خلافت
عامہ یا خلافت خاصہ کیلنے نامزد فرمادیتے تو کسی مومن کے لئے اشکال کی کوئی بات
نہیں تھی، لیکن آپ نہایت صراحت کے ساتھ فرمائے ہیں کہ میں بھی مشورے
کے بغیر کسی کو خلافت عامہ یا خاصہ کے لئے نامزد نہیں کروں گا، بالفرض اگر میں
مشورے کے بغیر کسی کو نامزد کرتا تو عبد اللہ بن مسعود اس کے اہل تھے۔

اس سے زیادہ کیا صراحت ہو گی کہ آپ اپنے بارے میں فرمائے ہیں کہ میں
بھی مشورے کے بغیر کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کروں گا اور جب آپ بھی مقرر نہیں
فرمائیں گے تو امت کے دیگر افراد کو یقیناً اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ استبداد
بالائے کے طور پر اس طرح کا کوئی اقدام کریں۔

(۲) نیز بخاری شریف میں حضرت جریر بن عبد اللہ البجلي سے روایت ہے
وہ فرماتے ہیں کہ میں ذو عمداً اور ذو الکلام حمیری کے ساتھ دربار رسالت میں حاضری
کے ارادہ سے آ رہا تھا کہ ہمیں راستے میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال
کی اطلاع ملی، اس وقت تو وہ واپس ہو گئے بعد میں حضرت جریر بن عبد اللہ
کی ذو عمرو سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا۔

یا جریر ان بک علی گرامۃ جریر امصار میں کے اوپر احسان ہے
اور میں تمکو ایک اہم بات بتلانا چاہتا
دانی مخبر ک خبراً انکو

یا معاشر العرب لن تزالوا	بغير ما كنتوا اذا هلك امير
بغير ما كنتوا اذا هلك امير	تامرتسو باخر، فاذ احشات
تامرتسو باخر، فاذ احشات	بالسيف حانوا ملوك
بالسيف حانوا ملوك	يعصبون غضب الملوك
يعصبون غضب الملوك	ويرون رضا الملوك
ويرون رضا الملوك	(صحیح بخاری ۶۲۵)

ہول، اے اہل عرب! جب تک تم میں
یہ صورت رہے خیر تھا راحصلہ رہے گی کہ
جب ایک امیر فوت ہو تو تم باہمی مشورے
سے دوسرا امیر مقرر کرتے رہو یعنی انگریز
امیر کے انتخاب میں تلوار رطاقت (خیل)
ہو جائے گی تو بادشاہیت آجائے گی کہ
وہ بادشاہوں کی طرح غصب نہ کا درجہ
انھی کی طرح رفماند ہو اکریں گے۔

حضرت ذوالکلام اور حضرت ذو عمرہ، یعنی کے بادشاہوں میں ہیں، اور اس وقت تک مشرف بالسلام نہیں ہوئے تھے لیکن ایک امیر کے بعد دوسرے امیر کے انتخاب میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کی صورت میں جس خیر کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے، حضرت ذوالکلام کا یہ تبصرہ محدثین کرام کے نقطہ نظر سے امم سابقہ کی کتابوں کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے اور بیان کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے، اور تجربہ کی بنیاد پر بھی ہو سکتا ہے، لیکن ہمیں عرض یہ کہنا ہے کہ خلافت کے مشورے کی بنیاد پر استوار ہونے کی بات زمانہ خیر القرون میں اتنی عام ہے کہ اہل کتاب بھی اس سے واتفاق ہیں، واتفاق ہی نہیں بلکہ اس حقیقت کو اتنا قیمتی سمجھتے ہیں کہ اسکے بیان کرنے سے پہلے ایک موثر تحریک دیکھ کرتے ہیں کہ آپ کے کرم کے عومن میں آپ کو ایک قیمتی بات بتانا چاہتا ہوں لیکن انہوں نے کہ اتنا قیمتی اور اتنا مشہور حقیقت بگھاؤں سے آئی اور جمل

ہو گئی کہ اب مجلس شوریٰ کی بالادستی سلاطین کے مقابل نہیں، ماتحت امراء کے مقابل بھی زیر بحث آگئی اور جس دستور اساسی میں شوریٰ کی بالادستی کا لحاظ رکھا جائے اس کے بارے میں یہ بحث شروع کر دی گئی کہ وہ خلاف شرع ہے، اور اس کا تبدیل کرنا ضروری ہے حالانکہ شوریٰ کی بالادستی اور افوارت عقل و نقل کے ہر طرح کے دلائل سے آسانی کے ساتھ ثابت ہے۔

سلاطین پر زبردشت کی بالادستی کی پریڈ لصیر کیا

مجلس شوریٰ سلاطین پر بالادست ہے اس کے لئے آپ قرآن و حدیث کے متعدد حوالے اور استدلال پڑھ کر ہے میں، یہی مضمون اکابر صحابة اور علماء امت سے بعینہ منقول ہے، اسلامی طرز حکومت کی تشریع سے متعلق حصہ کتاب میں اور مضافات میں لکھے گئے ہیں ان سب میں شوریٰ پر بحث ہے اور ایک خلیفہ برحق یا سلطان عادل کے لئے جو چار اوصاف بیان کئے گئے ہیں وہ میں ترشیت بیعت عام، شوریٰ اور عدالت، شیخ ابو زہرہ مصری نے المذاہب الاسلامیہ میں اس موضوع پر تفصیل کلام کیا ہے، شوریٰ اسلامی حکومت کا وہ ممتاز وصف ہے جس سے کسی بھی حال میں صرف نظر ممکن نہیں، جعفرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنا پورا عہد خلافت اس طرح گذارا ہے کہ اس کے ہر ہم موظف پر شوریٰ کی اہمیت کے دلائل قائم ہیں اور اس سلسلے کی نہایت قیمتی اور زریعہ با میں آپ پڑھ کر ہے میں، اسی سلسلے میں حضرت عمر فرمائی اللہ عنہ سے یہ بھی

منقول ہے۔

و فِي رِوَايَةِ مُعْمَرٍ مِنْ وِجْهِ
أَخْرَى عَنْ عُمَرِ بْنِ دُعَى إِلَى اِمَارَةِ
مِنْ غَيْرِ مُشُورَةٍ فَلَا يَحِلُّ لَهُ اِذْبَاحُ
رَفْتَ الْبَارِي [۱۲۳]

معمر نے دوسرا سند سے حضرت عمرؓ سے
نقل کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو مشورے
کے بغیر امارت کی دعوت دی جائے تو
اس کیلئے امارت کا قبول کرنا جائز نہیں

اس ارشاد میں حضرت عمر بنی اللہ عنہ نے مشورے کے بغیر امارت کیلئے
منتخب کئے جانے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ انھیں اس خدمت کا قبول
کرنا بائز نہیں ہے، اسی موضوع پر حضرت عمر بنی اللہ عنہ کے ارشادات الاخلافۃ
الاعن مشورۃ اور من بايع من غير مشورۃ من المسلمين فلا يبايع بھی گذر
چکے ہیں۔ ان ارشادات کا تقادیر ہے کہ خلافت ہر حال میں مشورہ کی پابندی ہے اگر
مشورہ کے بغیر کسی شخص کو منصب خلافت کی تفویض کی جا رہی ہے تو خود اس
شخص کے لئے اس منصب کا قبول کرنا جائز نہیں، پھر ان ارشادات میں سلا
خلافۃ الاعن مشورۃ۔ تو بالکل عام ہے، اس ارشاد کا جہاں یہ مفہوم ہے
کہ خلافت کا انعقاد مشورے کے بغیر نہیں ہوگا وہیں اس تعبیر کا عموم یہ ہے کہ
خلافت مشورے کے بغیر باقی بھی نہیں رہے گی، گویا خلافت حضرت عمر بنی اللہ عنہ
کی تشریحات کے مطابق انعقاد اور تقادیر نوں حالتوں میں مشورے کے تابع ہے
یہی مضمون مشہور مفسر ابن عطیہ (الامام المفسر الحافظ الفقیہ عبد الحق
بن عاصی بن عطیہ المتوفی ۷۵۰ھ صاحب الوجیز فی التفسیر) سے منقول ہے کہ
خلافت اپنی بقا کی حالت میں بھی مشورہ کی محتاج ہے، ان کا ارشاد تمام معتر

تفسیر و میں ان الفاظ میں منقول ہے۔

ابن عطیہ نے فرمایا ہے کہ شوریٰ، شریعت کے اساسی قوانین اور داجب احکام میں سے ہے، جو خلیفہ یا امیر، اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ کرے اس کو معزول کر دینا واجب ہے، یہ وہ نقطہ نظر ہے جس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

دکربن عطیۃ ان الشوریٰ من قواعد الشریعۃ و عزادی الاعکام من لا یستثیر اهل العلوم والدین فعن له داجب، هذا مسالاً الخلاف فيه (الجزء ایضاً)

چھٹی صدی کے مفسر ابن عطیہ رحمہ اللہ کے ارشاد کا صریح مفہوم یہ ہے کہ خلاف اپنی بقاری میں بھی مشورہ کی محتاج ہے کہ اگر کوئی سلطان مستبد بالرائے ہو جائے اور اہل علم و اہل دین سے مشورہ کرنا ترک کر دے یعنی مجلس شوریٰ کی بالادستی کا عملانہ انکار کر دے تو اس کو معزول کر دینا ضروری ہے اور یہ وہ نقطہ نظر ہے جس میں ابن عطیہ یہ دعویٰ فرماتے ہیں کہ کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے۔

غور فرمائے کہ اگر مجلس شوریٰ کی بالادستی کا انکار صرف عملاء ہی نہیں پسندیدہ موقف کے طور پر کیا جانے لگے، صرف خلفاء و سلاطین ہی کی نسبت سے نہیں، احتساب امراء کے مقابل بھی کیا جانے لگے، پھر اس موقف کو مدل کرنے کے لئے قرآن کریم کی آیات کی تفسیر میں، قابل اعتماد طریقوں کی پابندی بھی نہ کی جائے، نیز احادیث پاک کی توجیبات بھی اپنی رائے کے مطابق کی جانے لگیں اور اس سلسلے میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان فرمودہ و عید بطن الاسرض خیر لکم من ظهرها رکر اس صورت میں تمہارا روئے زمین پر رہنے کے بجائے زیر زمین چلا جانا بہتر ہے) سے

بھی صرف نظر کر لیا جائے تو فتنوں سے امت کی حفاظت کی کیا سوت ہوگی؟
 اکابر دیوبند میں فلسفہ ولی اللہی اور حکمت قاسمی کے کامیاب ترجمان اور امین
 حضرت مولانا عبد اللہ صاحب سندھی قدس سرہ نے سلاطین سے شوری کی نسبت
 اور شوری کو درجہ وجوب سے گھٹا کر استحباب کا نقطہ نظر پیش کرنے والوں کے بارے
 میں اس طرح انہیاں خیال فراہم ہے۔

مشنادرت کا مسئلہ اسلام میں بہت بڑا مسئلہ ہے لیکن اسلامی حکومتوں کو
 مشورے سے خالی کر کے مطلق العنوان بناہیں حکمرانوں اور امیروں کا کھیل بنادیا گیا
 وہ مسلمانوں کی امانت اور سکاری خزانے سے اپنی شبہت پرستیوں پر درپیسہ صرف
 کرتے ہیں۔ وہ بڑی سی بڑی مصلحت کے مقابلہ میں خیانتیں کرتے ہیں اور ان سے
 کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اس قسم کی غلطیوں کا خیازہ مسلمانوں کو نہ صرف اس غلط تفسیر
 اجس میں شوری کی حیثیت وجوب سے گھٹا کر استحباب کر دی گئی ہے، کی وجہ سے
 بھگتنا پڑتا۔ در نہ رکن سلطان ایک حاکم کے اوپر نگی تواریخے۔ وہ حاکم کیوں قانون
 الہی کی اطاعت نہیں کرتا۔ اگر وہ اطاعت نہیں کرتا تو کس بنابری سے اطاعت کا
 طلبگار ہوتا ہے، یہ طاقت مسلمانوں میں پھرے پیدا ہو سکتی ہے اور اس سے ان کی
 جامیں زندگی آسانی کے ساتھ قرآن کے مطابق بن سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ شوری
 کو مستحب بناؤ کر اسے سیاست اسلامی سے نکال ڈالنے والوں نے اسلام کو سخت
 نقصان پہنچایا ہے۔ (عنوان انقلاب ۱۹)

حضرت مولانا کا یہ نکرانیگز اقتباس، اسلامی سلطنت کے بارے میں ہے کہ
 سلاطین کو شوری سے بے نیاز بنانے میں اس تفسیر کا بڑا دخل ہے جس میں شوری کی

حیثیت و جوب سے گھاکر مستحب کر دی گئی ہے، یونکہ مجلس شوریٰ میں کو اس تفسیر کے مطابق آزادی اور مطلق العنانی مل گئی، اگر اہل علم اور اہل دین ارباب شوریٰ کی نگرانی میں خلافت کی خدمت انہام دی جاتی اور خلفاً، کو شوریٰ کے وجوہ پر عمل کرنے کا پابند رکھا جاتا تو اسلام کی تاریخ میں وراثت کی بنیاد پر آنے والی خرابیوں کا وجود نہ ہوتا۔ اب مدارس عربیہ کے نظام کارمیں شوریٰ کے وجوہ سے انکار اور استحباب کا موقف اختیار کرنے والوں کو محدود ہے دل سے اپنے نقطہ نظر پر غور کرنا چاہئے کہ مدارس عربیہ کو ان نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔

ما تحفہ امراء کے حق میں شوریٰ کی بالا درستی

خلفیہ راشد اور سلطان وقت کیلئے مجلس شوریٰ کی اتحادی میں کام کرنا ہی ضروری ہے اس کے لئے دلائل گذرا چکے ہیں، خلیفہ راشد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق تمام مسلمانوں کے لئے نہایت قابل احترام ہستی ہے یکن خلیفہ کا راشد ہونا ہی مجلس شوریٰ کی اتحادی میں ممکن ہے، اگر خلیفہ مستبد بالرائے ہو جائے اور مشورہ ترک کر دے تو ابن عطیہ کے ارشاد کے مطابق یہ کہنا ضروری ہو جائے گا کہ اس کی خلافت بلوکیت میں تبدیل ہو گئی ہے اور وہ صرف اسکی ایک وصف سے محروم ہونے کی بنیاد پر راشد نہیں ہے۔

خلفیہ راشد کے بعد دوسرا درجہ سلطان کا ہے، سلطان کے برافتدار آنے کا جو بھی طریقہ ہو لیکن جب وہ درجہ امامت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کو دیگر اماراء

سے مختلف احکام میں امتیاز عاصل ہو جاتا ہے، یہاں ماتحت اور بالا درست امراء کے دریان فرق واضح کرنے کیلئے چند چیزیں پیش کی جا رہی ہیں۔

۱۔ سلطان کے مقابل محاذا آرائی صرف اسی صورت میں جائز ہے جب اس سے صریح کفر کا صدور ہو، اس سے کم درجہ کی چیزوں یعنی فسق و فحور وغیرہ کے ارتکاب کی صورت میں خروج اور مقابلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے بلکہ صبر کرنا ضروری ہے جبکہ ماتحت امراء کی جانب سے ان چیزوں کا صدور ہو تو وہاں صبر کرنا واجب نہیں بلکہ وہاں دوسرا حکم ہے۔ فیض الباری میں حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کا ارشاد ہے۔

خلاصہ ہے کہ اگر امام صریح کفر کا حکم دے تو اسکے خلاف خروج کرنا اور اس کو منصب امامت سے اتر دینا واجب ہے اور اگر امام اس سے نیچے کے گناہوں کا ترکیب ہو یا ظلم ا لوگوں کو تکلیف پہنچائے تو خروج جائز نہیں) صبر کرنا واجب ہو گا، البتہ امام کے علاوہ کوئی دوسرا ماتحت امیر ہر حرکت کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں۔

وجملة الامر فيه ان الامام
لوامر بانکف المبو ۲۷ بحسب
الخروج عليه وخلعه عن
الامامة وان عصى او اذى
الناس يحب عليه الصبر
وان امر غيره بها لا تجب
طاعته۔

رفیق الباری (ج ۹ ص ۲۹۹)

گویا قیام مملکت اور بقد نظم کی مصلحت کے سبب امام اور سلطان کو یہ امتیاز دیا گیا ہے کہ فر کے نیچے فسق و فحور کے ارتکاب اور ظلم وغیرہ پر صبر کیا جائے گا

اور ان کے مقابل خروج کی اجازت نہ ہوگی، لیکن اتحت امراء کا حکم اس سے مختلف ہے، شیخ ابو زہرہ مصری، علامہ ابن تیمیہ کے حوالہ سے سلطان اور اتحت امراء کے درمیان فرق اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وجہ فرق و امتیاز یہ ہے کہ خلافت عالیہ کے منصب پر قابض ہونے والے کو فتنہ انگلیزی کے بغیر تخت خلافت سے اتنا ناممکن نہیں ہے، ظاہر ہے کہ فتنہ گری میں اندر کی پھیل جاتی ہے اور اندر کی ایک لمحہ میں ایسے نسادات کو جنم دیتی ہے جو سالہا سال میں بھی روتا نہیں ہوتے، البتہ پچھے عہدہ والے کو فتنہ خیزی کے بغیر بھی معذول کر سکتے ہیں، خصوصاً جبکہ امام و خلیفہ سے مرد حاصل کر کے اس کو معذول کرنے کی کوشش کی جائے تو اس میں سرے سے کوئی اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(اسلامی مذاہب م ۱۰۶ بحوالہ منہاج السنۃ م)

گویا خلافِ شرع امور کے ارتکاب کی صورت میں، امام اور اتحت امراء کے درمیان حکم میں فرق ہے اور امام کے حق میں اس کے مرتبہ اور درجہ کی رعایت رکھتے ہوئے امتیازی احکام دیئے گئے ہیں جبکہ اتحت امراء کے حق میں اس کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔

۲ — ملا جیون رحمہ اللہ، التفسیرات الاحمدیہ، میں شرح عقائد کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

شوافع کی کتابوں میں درج ہے کہ امام	المسطور فی کتب الشافعیة
فسق کے ارتکاب سے معذول نہیں	ان الاماں لا يغزى
ہوتا اس لئے کہ اس کو معذول کرنے	بالفسق لان فی انعزاله

اور دوسرے کو مقرر کرنے میں فتنہ انگریزی
ہے کیونکہ اس کو اقتدار حاصل ہے، بخلاف
قاضی کے کوہ امام شافعی کے یہاں نسبت
کے سبب معزول ہو جائے گا، کیونکہ اس
کو اقتدار حاصل نہیں ہے، شرح عقائد
میں اس کی تصریح ہے۔

ونصب غیرہ اثارۃ الفتنۃ
مالہ من الشوکة بخلاف
القاضی فانہ ینظر عنده
بالفتنۃ لانہ غیر ذی شوکة
کمانص به فی شرح العقائد
(التفہیرات الاحمیہ ۲۹۱)

امام اور قاضی کے درمیان یہ واضح فرق ہے جس سے یہ ثابت ہے کہ ماتحت
امراء کے بعینہ وہ احکام نہیں ہیں جو سلطان کے ہیں۔

۳۔ فقر کی مشہور کتاب ہدایہ میں، کتاب الحدود میں سلطان اور دیگر
امراء کے درمیان اجراء حدود میں فرق مذکور ہے۔

ہر وہ چیز جس کا ارتکاب اس امام
سے ہو جائے جس کے اوپر کوئی امام نہیں
تو اس کے اوپر حد جاری نہ ہوگی، ملاوہ
قصاص کے، اسلئے کہ قصاص اور اموال
کا مواخذہ بالا دست امام سے بھی ہو گا
کیونکہ حدود حقوق الہی ہیں اور ان کا
قام کرنا خود امام کا کام ہے دوسروں کا
نہیں اور وہ اپنے اوپر حد قائم نہیں
کرے گا، کیونکہ یہ عمل بے فائدہ ہو گا،

وکل شفیٰ صنعتہ الاما م
الذی لیس فوقہ امام فلاحد
علیہ الا اقصاص فانہ یو خذبه
وبالاموال لان الحدود حق
الله تعالیٰ واقامتہا الیہ لا الی
غیرہ ولا یمکنہ ان یقیو علی
نفسہ لامنہ لا یفید
بخلاف حقوق العباد
لامنہ یستوفیہ ولی

البته حقوق العباد کا وصول کرنا حقداروں
کا کام ہے اس لئے وہ اپنا حق وصول
کریں گے اور ان کی وصولیابی اس طرح
ہو گی کہ امام خود پنچ اور قابو دیدے
یا مسلمانوں کی عوامی طاقت کے ذریعہ
وصول کیا جائے اور قصاص اور اموال
حقوق العباد میں سے ہیں۔

الحق اما بستمکینہ او
بالاستعانۃ بمنعة
المسلمین والقصاص
والاموال منها۔
(ہدایہ ج ۲۵)

اس عبارت میں بھی صراحةً ہے کہ اجراء حدود کے سلسلے میں بھی امام اور
امرا کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔

ان چند حوالوں سے یہ بات ثابت ہوئی کہ تمام امرا، کا ایک حکم نہیں ہے،
ما تحت امرا، کے احکام الگ ہیں اور سلاطین کے احکام الگ ہیں، یہاں اس فرق
کو واضح کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جس نقطہ نظر میں ہم تم کو امیر قرار دے کر انہیں مجلس
شوری پر بھی بالادستی دیدی گئی ہے اس پر یہ اشکال ہے کہ جب مجلس شوری
کی بالادستی خلیفہ راشد پر قائم ہے، سلاطین پر قائم ہے جب کہ انہیں امتیازی
جیشیت حاصل ہے اور بعض احکام شرعیہ میں ان کی بالادستی کی رعایت محفوظ ہے
تو ما تحت امرا کے اوپر مجلس شوری کی بالادستی قائم کرنے میں احکام شرعیہ کی قطعاً
خلاف ورزی نہیں ہے بلکہ ایسا کرنا ضروری ہے۔

ادلة تو اس وجہ سے ضروری ہے کہ عوامی چندے سے چلنے والے مدارس عربیہ
میں چندہ کا جواز ہی ارباب حل و عقد کی مجلس شوری کے قیام سے ہوتا ہے جیسا کہ

حضرت مولانا نجیل احمد صاحب اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہماں اللہ کی مراسلت سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے، شانیاً اس لئے کہ عصر حاضر میں کسی جماعت کے ہاتھ میں مدارس کی زمام کار کا دینا ہر اعتبار سے قرین مصلحت ہے الہیت کی بنیاد پر مناصب کے لئے انتخاب کا عمل بھی آسان ہو جاتا ہے اور مالی دیانت کا وثوق بھی اسکی سے بڑھتا ہے، حضرت مولانا کفایت اللہ صاحب لکھتے ہیں

”اگر اہل شوری اور معاونین دارالعلوم کی اکثریت کسی ایک شخص کو

تمام اختیارات تفویض کر دینے کے حق میں ہو تو مفضلہ نہیں لیکن فی زماننا قومی اداروں کا نظم و نسق جماعت کے ہاتھ میں رہنا

اوپر بالمراءح ہے (رکفایت المفتی ۲۲۷)

اس کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایک ہی شخص کو تمام اختیارات دے جائیں تو ان اختیارات کو دینے والے بھی اہل شوری ہی ہیں اس لئے شوری کی بالادستی اس صورت میں بھی محفوظ ہے، اور تمام اختیارات کی تفویض میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں ہے، مگر حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنے قرین مصلحت نہ ہو گا، مصلحت اسی میں ہے کہ قومی اداروں کا نظم و نسق جماعت کے ہاتھ میں رہے اور یہ جماعت محدود اختیارات کسی شخص کو دے کر اس سے کام لے، اس طرح یہ شخص مجلس شوری اور جماعت کی نسبت سے مامور، اور کارکنان ادارہ کی نسبت سے امیر ہو گا۔

ایک ہی شخص کے امیر و رامور ہو کی وضاحت

رمایہ کہ ایک ہی شخص امیر بھی ہوا اور دوسری حیثیت سے مامور بھی ہوا تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہے جناب علما نے ... ٹکلکو راع و ٹکلکو مسئول عن رعیتہ کے تحت یہ بحث منقح فرمادی ہے۔ اور ہماری اس تحریر کے آغاز میں اس کا خلاصہ دیا جا چکا ہے کہ علامہ ابن حجر نے فتح اباری ۱۳۷۱ پر ارشاد فرمایا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد "کلم راع" سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب ہی راعی اور امیر ہو گئے تواب ماتحت کون رہے گا۔ مگر جواب میں فرماتے ہیں کہ صاف بات یہ ہے کہ ہر انسان میں دو حیثیتیں ہو سکتی ہیں کہ وہ اپنے ماتحتوں کے لئے امیر ہوا اور بالادستوں کے سامنے جواب دہ اور ان کا مامور ہوا۔

نیز علامہ عینی رحمہ اللہ نے عمدۃ القاری ۲۶۸ میں یہ اضافہ فرمایا کہ اپنی بات کو مثال سے بھی سمجھا دیا، سوال تو یہی ہے کہ جب کلم راع کے سب ہی انسان مصدق ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ امیر ہو بالادست ہیں تواب ماتحت کون رہا؛ اس کا علامہ نے بڑا محققانہ تجزیہ کیا ہے، اور وہ اس کے دو محمل بیان کرتے ہیں کہ اگر اس روایت کو صرف باب دیانت سے متعلق مانا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر شخص راعی ہے اور مرعی اس کے اعضاء و جوارح ہیں یعنی وہ پروردگار کی بارگاہ میں آخرت میں جواب دہ ہو گا کہ اس نے اپنی ذمہ داریوں کو کہاں تک

پورا کیا۔

اور اگر اس روایت کو باب الاحکام سے کبھی متعلق نہ آجائے جیسا کہ امام بخاری کا اس روایت کو کتاب الاحکام میں ذکر کرنا بتلا رہا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہی شخص میں راعی اور مرعی یعنی بالادستی اور ماتحتی کی دونوں جہتیں جمع ہو سکتی ہیں مثلاً ہر شخص اپنے اہل خانہ کی نسبت سے بالادست ہے لیکن امام اور سلطان کی نسبت سے اس کو ماتحت نیز برداشت اور جواب دہ قرار دیا جائیگا ان معروضات کا خلاصہ یہ ہوا کہ امام اور سلطان کے علاوہ ہر امیر میں دو حصتیں ہو سکتی ہیں، اس لئے مدارس عربیہ کے ہستم کے بارے میں یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ ان میں یہ دونوں حصتیں ہیں وہ ماتحتوں کے حق میں امیر اور بالادستوں یعنی شوریٰ کے حق میں امور ہیں کیونکہ یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ ہستم سلطان کے درجہ کے امیر نہیں ہیں۔

بالفرض اگر ان مدارس عربیہ کا انتظام اسلامی حکومت کے تحت ہوتا تو ہستم کی حیثیت نہ سلطان کی ہوتی اور نہ وزیر تعلیم کی بلکہ ان کی حیثیت وزارت تعلیم کے تحت محدود دارے میں کام کرنے والے ناظم مدرس یا پرنسپل کی ہوتی کہ طلبہ اور کارکنان پر ان کو امیر تعلیم کریا جاتا لیکن اپنے بالادستوں یعنی وزردار اور سلطان کے مقابلہ میں انھیں ماتحت اور امور ہی قرار دینا ضروری ہوتا۔

اس لئے مدارس عربیہ کے موجودہ طریق کار میں ہستم کے بارے میں سمجھنا درست نہیں ہے کہ اس کو سلاطین کی طرح ایسی سربراہی اور امارت حاصل ہے کہ

اس کے اوپر کسی کی بالا دستی درست نہ ہوگی، اور اگر انکے اوپر کسی کو مقرر کر دیا گیا تو یہ خلاف شرع ہو جائیگا، امیر امور کے درجہ میں آجائے گا اور جس دستور اساسی میں امیر کو امور کا درجہ دیدیا گیا ہو اس کو بدل ڈالنا اور نظام شریعت کے مطابق کرنا ضروری ہو جائے گا۔

مشورہ طلب مسائل کیا ہیں

یہاں تک یہ مسائل شرعی دلائل کے ساتھ واضح ہو چکے ہیں کہ شریعت میں مشورہ کا کیا مقام ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اس سلسلے میں کیا عمل رہا، آپ کے نے مشورہ کی کیا حیثیت تھی، خلفاء راشدین کے زمان میں کیا تعامل رہا، خلیفہ راشد کیلئے مشورہ کا کیا حکم ہے، سلطان کو مجلس شوریٰ سے کیا نسبت ہے اور ما تحت امراء کے لئے اس کا کیا درجہ ہے، اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مشورہ کن مسائل میں ہے؟

اجمالیہ بات سامنے آچکی ہے کہ مشورہ کسی بھی سلسلے میں حکم شرعی تک پہنچنے کے لئے ہوتی ہے اس لئے جس مسئلہ میں بھی حکم شرعی خفا میں بواں میں مشورہ کرنا ضروری ہے، اور جب کسی معاملہ میں حکم شرعی واضح ہو جائے تو سبکے لئے اس کا تسلیم کریں اس ضروری ہے، عام طور پر امور دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک دنی امور، اور دوسرے انتظامی۔ دینی امور میں فیصلے کی طاقت صرف کتاب و سنت میں ہے فان تنازعتم فی شئ فردو، الی اللہ والرسول کے تحت یہ بحث گذر چکی ہے اور اس

سلسلے میں خلفاء راشدین کا اطرز عمل بھی سامنے آچکا ہے کہ ان کے یہاں تمام مشوروں میں کوشش ہیپی ہوتی تھی کہ قرآن و حدیث کا حکم معلوم ہو جائے، اگر حکم صراحت سے مل جاتا تو فوراً اس کو قبول کر لیا جاتا اور اگر صراحت سے نہ ملتا تو اس کی نظریہ پر قیاس کیا جاتا، قواعد کلیئے کے تحت جزئیات کو داخل کر کے حکم معلوم کیا جاتا، عدت کا تقدیر کر کے معلوم کیا جاتا وغیرہ، اور اگر انتظامی امور سے متعلق بات ہوتی تو مشورہ میں بحوثات طے ہو جاتی اس پر عمل درآمد کیا جاتا، اور مشورہ میں اختلاف ہوتا تو اکثریت کی بنیاد پر فیصلہ کیا جاتا۔

اب نوعیت یہ ہے کہ مجتہدین کرام اور ان کے بانع نظر متبوعین فقہارے نے علمی مجلس مشورہ منعقد کر کے یا اجتہاد فرما کر لاکھوں جزئیات کا حکم قلم بند کر دیا ہے اس نئے امور مشورہ طلب میں ہمارے لئے آئی جانکاری کی ضرورت نہیں ہے بلکہ مشورہ کی بنیاد پر یہ منزل ٹڑی حد تک سرکی جا چکی ہے، حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ
کی مسامی جمیلہ کے بارے میں ہے۔

ام اعظم ابوحنیفہ کے فقیہی اجتہادات
بھی شوری ہی کے ذریعہ مدون کئے
گئے ہیں، اس بات گذر چکی ہے کہ جن حضرات
نے امام صاحب کی کتابیں مدقون کی
ہیں ان کی تعداد چالیس تھی، جب
کوئی تازہ واقعہ پیش آتا تو امام صاحب
ان سے مشورہ کرتے سوال وجواب کرتے،

دنقه ابی حنیفة قد دون
کذلک بالشوری فقد
تقدیم ان الذين دون الکتب
لابی حنیفة کافوا اربعین
رجلا فاذانزلت نازلة
شادر هو دسائله هو
وسمع ما عندہ هو

ان کے پاس جو آثار و حدیث ہوتے ان
کو سنتے اور اپنے پاس جو ہوتا ہے انکے
سامنے پیش کرتے یہاں تک کہ سب
کسی ایک بات پر متفق ہو جلتے تو اس
کو لکھ لینے کا حکم دیتے۔

من الآثار والاحاديث
و يقول ما عندك حتى
يتقوا على أحد الآقوال
فيها باشباته دكتابته۔

(مقدمة اعلار السنن ۲۶)

امام صدر الائمه لکھتے ہیں۔

فوضع ابوحنیفة رحمه اللہ
مدھبہ شوری بینہو ولہ
یستبد فیہ بنفسہ دو نہر
اجتہاد امنہ فی الدین
ومبالغة فی النصیحة
لله ورسولہ و المومنین

(مناقب مونق ۱۳۷)

امام ابوحنیفہ نے اپنا مدھب شوری کے
ذریعہ مدون کیا ہے، اپنے اصحاب کے
بغیر محض استبداد بالائے کے طور پر
مہیں کیا۔ کام امام صاحب نے دین
کی خدمت کے لئے پوری کوشش
صرف کرنے کے جذبہ کے تحت کیا، اور
اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم
کے ساتھ خیرخواہی کے جذبہ کے تحت کیا

چالیس نفری مجلسیں شوری کے ذریعہ امام صاحب نے جو مسائل مستنبط
فرائے ان کی تعداد کے سلسلے میں ہائلی قاری فرماتے ہیں۔

امام صاحب رحمہ اللہ نے تراہی ہزار
مسائل کے احکام قلم بند کر لئے ہیں جن
میں سے اُسیں ہزار مسائل عبادات

انہ وضع ثلاثة آلاف
و ثمانين ألف مسئلة منها
ثمانية وثلاثون الفا في

العبادة والباقي في المعاملات
 سے متعلق ہیں اور بقیہ مسائل معاملات
 (ذیل ابوہریرہؓ، سعید بن معاویہؓ، ابوحنیفہؓ)

جب ایک امام کی کوششوں کا یہ حال ہے تو غور کر لیا جائے کہ تمہارا ائمہ اور
 ان کے ہزاروں نہیں لاکھوں متبوعین کی کوششوں اور کاوشوں سے کون سا
 جزئیہ ہو گا جس کا حکم مستحب ہے ہوا ہو گا؟ اس لئے اب مجلس شوریٰ کا کام بہت
 کم رہ گیا ہے، اب براہ راست قرآن و حدیث کی طرف صرف انھی مسائل میں
 رجوع کرنا ضروری ہو گا جو واقعہ نے ہوں اور ائمہ یا ان کے متبوعین سے ان
 جزئیات کا تصریح تنکم سنقول نہ ہو۔ یا مسائل تو پرانے ہوں لیکن ان کی نوعیت
 میں ایسی تبدیلی اگئی ہو کہ مسئلہ از سرنو قابل غور بن گیا ہو۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سیدین احمد مرندی قدس سرہ کے تلمیذ مولانا
 محمد مشاہد صاحب سلیمانی الم توفی ۱۹۴۱ء نے اس موضوع پر رقم فرمایا ہے۔

”خلفاء راشدین کے زمان میں جو مشورہ ہوتا تھا وہ ذیل کی اغراض کے
 لئے ہوتا تھا (۱)، کتاب اللہ یا سنت رسول اللہ میں کوئی حکم موجود ہو تو اس
 کو واقع کے ساتھ تطبیق دینا (۲)، اگر نہ ہو تو اجتہاد کرنا اور مجتہدین کی آراء
 میں ترجیح دینا (۳) جن امور کو شریعت نے خلیفہ وقت کے ہاتھ میں تفویض کر دیا
 ہے اس کے متعلق مصانع پر بحث کرنا۔

لیکن آج کل جو نکہ جملہ قوانین سیاسیہ بشکل کتب مدون ہو چکے ہیں اس
 لئے آج کل صرف اغراض مذکور کے تحت مشورہ کیا جائے (۱)، قوانین سیاسیہ
 شرعیہ کو وقائع پر تطبیق دینے میں غور و خوض کرنا (۲)، جن امور کو شریعت احمدیہ

نے چند اجمالی قوانین بیان کر کے خلیفہ وقت کی مصلحت امنشی پر چھوڑ دیا ہے اس کی مصالح و مضرات پر بحث کرنا۔ (فتہ الکریم فی سیاست النبی الامین ۲۵)

حضرت مولانا مشاہد صاحب کے اس قابل قدر تجزیہ پر یہ اضافہ ضروری ہے کہ اگر رباب شوری نے اعتماد کر کے تمام اختیارات خلیفہ کے پر کر دیے ہیں تو یہ تجزیہ درست ہے کہ وہ خلیفہ اپنے اختیار سے کام کرے گا اور شوری مخصوص مصلحت و حضرت پر بحث کرے گی، لیکن اگر شوری نے تمام اختیارات خلیفہ کو نہیں دیئے ہیں بلکہ ذہ محمد و دائرے میں خلیفہ سے کام لینا چاہتی ہے اور امت کے حق میں یہی مناسب اور مصلحت کے مطابق سمجھتی ہے کہ اختیارات شوری ہی کے پاس رہیں تو نہ صرف یہ کہ اس کے عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں بلکہ خلافت راشدہ میں اس کی نظیر صراحت کے ساتھ موجود ہے، کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابو نوؤ کے زخم کاری سے متاثرا اور اپنی زندگی سے مایوسی کے وقت جو چہ نفری مجلس شوریٰ مقرر کی تھی اس مجلس نے تین دن تک اقتدار کی زمام اپنے پاس رکھی اور محدود اختیارات دے کر حضرت صہیب رضی اللہ عنہ سے کام لیا، ان تین دنوں میں امامت کبریٰ یا خلافت عالیہ کا منصب کسی فرد واحد کے پاس نہیں تھا جب کہ شوریٰ کی ہدیت اجتماعی ہی، ہدیت حاکم تھی، اس کی تصریح علامہ سعد الدین تفتازانی نے شرح عقائد میں فرمادی ہے

اگر یہ کہا جائے کہ امامت کو شوریٰ کی
چھ نفری کمیٹی کے پر کرنا کیسے صحیح
ہو گا جبکہ ایک وقت میں دو اماموں

فان قیل کیف یصح جعل
الامامة شوری بین السنتة
مع انه لا يجوز نصب امامين

کا تقریب از نہیں، ہم یہ جواب دینگے
کہ ناجائز تو دواموں کا مستقل طور
پر تقریر ہے جن میں سے ہر ایک کی اطاعت
اللگ الگ واجب ہو کیونکہ اس صورت
میں متفاہد احکام کی تعییل لازم آیے گی
لیکن شوری کی نوعیت بالکل دوسری ہے
کیونکہ یہاں ان کی ہیئت مجموعی، ایک

فِ نِمَان وَاحِدٌ قَلَنا
غَيْرَا لِجَائِزٍ هُوَ نَصْبٌ إِمَامِين
مُسْتَقْلِينَ تَجْبَ أَطْاعَةٌ
حَلْ مِنْهُمَا عَلَى الْأَنْفَرِ رَادٌ
لَابِذْمٌ فِي ذَلِكَ مِنْ امْتَنَالٍ
أَحْكَامٌ مُتَضَادَّةٌ وَامْفَافٌ
الشُورِيَّ فِي الْكُلِّ بِمَنْزِلَةٍ
إِمامٌ وَاحِدٌ (شرع عقائد ۳۳)

علامہ تقاضانی کے ارشاد کا صریح مفہوم یہ ہے کہ وہ امامت کبریٰ کو مجلس شوریٰ کے سپرد کر دینے میں عدم جواز کی کوئی دلیل نہیں پاتے، کیونکہ انہوں نے ہیئت مجموعی کو فرد واحد کا حکم دیا ہے۔

اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس مجلس شوریٰ کو یہ ہدایت بھی فرادیتے کہ انتخاب خلیفہ کے بعد بھی مجلس شوریٰ امام اور خلیفہ کی نگران رہے گی تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا، لیکن ایسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شاید اس نے نہیں فرمایا کہ اول تدوہ دور ہی خیر القرون کا ہے جس میں خلیفہ شوریٰ سے بے نیاز اور مستبد بالرائے ہو کر کام کرنے کا وہم بھی نہیں رکھتا، دوسرے یہ کہ جب انتخاب خلیفہ کا کام جو امور سلطنت میں سے اہم کام ہے وہ مجلس شوریٰ کے سپرد ہے تو انتخاب کے بعد نگرانی کا معاملہ تو اس سے آسان اور کمتر درجہ کی چیز ہے، اور امرِ ہم شوریٰ بینہم کے عالم اور صریح حکم کے بعد مزید تصریح کی ضرورت نہیں ہے۔

ایک کام کئلے ایک سے زائد افراد کی ہیئت مجموعی کا حکم

الشی بالشی یہ ذکر بات سے بات نکلتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ نہایت اختصار کے ساتھ اس مضمون کو بھی منقح کر دیا جائے کہ ایک خدمت کے لئے ایک سے زائد افراد کی ہیئت مجموعی کا اختیارات کی تفویض کے ساتھ تقریر کرنا شریعت اسلامی میں ناجائز نہیں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مقرر فرمودہ چہ نفری مجلس شوریٰ پر آپ علامہ تفتازانی کا تبصرہ پڑھ کر ہے میں کہ شوریٰ کی صورت میں چند افراد کی ہیئت مجموعی کو وہ فرد واحد کا حکم دے رہے ہیں لیکن اس کے علاوہ بھی قرآن و حدیث اور فقہار کی تصریحات اس مسئلے میں موجود ہیں، مثلاً۔

۱۔ احرام کی حالت میں شکار کرنے کی ممانعت ہے، اگر کسی شخص سے یہ غلطی ہو جاتی ہے تو اس کی جزا واجب ہے، کس شکار کے عوض کیا واجب ہوگا اس کا قرآن کریم میں یہ حکم ہے کہ شکار کے مثل جانور جزا کے طور پر واجب ہے جس کا فیصلہ دو عادل مسلمان کریں گے، ارشاد ہے۔

تجزء، مثل ما قتل من	ذو اعداء منکو.
مساوی ہوگی جس کو اس نے قتل کیا؟	النحو يحکو به
جس کا نیصلہ تم میں سے دو معتبر شخص	
کریں گے۔	

(سرقة نمانہ دست ۲۵)

آیت میں فرمایا گیا ہے احرام کی حالت میں شکار کرنے کی وجہ سے جو

پا داش واجب ہوتی ہے اس کا فیصلہ دو معترض شخص کریں گے یہ حکم کسی بھی سلسلے میں ایک سے زائد افراد کے ہیئت حاکم ہونے کی نظر کے لئے کافی ہے۔

۲ — امام بخاری قدس سرہ نے ایک باب مستقل اسی عنوان سے قائم کیا ہے
باب امر الوالی اذا دجھہ اس بات کا بیان کر اگر والی کسی ایک
امیرین الحی موضع۔ جگہ کیلئے دو امیروں کو رواؤ کرے۔
اس باب کے تحت فتح الباری میں ابن عربی کی طرف نسب کرتے ہوئے
مقصد ترجمہ کا تعین اس طرح کیا گیا ہے۔

ابن عربی فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور حضرت	قال ابن العربي سَعَان
ابوموسیٰ کو ان تمام امور میں یکاں اختیار دیا تھا جو ان کے سپرد کئے گئے تھے، تو آپ کا یہ عمل دو مشترک یکاں اختیار رکھنے والے قاضیوں کے تقرر میں اصل ہے، ابن عربی نے ابھی معنی	المنجی صلی اللہ علیہ وسلم اشرکهماف مادلاهـما نـسـعـانـذـلـكـاـصـلـافـ
کو جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا ہے۔	تولیة اثنین قاضیین مشترکین فـ الـوـکـاـیـةـ
معلوم ہوا کہ اگر ایک سے زائد افراد کو کسی کام کیلئے یکاں اختیارات دیجے جائیں تو وہ باہمی مشورہ سے معاملات طے کرنے کے بعد امورِ مفوضہ کی انجام دی کریں گے۔	شـذـاجـزـمـبـهـ

۳ — حفظ شاہ ولی اللہ صاحب جو حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع سے متعلق لکھتے ہیں

و لس لاعون حصر ف عدد امام کے تحت معاونین امراء و رؤساء
 معین لله بدوں علی درج ان
 کے تقریبیں کوئی عدالتی پابندی نہیں
 ہے بلکہ یہ بدلہ شہری فروختیات پر محدود
 حالات امدادیہ فرمائی
 الحاجۃ الی اخواز عنین فی حاجة
 نہیں ایضاً امدادیہ کی احتیاطات نہیں
 احتیاط امیر تقریبی کے مفہوم پر جائز ہے
 (صحیح البدر بالغہ پڑی)
 معلوم ہوا کہ ایک کام کے لئے ایک سے زائد افراد کے تقریبیں کوئی قباحت
 نہیں ہے پھر یہ کہ معاملہ اگر ان دونوں کے یکسان اختیارات کا ہے اور وہ معاملہ
 رائے اور مشورے کا بھی محتاج ہے تو دونوں کے اشتراک کے بغیر کارروائی
 جائز نہیں۔

نہ حضرت مولانا مفتی کفاسی اللہ صاحب رحمہ اشد ایک استفتہ کے
 جواب میں لکھتے ہیں۔

متوالی کا قرداحد موالازم ہیں، اختیاراتِ ولیت معدود افراد کے
 پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ (التفایت المفتی میرزا)

عرض قرآن و حدیث کے مقامیں اور علماء امت کے ارشادات و شادی
 سے یہ بات یوری طرح ثابت ہے کہ ایک کام کیلئے ایک سے زائد افراد کی بیشتر
 جمیعی کا تقریب از روئے شرع بالکل درست ہے اس لئے مدرس عربیہ کا انتظام اگر
 فرد واحد کے لئے ہی میں نہ ہو بلکہ مجلس شوریٰ کی بیانیت حاکم کے سردار ہو تو اس میں
 کوئی مضافات نہیں، بلکہ پہلے گذر چکا ہے کہ یہ طرز صرف یہ کہ اس دوسری مصلحت
 کے مطابق ہے اور اس میں احتیاط کے زیادہ سے زیادہ پہلو ہیں بلکہ مدرس عربیہ

کے نظام کا اس چندہ کی وصولیابی کا جواز ہی اس سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ لوالہ مرد کی وہ جماعت ہے جو ہندوستان میں سلطان کے قائم مقام ہو کر اسکی اجازت دیتی ہے۔

اخلافِ ایک کی صورت میں فصل کاظمیہ

البتہ اگر ایک سے زائد افراد کسی کام کے ذریعہ میں گئے تو انہیں اختلاف رائے ہو سکتا ہے، اب دیکھنا ہے کہ اس میں فصل کی طبقہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اخلاف رائے اس صورت میں ممکن ہیں ہے جب قرآن و حدیث میں حکم صحن پایا جاتا ہو یا حکم صحن نہ ہو لیکن زیر غور مندرجہ کی قرآن و حدیث میں صرف ایک نظر ہو، یا زیر غور مسئلہ، کسی ایک ہی قاعدہ کلیہ کے ذیل میں آتا ہو۔

اخلاف اسی صورت میں ہوں ہے کہ زیر غور مندرجہ قرآن و حدیث میں صحن نہ ہو، اور اس کے لئے ایک سے زائد نظریں ہوں یا ایک ہی جزویہ کی جیسوں تھے ایک سے زائد قواعد کلیہ کے تحت آتا ہو، ایسی صورت میں اہل مشورہ کے ذیل میں اختلاف ہو جائیگا کہ کیا قیصلہ کیا جائے، اس سے میں شبے پہنچنے تو یہ خوب ہے کہ مسائل فقیہی کی تدوین کے بعد اسی اختلاف کے موقع پر بہت کم رہ جائے میں کیونکہ ان مسائل کے بارے میں قرآن و حدیث کا حکم امت کے غالی دامغ غدار نے غور و فکر اور مشورے کے بعد معلوم کر لیا ہے، دوسرے ہرگز فقیہ کی تدوین کے ساتھ ساتھ اصول فقہ کی تدوین بھی ممکن ہو جکی ہے اس لئے اگر تدوین دیجھے میں اس جزویہ کا حکم نہیں ملتا تو اصول فقہ کی روشنی میں حکم معلوم کر لیا جائے۔

اب یہ بات بہت آسان ہے کہ جب کوئی تازہ واقعہ سامنے آئے تو سبے پہلے
فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں حکم معلوم کریا جائے اور اگر ان کتابوں میں بھی حکم معلوم نہ
ہو تو اب چونکہ استنباط مسائل کا اتمہ کرام کا معین کردہ طریقہ کار تحریر کی روشنی میں
کامیاب اور امانت کے قابل اعتماد علمد کے نزدیک درست ثابت ہوا ہے اور اصول
طور پر اس کی صحت پر امانت کا اجماع ہو چکا ہے اس لئے اگر فقر کی کتابوں میں حکم
معلوم نہ ہو تو اصول فقر کی روشنی میں حکم معلوم کریا جائے۔ امانت کے پاس حکماً
شرعیہ معلوم کرنے کے لئے اب یہ دو مضبوط بنیادیں ہیں اور امید کی جا سکتی ہے کہ اگر
دینات و اخلاق کے ساتھ فیصلہ تک پہنچنے کی کوشش کی جائے تو اختلاف کی
نوبت نہیں آئے گی۔

مثلاً مدارس عربیہ میں شوریٰ کی بالادستی کا معاملہ ہے، اس سلسلے میں دو
نقطہ نظر سامنے آئے ہیں، ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ مشورہ کا حکم صرف استحباب کا
درجہ رکھتا ہے اور نہیں اسی امیر کو شریعت نے یہ اختیار دیا ہے کہ وہ اقلیت
اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی بھی رائے کو ترجیح دے سکتا ہے، دوسرا نقطہ نظر
یہ ہے کہ نہیں ماتحتوں کے لئے امیر اور مجلس شوریٰ کی نسبت سے امور ہیں،
مشورہ منتخب نہیں بلکہ واجب ہے، مجلس شوریٰ صرف مشورہ دینے والی جائی
نہیں بلکہ اولو الامر اور رابر اب حل و عقد کی وہ جماعت ہے جس کی اجازت کے بغیر
عوامی چندے کی وصیویابی ہی محل نظر ہو جاتی ہے۔

پہلے نقطہ نظر کی سبے مضبوط دلیل قرآن کریم کی آیت دشادر ہے
فی الامر فاذا عزمت فتوحکل علی اللہ، ہے، اس نقطہ نظر کے دلایا کا طریق

استدلال یہ ہے کہ اذا عن ملت میں کوئی تینیں ہے کہ وہ اکثریت کے مطابق ہویا اقلیت کے نیز یہاں عزمت فرمایا گیا ہے عن مو انہیں فرمایا گیا، اس نے امیر کو یہ اختیار ہونا چاہتے کہ وہ جس جانب کو چاہے اپنے عزم سے ترجیح دیدے، اس نقطہ نظر کے وکلاء کے پاس عہد رسالت یا خلافت راشدہ کے کچھ واقعات بھی ہیں جن کو وہ اپنے نقطہ نظر پر منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں

دوسرے نقطہ نظر کے وکلاء کے پاس قرآن کریم کی دونوں آیتوں شادِ حم

اور امرِ هو شوری بینہم کی اشارۃ النص ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول
و ادلو الامر منکو میں ولو الامر کے مصدق افین کی حیثیت سے مجلسِ شوری کی تعین

پر متعدد اہل علم کے استنباطات ہیں، عہد رسالت کے مختلف واقعات، اور خلافت راشدہ کا پورا دور اسی نقطہ نظر کا ترجمان ہے، اور مجلسِ شوری کے

بارے میں یہ حقیقت بالکل منقح ہے کہ اس کو خلفاء اور سلاطین پر بھی بالادستی حاصل ہے، رہا تھت امراء یا ہمکم کے اوپر بالادستی کا سوال، تو اس سلسلے میں

حقیقت بالکل بدراہت کے درجہ میں ہے کہ یہ سلاطین کے درجہ کے امیر نہیں ہیں اور جب سلاطین پر بھی شوری کی بالادستی شرعاً ثابت ہے تو اس طرح کے

اتھت امراء کو کسی بھی فرد یا جماعت کے اتحت کر دینے میں کوئی خلاف شرعاً بات نہیں ہے

ان دونوں نقطہ ہائے نظر میں سے کون سا نقطہ نظر درست ہے اسکے لئے نہیات آسان بات یہ ہے کہ پہلے فقہ و فتاویٰ کی کتابوں میں حکم دیکھو یا جائے وہاں نہ ملے تو خفیہ نے قرآن و حدیث کے لئے فہم معانی کا جو طریقہ مقرر کیا ہے

اس کے مطابق نہ صریح اسجا ہے، فقر کی کتابوں میں اس بیان موجود ہے
وہ پیش کیا جا چکا ہے کہ وہ دو نظر نظر کی تائید میں ہے۔ تا
اصل فقر کی کتوں پر اپنے کے بازار میں عرض ہے کہ اپنے نقطہ نظر کے
وقایتے میں طور پر استدلال کیا ہے وہ حفیہ کے نقطہ نظر سے درست ہیں ہے
اس کی تشریع یہ ہے کہ یہ آیت اشارہ تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں
نازل ہوئی ہے، اس لئے اس آیت اسے آپ کے حق میں مشورہ کے حکم پر
استدلال عبارۃ النص ہے، لیکن دیگر امراء کے حق میں یہ استدلال اسی وقایتے
میں ہے جب اس کو اشارۃ المعنی (ولالا) النص یا اقتضاء النص سے طور پر جاری
کیا جائے اور یہ بات تفصیل الحسے بیان کی جا چکی ہے کہ شادی ہو کی دلالۃ النص
تو دیگر امراء کو مشورہ کا پابند نہیں ہے لیکن عورتیں میں اس کا اجر نہ کرنے کے دیگر
امراء کے حق میں حکم معلوم نہیں کیا جا سکتا۔

اس نقطہ نظر کے وکلاء کا اصل استدلال یہ ہے کہ عورتیں میں کوئی قید
نہیں ہے کہ آپ کا یہ عزم اکثریت کے مطابق ہوا اقلیت کے ہاں تھے قید
ہونے کے سبب یہ آیت دڑا صحن مطلقاً ہے اور مطلق حنفیہ کے نزدیک مطلق ہی
رہتا ہے، اس لئے عورتیں کوئی قید نہیں لگائی جائے کی بلکہ اس کو بلا قید ادا راعلہ
رکھا جائیگا کہ یہ عزم جس جانب سے متعلق ہو جائے اسی کے مطابق اقدام کی
جائیگا ہے اسندال عقیقہ کے نقطہ نظر سے درست ہے، لیکن اس کا اجر صرف
حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے لئے تو ہوتا ہے دیگر امراء کیلئے نہیں ہوتا،
دونوں نقطہ نظر کی تفصیل کے بعد، اب یہ عرض ہے کہ حنفیہ کے لئے اس

سلک میں فیصلہ انسان ہے کہ جو نقطہ نظر ان کے قابل اعتماد فقہاء کی تصریحات کے مطابق ہے، یا قابل اعتماد فقہاء کے طریق استنباط کے مطابق ہے وہ اس کو قبول کر لیں اور و دستے کو ترک کر دیں، جیسا کہ اکابر دارالعلوم میں حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد فاضم صاحب با تو توی، حضرت مولانا فیض الدین صاحب انجینئر فرب برمن اکابر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا نید حسین احمد صاحب بنی اور حضرت مولانا سید خز الدین احمد صاحب رحمہم اللہ نے مجلس شوریٰ کی بادستی کا اعتراف کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہی حریثات کی تدوین اور قرآن و حدیث نے اصول استنباط کی تعین کے بعد فیصلہ بہت انسان ہو گیا ہے، کیونکہ قرآن کریم میں اخلاف کی صورت میں، کتاب و حدیث کی طرف مراجعت کا حکم دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی اور صورت نہیں بدلائی کی تھی، اب اس حکم پر عمل انسان ہو گیا ہے کیونکہ امت کے عالی داع فقہاء کرام نے لاکھوں حریثات کا حکم قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان کر دیا ہے اور تازہ یا باقی نامندرہ مسائل کیلئے اصول استنباط المأمون اور شیعہ ہو دئے ہیں، اب اگر حکم فقہاء کی تصریح کے مطابق معلوم ہو جائے تو معاملہ بہت ہی اسانی سے حل ہو جائیگا اور تصریح نہیں کی تو استدلال کی کسوٹی پڑ پکھ کر دیکھ لیا جائیگا کہ جو نقطہ نظر پیش کیا جا رہا ہے وہ قابل قبول ہے یا نہیں۔

مذکور کتاب میں اسی مضمون پر مبنی تھے۔

کثرت رائے بھی فیصلہ کا ایک طریقہ کہے

لیکن اگر بالفرض کوئی ایسا جزئیہ سامنے آ جاتا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی وہ ترجیح نہیں ملتی مثلاً فہرست کی تصریحات میں حکم نہیں ملتا، نظائر پر قیاس کرتے ہیں تو برابر کی ایک سے زائد نظریہ ہیں، قواعد کلیہ کے تحت لاتے ہیں تو جزوئیہ اپنی دو حیثیتوں کے سبب دو مقضاد قواعد کے تحت آتا ہے یا مثلاً مسئلہ بالکل انتظامی نوعیت کا ہے جس کا نصوصیٰ میں کسی بھی حیثیت سے مذکور ہونا ممکن نہیں تو اس طرح کے تمام معاملات میں حکم شرعی معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ مسئلہ کو اہل نظر کی مجلس شوریٰ کے درمیان رکھ دیا جائے، اور اگر اتفاق رائے ہو سکے تو کثرت رائے کو فیصلہ کا ذریعہ بنایا جائے، رہایہ کے شریعت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوابے یا نہیں۔ تحقیقت یہ ہے کہ اگرچہ شرعاً عوام کی کثرت رائے کا تو اعتبار نہیں ہے لیکن خواص اور اہل رائے کی کثرت رائے کے معترض ہونے پر قرآن جدید اور علماء کے ارشاد سب ہی موجود ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں چند دلائل پیش کر دیئے جائیں۔

کثرت رائے قرآن میں

۱۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی آیت پر عمدۃ المفسرین حضرت مولانا شبیر حمد غمامی رحمادشہ کا تفسیری حاشیہ ملاحظہ فرمائیں، آیت ہے :

کہیں نہیں ہوتا مشورہ میں کا جہاں وہ نہیں	مَآیکُونَ مِنْ نَجْوَى ثَلَاثَةٍ اَلَا هُوَ
ہوتا ان میں چوتھا اور نہ پانچ کا جہاں نہیں	رَابِعٌهُ وَلَخَمْسَةُ الْاَهُوَسَادُّهُمْ

دلا ادنی من ذلک ولا اکثر الہ
ہوتا ان میں چھٹا، اور بڑا سے کم اور
زیادہ، جہاں وہ نہیں ہوتا ان کے تجھے
ہو معہم اینساکانوا
(سورۃ المجادۃ آیت ۸)

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں :

”مشورہ میں اگر صرف دشمن ہوں تو بصورت اختلاف ترجیح دشوار ہوتی
ہے اس لئے عموماً معاملات ہر میں طاق عذر رکھتے ہیں اور ایک کے
بعد پہلا طاق عذر میں تھا بہر پائی، شاید اس لئے ان روکو اختیار
فرمایا اور آگے دلا ادنی من ذلک ولا اکثر سے تسلیم فرمادی باقی حضرت
عمر کا شوری خلافت کو چھ بزرگوں میں دائر کرنا (حالانکہ چھ کا عدد طاقت نہیں
ہے) اس لئے بوجا کر اس وقت یہی چھ خلافت کے سب سے زیادہ مستقی
تھے جن میں کسی کو چھوڑا نہیں جا سکتا تھا، نیز حلیف کا انتخاب ان ہی چھو
میں سے ہو رہا تھا تو ظاہر ہے کہ جن کا نام آتا اس کے سوارائے دینے والے
تو پائی ہی رہتے ہیں، پھر بھی احتیاطاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بصورت مساوات
ایک جانب کے ترجیح دینے کے لئے حضرت عبدالعزیز بن عمر کا نام دیا تھا۔
والله عالم“

اسی آیت کے ذیل میں یہی مضمون تفسیر کریمہ بن الحبیبی ہے :

ان اقل ما لا بد منه في المشاور	و مشورہ جس کا مقصد کسی بہتر فیصلہ تک پہنچانا ہو
التي يكون الغرض منها تمهيد	اس میں کم از کم تعداد میں ہوئی چاہئے تباہ ہو
مصلحة ثلاثة حتى يكون الاشأن	افراد تو گویا فتنی اور اثبات میں زراع کرنے والے

کالمتنازعین فی النفي والاشبات
والت لث کالمتوسط العاکوبینہما

فعینہ تکمل تلاٹ المشورۃ و نیت

ذلک الغرض بوجہ کذا فی کل جمع

اجتمعوا معاورۃ فلا بد فی هجر

من واحدیکون حکما مقبول القول

فلهذا الیتیم لابد وان تكون

اربابا مشاورۃ عدد هم فرد افاد ذکر

سبحانہن لغز دین الادلين والحقی

بذكرهم اتبینها علی المساقی

(تفسیر کبیر م)

التفاسیر

سید امام روزی قدس سرہ کے بیان میں تصریح ہے کہ اہل مشورہ کی تعداد طاقت

ہونی چاہیے تاکہ اختلاف کی صورت میں ایک ہم کی کثرت نے قیصر کیا جائے اور کثرت

رائے کو ترجیح دی جائے۔

امام رازی رحمۃ اللہ اور حضرت مولانا شیخ احمد عثمانی رحمے ایت دمایکون من

پیجھی شلادھہ الایتہ میں لفظ شلادھہ اور حسرہ نے اہل مشورہ کے عدد کے طاقت

ہونے پر جو استدلال کیا ہے وہ حسرہ کے مقرر کردہ قائم معانی کے طریقوں میں سے

استارة انس کے قبیل ہے ہے کیونکہ یہاں شلادھہ اور حسرہ کے ترجیح الغوی سے یہ

استدلال کیا جا رہا ہے۔

۱۔ حقیقت یہاں نمودر رہنی چاہئے کہ دارالعلوم کے ایام تاسیں میں اکابر دارالعلوم نے ابتدائی مجلس شوریٰ کی تعداد سات رکھی ہے جیسا کہ ابتدائی صفتیات میں ان حضرت کے نام پر شائع کیا جانے والا سب سے پہلا اشتھار نقل کیا گی ہے، ابتدائی مجلس شوریٰ کی تعداد کا طاق ہونا محض اتفاق نہیں معلوم ہوتا بلکہ اس سے اکابر دارالعلوم کا مسلک محترم رہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اختلاف رائے کی صورت میں کثرت رائے کو وجہ ترجیح فراز دیں گے، اچھا پنچ ابتدائی دور کے عقین و فقایہ میں کثرت رائے کے وجہ ترجیح بدلنے کا عمل بھی ثابت ہے، اور اسی وقت کے دستور اس سی میں کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کی صراعت بھی ہے جبکہ یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ موجودہ دستور اسلامی مرتب تو بعد میں ہوا ہے لیکن مسلمین بے خصوصی نافذ ہوئی اور حضرت گنگوہی قدس سرہ کے دور سے تاریخ تحریک تک کی شوریٰ کی بنیادی تجویز کو اس میں شامل کر لیا ہے۔

کثرت رائے حذریث میں

۲۔ اکثریت کی وجہ ترجیح کیلئے حدیث پاک میں کمی دلائل ہیں ابھر ایسا حدیث

عن علی قال قلت یا رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت ہے
ان نزل بنا امر لیش فیہ بیان امر سے کہ میں نے عرفن کیا یا رسول اللہ اگر ہمارے

سامنے ایسی صورت ہیئی کئے جس میں آپ کی
و لا نهی فما تامر فی قال شاؤروا

فیہ الفقہاء والغابدين ولا معنوا
فیہ رای خاصہ روایہ الطبری

نہیں کیا ٹکم دیتے ہیں اب آپ نے فرمایا کہ اس

در جا لِهِ موثقون من اهل الصَّحِيف
مُجْمَعُ از وَامَد ص ۱۰۵
مسلم فقہاء اور عابدین سے مشروہ کرو اور
اسیں خاص لوگوں کی رائے نافذ مت کرو۔ طبری نے
روایت کیا اور اس کے تامہم رواۃ صحیح کے درجے کے
ثقہ ہیں۔

آپ کے اس ارشاد مبارک میں لا تمضوا فی رأی خاصّة فرمایا گیا ہے ،
حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس کا ترجمہ کیا ہے ، ”اکے دُکے کی رائے نافذ مت
کرو“ مفہوم یہ ہوا کہ جب اہل رائے مشورہ کیسے بیٹھیں تو جو رائے ایک دو انسانو
کی ہے یعنی جو رائے اقلیت میں ہے اس کو نافذ کرنا درست نہیں ہے ۔ قابل نفاد
وہ رائے ہوگی جو عام اہل رائے کے نزدیک قابل قبول ہو ۔

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے
کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ
فراتے ہوئے سُننا ہے کہ میری امت مگر ای پر
اتفاق نہیں کرے گی اس لئے تم اگر اختلاف
دیکھو تو امت کے سواد اعظم کے ساتھ ہو۔

۳ - عن انس بن مالک يقول
سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم كوي
وسلم يقول إن امتى لا تجتمع
على ضلالته فإذا رأى يقظاً اختلافاً
فعليكم بالسوداد الاعظمه ۔

(ابن ماجہ م ۹۵)

علامہ سندھی نے ”سنن المصطفیٰ“ حاشیہ ابن ماجہ میں سواد اعظم کی
تشریح اس طرح کی ہے ۔

سواد اعظم سے مراد اکثریت رکھنے والی جماعت
ہے، کیونکہ ان کا اتفاق اجماع سے زیادہ قریب

ای بالجماعۃ الکثیرہ فیان
اتفاقہ را قرب الی الاجماع

قال السیوطی فی تفسیر السواد العظیم
ای جماعتہ الناس و معظمه هم اذن
یجتمعون علی سلوک النہج المستقیم
والحدیث یدل علی ائمہ ینبغی العمل
بقول الجمہور و فی الرؤا و الدوف
اسنادہ ابو خلف الاعمی و اسنه
حازم بن عطا و هو ضعیف
و قد جاء الحدیث بطرف
فی کلمہ انظر۔
(سنن المصطفی ص ۲۷۳)

ہے اسی طبی نے سوادِ عظم کی تغیریں کہنا
کہ اس سے مراد لوگوں کی وہ بڑی جماعت
ہے جو صراحتاً مستقیم برپائے میںاتفاق رکھتی ہو
اور یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ
جمہور کے قول پر عمل کرنا چاہئے۔ اوسی مدعیٰ زور
میں ہے کہ اس روایت کی سند میں
ابو خلف الاعمی ہیں جن کا نام حازم بن عطاء
ہے اور وہ ضعیف راوی ہیں، اور یہ حدیث
اور بھی متعدد سندوں سے منقول ہے مگر
ان سب میں کلام کیا گیا ہے۔

اختلاف کی صورت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوادِ عظم کے ساتھ
رسنے کی تائید فرمائی اور ظاہر ہے کہ سوادِ عظم میں کوئی وجہ ترجیح عددی کثرت و تو
کے علاوہ نہیں ہے اس لئے عددی کثرت کے وجہ ترجیح ہونے پر یہ روایت نفس
کا درجہ رکھتی ہے۔

البتہ اس روایت میں حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے ابو خلف الاعمی
کے باشے میں ضعیف ہونے کا قول ہے، لیکن اس سلسلہ میں تفصیل یہ ہے ابو خلف الاعمی
حضرت انسؓ سے روایت کرنے والے دو راویوں کی کفیت ہے، ایک حازم بن عطاء
اور دوسرے مروان الا صفر، حازم بن عطاء ضعیف راوی ہیں لیکن مروان الا صفر وہ صحیح
کے راوی ہیں اور ابو خلف سے اگر پہلی تر حضرت حازم بن عطاء ہی کی تعین کر کے

روایت کو ضعیف قرار دیا ہے لیکن اسماء رجال کے بعض اساطین مروان الاصغری

راوی کے ہیں، اس لئے روایت قابلِ احتجاج ضرور ہے۔

بڑی تغیرت کر اس روایت کے جملے سے عدالتی لذت کے وجہ تزعیج ہوتے

میں مسلمان نامیت ہوتا ہے وہ علمکو بالسوداد الا عظيم ہے اور یہ الفاظ

برویہ کی بہت کے ساتھ مختلف رکح روایات کے اندر موجود ہیں مسنداً حمد من

عن النعمان بن بشیر قال قال

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

عنهذه الاعوام او على هذها

المذير من لعيشک القليل لع

يشكر الكثرو من لم يشك الناس

لعيشک الله والتعذر بشرى معه

الله شكر وترك ما كفر والعمامة

رحمة والفرقه عذاب قال

فقال ابو امامۃ الباهلي عليهما

بالسوداد الا عظيم

(مسند احمد ص3)

حضرت عبد الرحمن بن ابي ابيه رضي الله عنه عذاب، راوی کہتا کہ پھرست ابو ابیه

سوداد عزم کے ساتھ رہنا ضروری ہے،

سوداد عزم کے ساتھ رہنا ضروری ہے،

سوداد عزم کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

یہ دونوں روایتیں بند تصحیح منقول ہیں جن میں سواداعظم کے ساتھ ہے کی تاکید کی گئی ہے اور علماء مسند حجی سواداعظم کے باعث میں لمحتہ ہیں کہ اصل طبق اجماع میں ہے، لیکن عدو وغیرہ عدو دل کی نسبت اجماع یہ قریب ہوتا ہے۔ گویا علماء مسند حجی کے یہاں اکثریت کیسے وحدت حجج یہ ہے کہ اس میں اجماع نہیں لیکن اجماع کے قریب ہونے کی وجہ سے طاقت آجالی ہے

عیکم بالسوادالاعظم یہ امام شافعی رحمہ اللہ نے بھی اجماع کے بھوت پر استدلال کیا ہے اور شاہ ولی ائمہ صاحب رحمۃ اللہ نے بھی اس روایت کے باعث میں تواتر معنوی کا قول کیا ہے، گویا عیکم بالسوادالاعظم مفہوم اور معنی دونوں اخبار سے درست ہے، حضرت شاہ ولی ائمہ صاحب رحمۃ اللہ

نے فرمائے ہیں:

و حدیث متواتر المعنی عیکم بالسوادالاعظم اور یہ متواتر المعنی حدیث کر لے تو گویا سواداعظم کی پرروی تم لازم ہے اور حدیث بہت سی سنداں اکثر طرق خوش کر امام شافعی ان روایاتات اجماع روایت کرد، عطاوار رفیع ایں احادیث

مختلف اند، جیسے بروجوب طاعت خلیفہ

الخاتمین فی معصیۃ محل نورہ اندو

بل لغیر بروجوب قول اجماع

یعنی ہر خلیفی کی طاعت واجب برقرار کوئی

گناہ کی بانی پر اور حجہ لوگ اس اجماع کا جلت

ہونا نکالتے ہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ علیکم بالسوادالاعظم کے الفاظ، مسند و

کے ثابت ہیں کہ حضرت شاہ ولی اثر حمد اللہ اس کو تواتر معنوی کے درجہ میں سمجھ رہے ہیں اور قرن اول سے اس روایت سے مختلف مفاسیں پراستدلال کیا گیا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس روایت سے صراط مستقیم کی تعین ہر استدلال کیا ہے کہ جس جانب مسلمانوں کی اکثریت ہو دہی طریقہ مستقیم ہے۔ خوارج کے موقف کے خلاف پراس روایت سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ یوگ سواد اعظم سے کٹ گئے ہیں اور یہیں سواد اعظم کے ساتھ رہنا چاہئے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ نے اس روایت سے اجماع کی جیت پر استدلال کیا ہے۔ علام جلال الدین سیوطی اور علامہ سندھی اس سے اکثریت کے، اقرب الی اجماع ہونے کا ضمن ثابت کر رہے ہیں۔

سم۔ جماعت یا سواد اعظم میں قوت، عددی کثرت کے سبب آتی ہے، میسمون حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جابریہ کے خطبے سے بھی واضح ہے خطبہ حاکم نے مختلف سندوں کے ساتھ نقل کیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

عَنِيكُوا بِالْجَمَاعَةِ فَأَنَ الشَّيْطَانُ جماعت کے ساتھ رہنا لازم سمجھو، اس نے

مَعَ الْوَاحِدِ وَهُوَ مِنَ الْأَشْنَينِ أَبْعَدَ كشیطان تنہیا انس کے ساتھ رہتا ہے اور (ازالۃ الحفاء میں ۲۳۴)

وَإِنَّكَ لَكَ بِنَسْبَتِ دُوَّسَ زیادہ دور ہو جائے فرمایا ہے، اس کا مفہوم یہ ہو گا کہ شیطان ایک کے ساتھ رہتا ہے اور اس ایک

کی بُنْسَبَتِ دُوَّسَ زیادہ دور ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا صریح مفہوم یہ ہو گا کہ انسان دو کے بجائے تین ہو جائیں تو شیطان سے فاصلہ اور بڑھ جائے گا۔ اسی طرح

جنی تعداد بڑھتی رہے گی اتنا ہی شیطان سے فاصلہ بڑھا چلا جائے گا۔

۵۔ قرآن و حدیث کے عددی کثرت کے وجہ ترجیح ہونے کے لئے یہ دلائل قولی ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کے عمل میں یہی عددی اکثریت کی یہی اہمیت ہے یا نہیں؟

یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ہر اعتبار سے جو ایسا ز حاصل ہے اس کی بنیاد پر اگر آپ کی سلسلہ میں بھی مشورہ نہ فرماتے تو کوئی اشکال نہ تھا، اور مشورہ فرماتے لیکن مشورہ کے بعد اپنی ہی رائے پر عمل فرماتے تو اس میں بھی کسی بندہ مومن کیلئے کوئی خلجان کی بات نہ ہوتی، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ جہاں وحی کے ذریعہ حکم خداوندی معلوم ہو گیا وہاں وحی کے مطابق عمل کیا گیا اور جہاں وحی کے ذریعہ کوئی حکم نہیں دیا گیا ان معاملات میں مشورہ فرمایا عام طور پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا کسی ایک رائے پر اتفاق ہو گی تو اس کو قبول فرمایا گیا، اور اگر اتفاق رائے ہو سکتا تو آپ نے اکثریت کی رائے کو بھی ترجیح دی ہے، اگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں، ایک بار بھی کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کا ثبوت مل جائے تو وہ دستور اعمل بنانے کیلئے کافی ہے، لیکن یہ ایک سی حقیقت ہے کہ سیرت طیبہ کا مطالعہ کرنے والوں کو ایک سے زائد بار اس کا ثبوت مل جاتا ہے، عددی کثرت کی بنیاد پر فصیلے کی ایک نظریہ تو غزروہ بذر کے موقع پر اسیران بدر کے سلسلہ میں کیا جانے والا مشورہ ہے، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی قدس سرہ نے اس سلسلے میں لکھا ہے:

"بہرحال آپ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی، ابو بردیلیؓ

نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ سب قیدی اپنے خویش فاقارب اور بھائی بندھیں، بہتر ہے کہ قیدی یہ کچھ پورا دیا جائے، اس زم ملک اور احسان کے بعد ملکن ہے کہ کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود اور ان کی اولاد و اتباع ہمارے دست و بازوں نی اور چو ماں بالفضل ہاتھ آئے اس سے جہاد و غیرہ دینی کاموں میں سہارا لگے (باقي آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضافہ نہیں درج شہارت ملے گا) بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمان بھی فطی رحمدی اور شفقت و صدر حمی کی بنابرائی رائے کی طرف تھا بلکہ صحابہ کی عام رائے ای جانب تھی، بہت سے تو ان ہی وجہ کی بنار پر جوابو بکر نے بیان فرمائیں اور بعض مالی فائدے کو دیکھتے ہوئے اس رائے سے متفق تھے (کما نیزہ من ورق تعالیٰ ترمذون عرض الدنیا صبح پ الحافظ ابن حجر و ابن القیم رحمہمَا اللہُ اَعْلَمُ) حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا، حضرت عمر نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا، تمام مشرکین پر ہمیت طاری ہو جائے گی، آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور خدا کے راستے سے روکنے کا حوصلہ رہے گا، اور خدا کے آگے مشرکین ہماری انتہائی بغض و نفرت اور کامل بیزاری کا اٹھا رہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں پی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ برداہ نہیں کی اس نئے مناسبے کے ان قیدیوں میں جو کوئی ہم میں کسی کا عزیز و ذیریب پوڑا اے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

الغرض بحث و محیص کے بعد ابو بکرؓ کے مشورہ پر عمل ہوا کیونکہ کثرت رائے اور ضرورتی اور خود بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و حمت کی بنابرائی طرف

مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہ ہی رائے قرین صواب معنوں ہوتی ہے۔“

(فَاذْكُرْ جَمِيعَ الْهَدْوَفِ ۝ سورۃ الانفال آیت ۳،)

اسی ان بدر کے سلسلہ میں، قدیمی لے کر رہا کرنے کی بات جہاں روایت اور تاریخ سے ثابت ہے کہ فیصلہ کثرت رائے کی بناء پر ہوا، وہاں حضرت مولانا شبیر حمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں یہ بیان کر رہے ہیں کہ کثرت رائے کا اشارہ خود اس آیت پاک میں بھی ہے، کیونکہ عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے تین دن عرض الدنیا کر تم لوگ خام طور پر دنیوی سامان کی طرف مائل تھے، بہر حال یہ بات ثابت ہوئی کہ اسی ان بدر کے سلسلہ میں قدیمی لے کر رہا کرنے کا فیصلہ مشورہ کے بعد کثرت رائے سے کیا جانے والا فیصلہ ہے۔

سیرت طیبہ میں کثرت رائے کی بنیاد پر کتنے جانے والے فیصلے کی دوسری صب سے زیادہ واضح مثال غززادہ احمد کے موقع پر منعقد کردہ شوریٰ کا فیصلہ ہے جس میں میسد تھا کہ مسلمانوں کو مدینہ طیبہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنا چاہئے یا باہر نکل کر۔

اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ طیبہ میں رہ کر مقابلہ کرنے کی تھی، جلیل الافت دریحاب کرام عام طور پر مدینہ طیبہ کے اندر رہ کر مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کے حق میں تھے، لیکن پروش صحابہ گرام جن کی تعداد بہت زیادہ تھی باہر نکل کر مقابلہ کی رائے پر مصروف ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خواب اور اس کی تعبیر سے ہمیط لعل کیا جیسا کہ فتح اباری کے حوالے سے یہ باتیں ذکر کی جا چکی ہیں۔

چنانچہ آپ نے اپنی رائے کے علی الرغم، اکثریت کی رائے پر عمل کرتے ہوئے

مدینہ طیبہ سے باہر نکلنے کا ہی اور عزم فرمایا، عزم فرمانے کے بعد پر جوش صحابہ کرام نے اپنی رائے واپس لینے کی درخواست بھی کی لیکن آپ نے یہ کہکرد درخواست کو قبول کرنے سے انکار فرمادیا کہ پیغمبر زرہ پہنے کے بعد رائے تبدیل نہیں کیا کرتے۔

اس واقعہ میں جہاں عزم فرمانے کے بعد مشورہ قبول نہ کرنے کی حقیقت واضح ہے وہیں عزم قائم ہونے سے پہلے اکثریت کے قول کے مطابق عمل کرنے کی حقیقت بھی بالکل واضح ہے، اکثریت کے علاوہ اور کیا بنیاد ہے کہ آپ اپنی رائے، اپنا خواب، اس کی تعبیر سب کچھ بیان فرماتے ہیں لیکن چونکہ معاملہ وحی کے ذریعہ میں نہیں کیا گیا اس لئے آپ اکثریت کی رائے پر عمل کرنے کی سنت قائم فرماتے ہیں، اکثریت کی وجہ ترجیح کیسلئے اس سے زیادہ اور کیا وضاحت ہوگی کہ خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مدلل رائے، اور اپنے خواب کو بھی اسی اکثریت کی بنیاد پر ترک فرمادیا۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ عہد رسالت کے جن بعض واقعات کو امیر کے استبداد بالرائے کیلئے نظری اور دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور ان کی بنیاد پر اکثریت کی رائے کے کا عدم ہونے کا جو دعویٰ کیا جاتا ہے وہ ستر اسرائیل غلط فہمی پر مبنی ہے، اس سلسلہ میں ہرے اعتماد کے ساتھ صلح حدیبیہ کے واقعہ کو ذکر کیا جاتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام صحابہ کرام کی رائے کے خلاف بحیثیت امیریتی دفعات پر صلح فرمائی جس سے صحابہ کرام کو اتفاق نہیں تھا۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ اسی طرح پیش آیا ہوتا کہ آپ نے مشورہ کے بعد اکثریت کی لائے کو قبول فرمایا ہوتا اور محض اپنی بصیرت اور رائے کی بنیاد پر صلح فرمائی ہوتی تو یہ آپ کا خصوصی اقدام قرار دیا جاتا، آپ کا امتیازی وصف سمجھا جاتا، آپ کے اس اقدام سے دوسرے امراء کیلئے استبداد بالرائے کا جواز فراہم کرنا غلط ہوتا۔

پھر اس سلسلہ میں دوسری بات جو حقیقت ہے یہ ہے کہ صحیح حدیبیہ کو رسول کرامہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ اور رائے کی بنیاد پر طے ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کو آپ نے وحی خفیٰ کے ذریعے طے فرمایا ہے، قرآن کریم کے اشارے بھی اسی حقیقت کو ثابت کرتے ہیں اور آپ کا اس موقع پر جواب بھی۔

اس واقعہ متعلق قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :

اور وہ ایسا ہے کہ اس نے ان کے ہاتھ
تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے عین کمیں
روک دئے، بعد اس کے کہ تم کو ان پر قابو
دے دیا تھا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں
کو دیکھ رہا تھا۔ (ترجمہ حضرت تھانوی)

علامہ عینی نے "باب الشرطی الجہاد" میں اس آیت کی متعدد تفاسیر کے درمیان
کفت ایدیکم کا مطلب یہ ہے کہ تھیں یہ
حکم دیا کہ مشرکین کے ساتھ جنگ نہ کرو،
اور کفت ایدیکم عنکم کا مطلب یہ

هو الذى حف ايديهم عنكم
وابيدهم عنهم ببطن مكة
من بعده ان اظفركم عليهم و
كان الله بما تعمدون بصيرا.

(سورۃ الفتح آیت ۲۳)

ایک تفسیر بھی بیان فرمائی ہے:
(کفت ایدیکم) بان امرکو ان لا
تعاربو المشرکین وکفت ایدیهه

عنکبوت القاء الرعب في قلوبهم

سے روک دیا۔

(عہدۃ القاریٰ پختہ)

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے صلح حدیبیہ پر عام بصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"بہت سے صحابہ کرام خصوصاً فاروق عظیم اس طرح کی صلح سے نااضن تھے مگر انہوں نے مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے باشراں ربانی اس صلح کو انجام کار مسلمانوں کے لئے ذریعہ کامیابی سمجھ کر قبول فرمایا" (معارف القرآن پیغہ) گویا پروردگار عالم سورۃ الفتح میں یہ فرمادا ہے کہ اس صلح کا امیر کی ذائقہ رائے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ سب کام ہماری نگرانی میں ہوئے ہیں، جنگ سے ہاتھ ہم نے روکے ہیں، اور اس طرح قرآن کریم میں صلح حدیبیہ کو خدا کے حکم کی تعیین میں کیا جانے والا عمل قرار دیا گیا، اسی طرح خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے بھی یہی حقیقت سامنے آتی ہے، کیونکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس صلح کے بارے میں اپنا خیال ظاہر کیا تو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا :

اتی رسول اللہ، ولست اعصیه میں امیر کار رسول ہوں، میں اس کے حکم کے

وہ ناصری (بخاری جلد ۷) خوف نہیں کروں گا۔ اور اللہ میر امد و گارہے۔

حضرت اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر کے جواب میں یہیں فرمایا کہ میں امیر ہوں اور امیر کو اس طرح کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں، بلکہ آپ کا جواب تھے کہ شرائط صلح پر ہمیں اس طرح کا خیال ہے آنا چاہیے کیونکہ میری حیثیت اللہ کے

رسول کی ہے، اور میں حکم خداوندی کے خلاف ہر گز نہیں کروں گا اور الشمیرا
مدگار رہے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ صلح حدیبیہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کردار نہیں ہے،
کہ عام صحابہ سے مشورہ کیا گیا ہو اور اس میں تمام صحابہ یا عام صحابہ کی رائے صلح
کے حق میں نہ ہو لیکن اس کے باوجود آپ نے امیر کی حیثیت سے اختیارات استعمال
فرماتے ہوئے صلح کر لی ہو، بلکہ صلح حدیبیہ خالص رب العالمین نے احکام کی
تعسیل میں ہوئی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم خداوندی کو بھیت رسول
نافذ فرمایا۔

مشورہ کے باب میں محمد رسالت کے طریق کار

فی وضاحت

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مشورہ کے سلسلہ میں آپ کے طرزِ عمل کی ایسی
وضاحت ہو جائے کہ ستیزی طبیہ کے تخلف و اقتات کا سمجھنا آسان ہو سکے کیونکہ
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصی اختیارات حاصل تھے ان کی بنیاد پر آپ
تنہیاً اپنی رائے سے فیصلہ فرمادیتے تو نہ صرف یہ کہ اس کا آپ سے زیادہ کوئی خدا
نہیں تھا بلکہ تمام صحابہ کرام کی اس وقت یہ ذمہ داری ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو حضور اکرم
صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے کے مطابق مطمئن کریں، لیکن ستیزی طبیہ اور حدیثِ پاک
کا مطالعو کرنے والے کو اس طرح کی ایک بھی واضح نظری نہیں ملتی کہ آپ نے اکثریت
کی رائے کو قبول نہ کر کے محض اپنے اختیارات استعمال فرماتے ہوئے کسی معاملہ کا

فیصلہ فرمادیا ہو، بلکہ ستیز طبیبہ کامطاوعہ کرنے والوں کو جو باتیں اور بنیادیں ملتی ہیں وہ یہ ہیں :-

۱۔ جن معاملات میں دھی کا نزول ہو گیا، یا اشاراتِ ربانی یعنی دھی خفیٰ سے ان کی وضاحت ہو گئی ان تمام معاملات میں آپ نے حکم کے خلاف کسی کامشوہ قبول نہیں فرمایا اور ان احکام کو بحیثیت پغیرنافذ فرمادیا جیسے صلح حدیبیہ، کو دھی خفیٰ کے ذریعہ آپ کو حکم خداوندی سے مطلع کر دیا گیا تھا، آپ نے اس سلسلہ میں کسی کامشوہ قبول نہیں کیا بلکہ حکم کو بحیثیت پغیرنافذ فرمادیا۔

۲۔ جن معاملات میں یہ صورت نہیں ہوئی ان میں مشورہ کیا گیا، مشورہ کے دوران وہ نازل ہو گئی تو مشورہ ترک کر کے دھی کے مطابق عمل ہو رآمد کیا گی، جیسے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سلسلہ میں افک اور بہتان کا معاملہ، کہ آپ ابھی مشورہ ہی فرمائے تھے کہ قرآن کریم میں حضرت عائشہؓ کی براحت کا حکم نازل ہو گیا۔ تو آپ نے مشورہ ترک فرمادیا، اور اتهام تراشی کرنے والوں پر حجۃ قذف جاری فرمادی گئی۔

۳۔ مشورہ کی بات مکمل ہو گئی تو عام طور پر ایسا ہوا ابتداء تو رائے خواہ ایک یا دو ہی افراد کی رہی ہے لیکن عام صحابہؓ کرام کا اس نقطہ نظر سے اتفاق ہو گیا تو اسی کو نافذ کر دیا کر دیا گیا جیسے غزوہ خندق کے موقع پر، خندق کی رائے ابتداء تنہا حضرت سلمان فارسی کی تھی لیکن ان کی تنہا ہی کی رائے پر تمام صحابہؓ متفق ہو گئے۔

۴۔ اور اگر صحابہؓ کرامؓ کا اتفاق رائے نہ ہو سکا تو آپ نے اکثریت کی رائے کے مطابق عمل درآمد فرمایا جیسے غزوہ بدربالیں اسیران بدروں کو زردی یا کچھورا دینے کے مسئلہ میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ فرمادیا، یا غزوہ احمد کے

کے موقع پر مدینہ کے اندر رہ کر، یادیہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں مشورہ فرمایا اور کثرت رائے کے مطابق مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کرنے کا حکم دیا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل امور مشورہ طلب کے سلسلہ میں مندرجہ بالا تفصیلات پر مشتمل ہے، لیکن امراء کے لئے استبداد بالرائے کا نقطہ نظر پیش کرنے والوں سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے مختلف روایات کی حقیقی نوحیت پر غور نہیں کیا، مثلاً ہبھی صورت، یعنی وحی خفی کے ذریعہ دینے جانے والے احکام خداوندی کو انہوں نے امور مشورہ طلب میں امیر کے اختیارات اور بالادستی کا مقیس علیہ بنایا، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی کے لئے اس کی بحاجت نہیں تھی۔

اسی طرح دوسری صورت، یعنی دوران مشورہ، وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت کے اس نقطہ نظر نے یعنی لئے کہ مشورہ کی کوئی خاصی ہمیت نہیں ہے، امیر قبول مشورہ یا ترک مشورہ میں آزاد ہے، حالانکہ وحی کے ذریعہ صورت حال کی وضاحت سے امیر کے اختیارات کی وسعت پر استدلال درست نہیں۔

تیسرا صورت، یعنی ایک دو افراد کی وہ رائے جس پر اتفاق ہو جائے، یہ رائے اگرچہ اصلاح اقلیت کی تھی، لیکن اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد، یہ اکثریت کی نہیں سب کی رائے ہو گئی ہے، امیر کو بالادستی دینے والے نقطہ نظر کو اس طرح کے واقعات سے یہ غلط نہیں ہوئی کہ امیر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اقلیت یا اکثریت میں بے کسی بھی رائے کو ترجیح دیدے، حالانکہ اتفاق رائے حاصل ہو جانے کے بعد اقلیت کی ترجیح یا امیر کے اختیارات کی وسعت سے اگر طرح طرح کے واقعات کا کوئی تعلق نہیں۔

چونھی صورت یعنی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کے معاملات سے متعلق امیر کی بالادستی اور مطلق العنان کا نقطہ نظر رکھنے والوں کی جانب سے جوتا ویل کی جاگئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر امیر کی رائے اکثریت کے حق میں ہو تو وہ اکثریت کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے، لیکن بعض دعوات ایسے بھی ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے اکثریت کے ساتھ نہیں ہے جیسے غزدہ احمد کے موقع پر مدینہ سے باہر نکل کر مقابلہ کی رائے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نہیں تھی، اس سلسلہ میں یہ نقطہ نظر غالبًاً مصلحت کا سہارا لے گا کہ اگر امیر اپنی رائے کے خلاف مصلحت یہ سمجھے کہ اسے اکثریت کی رائے قبول کرنی چاہئے تو اس میں کوئی تنقیح نہیں۔

لیکن یہ سب تاویلات ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مشورہ کی جو تفصیلات ہیں، ان سے یہ بات واضح ہے کہ آپ نے دھی کے ذریعہ ہدایت پالیئے کے بعد مشورہ نہیں فرمایا، وحی کا نزول جن معاملات میں نہیں ہوا ان میں مشورہ فرمایا، دوران مشورہ وحی نازل ہو گئی تو مشورہ ترک کر دیا۔ اور اگر آخر تک وحی کے ذریعہ نہیں فرمائی گئی تو مشورہ میں اگر اتفاق ہو گیا تو اس پر عملدرآمد کیا گیا، اتفاق رائے نہیں پوسکا تو اکثریت کے مطابق فیصلہ کر کے نافذ کر دیا گیا۔ واثر اعلم

اکثریت رائے خلافت اشده میں

۶۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ستیر پاک میں اکثریت یہ عمل کرنے کی نظریہ کے بعد خلفاء راشدین کے عہد میں دیکھا جائے تو یہ پوری تاریخ اس طرح کے دعوات سے

بُشَرِیز ہے۔

یہ بات تفصیل سے گذرا چکی ہے کہ رسول کرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو حیثیت آپ کی ذات کو حاصل تھی، آپ کی وفات کے بعد اب وہی حیثیت آپ کی سنت کو حاصل ہے، اور آپ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پیش مددہ مسائل میں فان تنازع عتمہ فی شئی فردودہ الی اللہ، والرسول پر عمل کرتے ہوئے ہمیشہ کتاب سنت کی طرف مراجعت کر کے حل تلاش کیا ہے۔

یہ بحث بھی گذر چکی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب کوئی نیا معاملہ آتا تو وہ اس کو قرآن و حدیث میں تلاش کرتے وہاں نہ ملتا تو صحابہ کرام سے ان کے گھر جا کر ملاقات کرتے اور اس میں بھی کامیاب ہوتے تو صحابہ رائے صحابہ کو جمع کر کے ان کے سامنے مسئلہ رکھتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی معمول تھا، عام طور پر قرآن و حدیث کے سامنے آجائے کے بعد اتفاق رائے ہو جاتا۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ قرآن و حدیث کی طرف مراجعت میں، خفار یا نطاہری تعارض کے سبب یا امور انتظامیہ میں اختلاف رائے کے باعث اتفاق نہ ہو سکا تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا۔

خلافت راشدہ کے پورے عہد میں ایک تنظیر بھی اس طرح کی پیش نہیں کیجا گئی کر خلیفۃ المؤمنین نے محض اپنی رائے کو یا اقلیت کی رائے کو یہ کہنا فذ کیا ہو کہ ایسا کرنا اس کے اختیار نمیزی میں داخل ہے، البتہ اس طرح کے متعدد واقعات میں گے کہ خلیفۃ المؤمنین اپنی مدلل اور منسوب طرائے کو نفاذ سے محض اس نئے روکے ہوئے میں کہ اکثریت ان کے حق میں نہیں ہے۔

بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ خود خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی خلافت کا انعقاد بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہوا ہے، تاریخ کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ سقیفہ نو ساعدہ میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی بھاری آکٹ نے کیا ہے۔ بنو هاشم کے خواص اور انصار کے شیخ قبیلہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی رائے اس وقت ان کے حق میں نہیں تھی۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بائے میں مشورہ کی تو مشورہ کی خصوصی مجلس میں اختلاف ہو گیا، پھر جب آپ نے رائے عالمی معلوم کی تو وہ بالاتفاق حضرت عمرؓ کے حق میں گئی اس لئے یہ انتخاب بھی شوریٰ اور کثرتِ رائے سے ہوا یہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چونفری مجلس شوریٰ نامزد کی تھی، اس نے بھی حضرت عثمان غنیؓ کے حق میں فیصلہ رائے عامہ کی کثرت دیکھ کر کیا ہے۔ اور اسی رائے عامہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے حضرت عثمان غنیؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ کے ہاتھ پر سعیت کی گئی ہے۔

خلافت راشدہ میں عددی کثرت کے فیصلہ کن ہونے کی سب سے عمدہ وضاحت، حضرت عمرؓ کی نامزد فرمودہ چونفری مجلس شوریٰ کی تفصیلیٰ سے ہوئی ہے کیونکہ حضرت عمرؓ نے ان حضرات کو یہ ہدایت کی تھی کہ اگر اتفاقِ رائے سے انتخاب علیؓ میں آجائے تو سب سے اچھی بات ہے، اور اگر اختلافِ رائے ہو جائے، تو

اکثریت کے مطابق انتخاب کیا جائے، اور اقلیت اگر فیصلہ تسلیم نہ کرے تو اسکو عبرناک سزا دی جائے، اس موضوع پر علامہ شاطیبی الاعتصام میں لکھتے ہیں:-

عمر بن میمون اور دی میمون اور دی کے روایت ہے کہ

جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے کاری زخم آگاہ توانخوں نے حضرت صہیبؓ کے ہب کر آپ تین دن تک نمازی پڑھاتے رہیں۔

اوہ میرے پاس عثمان، علی، طلو، زبیر، معد اور عبد الرحمن آجائیں، ابن عمرؓ اس گھر میں متود رہیں گے لیکن وہ اس انتخاب میں

امیدوار نہ ہوں گے اور فرمایا کہ صہیبؓ!

تم ان لوگوں کے سر پر تلوار لے کر کھوٹے رہنا اگر پنج آدمی کی کے ہاتھ پر بیعت کر لیں اور ایک اس چیز کو قبول نہ کرے تو اس کے سر پر تلوار مار دینا۔ اور چار بیعت کر لیں اور دو انکار کر دیں تو ان دونوں کے سر پر تلوار مار دینا پہاں تک کرو وہ ایک آدمی پر اعتماد کا اظہار کریں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کثرت رائے کے ذریعہ کئے گئے فیصلہ کو شریعت کا اتنا حکم اور یقینی فیصلہ قرار دے رہے ہیں کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو قتل

روی عن عمرو بن میمون الاددی

قال: قال عمر بن الخطاب حين

طعن - لصهیب - صل بالناس

ثلاثا ولیدخل عن عثمان، وعن د

طلحة والزبير وسعد وعبد الرحمن

وليد خل ابن عمر في جانب البيت

وليس نه من لا مرثى . فقم

يا صهيب عن رؤسهم بالسيف

فإن بايهم خمسة ونكس واحد

فاجلد راسه بالسيف وان بايهم

اربعة ونكس رجلان فاجلسه

رؤسها بالسيف حتى يستوثقو .

(الاعتصام بـ ۶۵)

جیسی سخت سزا کا مستحق قرار دے رہے ہیں، اگر کثرت رائے مغض ظنی دلیل ہوتی تو شاید یا آخری سزا تجویز نہ فرماتے۔

اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ واقعہ تاریخ کی تمام کتابوں میں موجود ہے،

ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

حضرت عمرؓ نے حضرت مقداد سے کہا کہ
کجب تم مجھے قبریں رکھ د تو ان لوگوں کو ایک
گھر میں جمع کر دینا تاکہ یہ اپنے ہی میں سے ایک
کا انتخاب کر لیں اور حضرت صہیبؓ کے فرمایا
کہ تم تین یوم تک نماز میں پڑھانا اور علی، عثمان،
زبیر، سعد، عبدالرحمٰن بن عوف اور طلحہ اگر
آجاییں (اور وہ ان دونوں مدینہ میں نہ تھے)
کو ایک جگہ جمع کر دیں اور عبدالثر بن عمر کو بھی
بلاینا مگر و خلافت کے لئے امیدوار نہیں
بن سکیں گے۔ اور اے صہیب! تم ان کے
سر پر مسلط رہتا، اگر پانچ ایک پر اتفاق کئے
اسکو منتخب کر لیں اور ایک انکار کرے تو
اس کے سر کو تلوار سے اڑا دینا اور اگر چار
کسی ایک پر اتفاق کر لیں اور دو انکار کر دیں
تو دونوں کا سراڑا دینا اور اگر تین کسی ایک

وقال للْمَقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ أَذَا
وَضَعَتْهُنِي فِي حَفْرٍ فَاجْمَعَهُ لَهُ لَمْ
الْسَّرْهَطَ فِي بَيْتِ حَتَّى يَخْتَارُ
رَجُلًا مِنْهُمْ وَقَالَ لَصَهِيبِ صَلَّى
بِالنَّاسِ ثَلَاثَةَ إِبَامَ وَادْخُلْ عَلَيْهَا
وَعَثَمَانَ وَالْزَيْدَ وَسَعْدًا وَعَبْدَ الرَّحْمَنَ
بْنَ عَوْفٍ وَطَلْحَةَ أَنْ قَدْمَ (وَكَاغَابَا)
وَاحْضَرَ عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ، وَلَا شَئَ
لَهُ مِنَ الْأَمْرِ وَقَمَ عَلَى رُؤْسِهِمْ فَانْ
اجْتَمَعَ خَمْسَةٌ وَرَضُوا رِجْلًا وَابِي
وَاحِدَ فَاشْدَخَ رَاسَهُ بِالسِّيفِ
وَانَ اتَّفَقَ أَرْبَعَةٌ فَرَضُوا رِجْلًا
مِنْهُمْ وَابِي اشْنَانَ فَاضْرَبَ رُؤْسَهُمَا
فَانْرَضَى ثَلَاثَةٌ رِجْلًا وَثَلَاثَةٌ رِجْلًا
فَحَكَمُوا عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عُمَرَ

متفق ہوں اور دوسرے تین کسی دوسرے پر
متفق ہوں تو عبداللہ بن عمر کو حکم بناینا وہ جس
فریت کے حق میں رائے دیں وہ فریت پانے میں
کسی کو منتخب کر لے اور اگر عبداللہ بن عمر کے
فیصلے سے رضامند نہ ہوں تو ان لوگوں کے
 صالح رہنا جن میں عبدالرحمن بن عوف ہوں۔
اور باقی حضرات اگر لوگوں کے منتخب کردہ
امیر سے اختلاف باقی رکھیں تو ان کو قتل

فای الفریقین حکم لے
فلیختار و ارجلا منهحر
فان لم يرضوا بحکم
عبدالله بن عمر فکونوا
مع الذين فيهم عبد الرحمن
بن عوف واقتدوا بالباقين
ان ربنا عاصما الجتم عليه
الناس

(تاریخ الامم الاسلامیہ) ص ۲۳ کر دیا جائے۔

یہاں سب سے پہلے ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ان
ہدایات میں کثرت رائے کے وجہ ترجیح ہونے کی اس طرح وضاحت کردی گئی ہے کہ
اس سے زیادہ ممکن نہیں، کیونکہ کثرت رائے کے بعد، خلاف ورزی کرنے والوں کو
وہ سب سے آخری یعنی قتل تک کی سزا کی ہدایت دے رہے ہیں، اگر کثرت رائے کے
ذریعہ کیا گیا فیصلہ شریعت کی نظر میں ذرا بھی کمزور ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہرگز
اتنا اہم اقدام کرنے کی ہدایت نہ دیتے، کثرت رائے کے محبت قطعیہ ہونے کے
علاوہ بھی اس واقعہ میں متعدد باتیں توجہ طلب ہیں اور ان میں مختلف نتائج
اخذ کئے جا سکتے ہیں:

(الف)۔ خلیفہ کے انتخاب کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک چھ
سنفری مجلس شوریٰ نامزد فرمائی ہے، معلوم ہوا کہ شوریٰ کے لئے افراد

کی نامزدگی جائز ہے اور جس کام کے لئے جو حضرات نامزد کے گے ہیں انہی سے مشورہ کرنا ضروری ہو گا، وار دین و صادرین سے کیا جانے والا مشورہ، مقرر کروہ افراد کے مشورہ سے بے نیازی کا سبب نہیں بنے گا، کیونکہ حضرت عمر نے نامزاو افراد کے علاوہ دوسرے حضرات کو اس معاملہ میں شرکت سے منع فرمایا تھا۔

(ب) — خلیفہ کے انتخاب کے سلسلہ میں شوری پر اعتماد کا مطلب یہ ہوا کہ امور انتظام کا سب سے بڑا سلسلہ شوری کے زیر اختیار ہے تو اس سے کم درجہ کے معاملات وسائل کیلئے شوری کا با اختیار بنا یا جانا بدرجہ اولیٰ درست اور جائز ہو گا۔

(ج) — ان چھوٹے حضرات کو حضرت عمر نے جو ہر ایسی دی ہیں ان میں کثرت رائے کے ذریعہ انتخاب کی بات بالکل بدیہی ہے اور اس سلسلہ میں وہ اس قدر وضاحت فرمائے گئے ہیں کہ اختلاف پائیج اور ایک ہی کا نہیں بلکہ تین اور تین کا اختلاف بھی اگر ترجیحی رائے کے ذریعہ فیصلے تک ہنچ جائے تو اب اقلیت کا اس فیصلے سے انحراف جائز نہیں اور ان کو سخت سے سخت سزا دی جاسکی۔

(د) — شوری کو حضرت عمر نے تین دن کے اندر انتخاب کے اعلان کا پابند بنا یا تھا، معلوم ہوا کہ ان تین دنوں میں مسلمانوں کا زمام اقتدار فردوادھ کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اخیار امت پر مشتمل چھنٹھنگری جماعت شوری کی ہمیت جماعی کے ہاتھ میں تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ خیر القرون میں بھی زمام اقتدار چند ہی روز کے لئے ہی، لیکن ہمیت اجتماعی کے ہاتھ میں رہی ہے۔

(۴) — خلیفہ کے نصب اور تقرر کا اختیار دینے کے معنی یہ ہیں کہ اگر خلیفہ سے الی باتیں صادر ہو جائیں جو شرعاً قابل برداشت نہیں تو شوری یا ارباب حل و عقد، اس کو معزول کر دیں گے، کیونکہ نصب اور تقرر کا اختیار دینے کے بعد عزل کا اختیار نہ دینے پر کوئی دلیل قائم نہیں بلکہ تمام اہل عقل کااتفاق ہے کہ جسے نصب کا اختیار ہوا ہے اسے عزل کا بھی اختیار ہوتا ہے۔

(۵) — جب خلافتِ عالیہ جیسے اہم منصب کا یہ معاملہ ہے تو اس سے نیچے کے مناصب پر اگر شوری کو بالادستی دے دی جائے اور کسی دستور اساسی کی رو سے اعلیٰ کامعہ ہدایت ہو گیا ہو تو مرتکہ کہ یہ جائز ہے بلکہ اس کی پابندی کرنا واجب ضروری ہے، کہ کثرت رائے کے فیصلہ کن اور شرعاً جماعت ہونے کے باعث میں خلافت راشدہ میں تنہایہی واقع نہیں ہے بلکہ اگر عہد خلافت کا پیغام غائر مطالعہ کیا جائے تو صاف طور پر معلوم ہو گا کہ اگرچہ عصر حاضر کی طرح اقلیت و اکثریت کے تعین کے لئے باقاعدہ رائے شاری تو نہیں کی گئی لیکن اختلاف کی صورت میں کثرت رائے ہی کے ذریعے فیصلہ کیا گیا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب بھی کوئی مسئلہ شوری میں آیا تو حدیث و قرآن کی طرف مراجعت کی اگر کوئی کوئی صورت نکل آئی تو عام طور پر اختلاف رائے ہو گیا لیکن اگر کوئی انتظامی معاملہ ایسا پیش آیا جس میں کتاب و سنت کی طرف مراجعت کر کے فیصلہ نہیں کیا جاسکا، یا مسئلہ انتظامی نہیں دینی ہی تھا لیکن کتاب و سنت کی طرف مراجعت میں ابہام یا تعارض کی بنیاد پر اختلاف رائے ہو گیا تو ان دونوں صورتوں میں کثرت رائے کی کو فیصلہ کن قرار دیا گیا ہے، ہم ان دونوں طرح کے مسائل کی ایک ایک نظر پر شیش کرتے ہیں۔

(الف) — پہلے مسئلہ کی تضییر جنگ نہادنڈ کے موقع پر کئے گئے مشورہ کے بعد فیصلہ ہے، مسئلہ یہ ہے کہ مجاز جنگ سے جو خبریں آرہی ہیں ان کی بنیاد پر خلیفۃ المؤمنین بذات خود مجاز پر جانا ضروری نہیں ہے اور بھی بہت سے مسلمان اس قدم کو مناسب نہیں ہیں لیکن بہت سے اہل رائے خلیفۃ المؤمنین کے قیاد جنگ پر جانے سے اختلاف رکھتے ہیں، اب یہ ایک ایسا انتظامی مسئلہ ہے جس کا قرآن و حدیث میں مذکور ہونا بعید از قیاس کے۔ اس نے جو مجلس شوریٰ متعین ہے وہ کتابی سنت کی طرف مراجعت کی کوشش کے لئے نہیں بلکہ خود اس مسئلہ کے نتائج دعوا قب پر غور کرنے کے بہتر صورت حال کی تلاش و تجویز کے لئے ہے چنانچہ یہاں فیصلہ کثرت رائے کی بنیاد پر کیا گیا، مولانا شبیل نعلیٰ نہیں ہیں:-

”اللّٰهُ مِنْ جَنْبِ نَهَاوَنْدَ كَاسْكَتْ مُرْكَبْ پِيشْ آيَا اور عَمَيْوُنْ نَهِيْ اس سردار سانان سے طیاری کی کرو گوں کے زردیک خود خلیفۃ وقت کا اس نہم پر جانا ضروری تھہرا تو بہت بڑی مجلس شوریٰ متعین ہوئی، حضرت عثمان، طلحہ بن اشہر زبیر بن اعوام اور عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہم باری باری کھڑے ہو کر تقریب پیش کیں اور کہا کہ خود آپ کا موقع پر جانا مناسب نہیں، پھر حضرت علی کھڑے ہوئے اور ان لوگوں کی تائید میں تقریر کی غرض کثرت رائے سے ہری فیصلہ ہوا کہ خود حضرت علیؓ موقع پر نہ جائیں۔“ (الفاروق ص ۱۲)

(ب) — دوسرے مسئلہ کی تضییر عراق و شام کی زرخیز زمینوں کے مجاہدین کے درمیان تقسیم کرنے کا مسئلہ ہے، یہ انتظامی مسئلہ نہیں ہے دینی مسئلہ ہے، جب یہ علاقے فتح ہوئے تو مجاہدین نے جن میں صحابہ کرام و رتابیین

تھے ان سینوں کے تقیم کرنے کا مطابر کیا، ان کے پیش ظفر قرآن کریم میں مال غیرمت کی تقیم کا واضح حکم تھا، حضرت عبدالرحمن بن عوف حضرت زبیر بن العوام اور حضرت جمال بن رباح رضی اللہ عنہم نے اس موقع پر بہت اصرار کیا، عام جواہد بن کی رائے بھی یہی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے یہی کہ مال غیرمت کی تقیم کا قرآنی حکم اموال نقولہ کے بارے میں ہے، اموال غیرنقولہ اس کے ذیل میں نہیں آتے، خوفزدگیا جائے کہ قرآن کریم میں واعلموا اندماً غنسته من شئی کا حکم موجود ہے، لیکن ایک فرقہ اس کو عام سمجھ کر زمینوں کی بھی تقیم کے حق میں ہے اور دوسرا فرقہ مال غیرمت کو صرف اموال نقولہ سے متعلق کئے ہوتے ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فرمے اہل مشورہ کو جمع کیا جس میں ہبہ جریں اور انصار کے دونوں قبیلوں اوس خرزج میں پانچ پانچ روپ سا شرک کیے کئی دن تک مسلمانوں کی بحث ہوتی رہی، پھر حضرت عمر فرمے اپنے موقف پر قرآن کریم کی تین آیات سے استدلال کیا، سورہ حشر کی ان آیات میں نہ سرمایا گیا ہے : ما افاء اللہ علی رسولہ من اهل القری فلش و للرسول الایت، اسکی آیت میں فی یعنی مال غیرمت کا ذکر اور اس کے مصارف کا بیان ہے اس کے بعد للفقراء الذين اخربعوا من دیارہو میں ہبہ جریں کو مصرف فی میں داخل کیا گیا ہے اس کے بعد والذی یعنی تبؤوا الدار والایمان من قبلهم یجبو ن من هاجر الیہو الایت میں انصار کو بھی مصرف فی میں داخل کیا گیا ہے، پھر اس کے بعد والذین جاء و من بعد هم یقونون ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذين سبقونا بالایمان الایت میں قیامت تک جتنے لوگ ہبہ جریں انصار

کے اتباع کرنے والے آئندگے ان سب کو فی کام صرف قرار دیا گیا ہے، اب اگر ان زمینوں کو مجاہدین پر قسم کر دیا جائے تو بعد میں نے والوں کیلئے ان سے استفادہ کی کوئی راہ نہیں رہ جاتی، بعد میں انے والوں کے لئے اس زمین سے استفادہ کا صرف سیکھ راستہ ہے کہ ان زمینوں کو حکومت کی تحریکیں ملک کر ان کی آمد فی کو ان مصارف پر صرف کیا جائے، چنانچہ حضرت عمرؓ کے اسی زبردست استدلال کے بعد رائے عامران کے موقف کی تائید میں گئی، چنانچہ چند صحابہ کرام کا اختلاف اس کے باوجود باقی رہا۔ مگر کتاب سنت کی طرف مراجعت کی کوشش میں تعارض کی بنابر اختلف رائے ہوا تو کثرت رائے کو فیصلہ کن قرار دیا گیا۔

انہی دو نظریوں پر انحصار نہیں ہے، بلکہ خلاف راشدہ میں عام طور پر سائل کے حل کے لئے مجلس شوریٰ نے کتاب سنت کی طرف مراجعت کی ہے اور جب کوئی مسئلہ صاف ہو گیا ہے تو عام طور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے اور اختلاف باقی رہا ہے تو کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ کیا گیا ہے۔

کثرت رائے فقہاء کی نظر کریں

— نصوص شرعیہ، اور عہدہ رسالت نیز خلاف راشدہ کے تعامل سے کثرت رائے کا جمیت شرعیہ ہونا معلوم ہو چکا ہے لیکن مناسب ہو گا کہ اس موقع پر یہ بھی بیان کر دیا جائے

لہ پیغمبر کتاب الحج امام ابو یوسف، ازالۃ الخفا، الفاروقی اور شیخ الکریم فی سیاست النبی الائیں سے ماخوذ ہے۔

کر یہ کثرت رائے بعد میں نے وار فقہا کے یہاں بھی جماعت شرعی کے طور پر موجود ہے، اگر کسی مسئلہ میں فقہا کا اختلاف رائے ہو تو وہاں کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کا اصول موجود ہے۔ کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح کی بات دو موقعوں پر کہی گئی ہے، ایک صورت یہ ہے کہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں ائمہ احناف سے کوئی قول منقول نہیں ہے اور فقہاء متاخرین کے یہاں اس مسئلہ میں اختلاف رائے ہو جائے تو اس سلسلہ میں شرح عقود رسم لمفتي میں یہ حکم لکھا گیا ہے :

اگر اس تازہ واقعہ میں ائمہ احناف کی جانب
کے کوئی ظاہر جواب ہو اور متاخرین نے اس میں ایک
ہی قول کیا ہو تو اس ایک ہی قول کو لیا جائے گا.
اور اگر فقہاء متاخرین کے درمیان اختلاف ہو جائے (یعنی کئی
اقوال منقول ہوں) تو کثرت رائے کے قول کو لیا جائیگا۔

ویکھئے یہاں صاف یہ لکھا ہے کہ اگر ائمہ احناف کے کوئی حکم منقول نہ ہو
اور متاخرین کے یہاں اختلاف رائے ہو جائے تو ایسی صورت میں کثرت رائے کا اعتبار
ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی جائے گی جسے اکثریت فقہاء کی تائید حاصل ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مسئلہ میں دو قول ہیں اور دونوں ہی کو صحیح قرار
ریا گیا ہے، ان دونوں صحیح اقوال میں ایک قول کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں شرح عقود
رسم لمفتي میں ہے:-

چھٹا اصول یہ ہے کہ اگر دو صحیح شدہ اقوال میں

ایک قول ایسا ہو کہ جس کو عام مشائخ نے اختیار

واد الحجوج في الحادثة عن
واحد منهم جواب ظاهر و تکلو
فيه المشائخ المتاخرون قول واحدا
يؤخذ به . فأن اختلفوا يأخذ بقول
الإكثرين . (شرح عقود رسم لمفتي م)

الحادي ما إذا كان أحد القولين

المصححين قال به جل المشائخ العظام

فقیہ البیدری علیہ السلام اسناد المقربین
کیا ہے تو الا شباء پر بیری میں کم ہے کہ اسی
صورت میں مشارک کے نزدیک طی شدہ بات
ہے کہ اگر مسئلہ میں اختلاف ہو جائے تو وہ قول سبز
فی المسئلۃ فَالْعِبْرَۃُ بِمَا قَالَ اللَّا کثُرٌ
(شرح صورۃ الْمُغْنی ص ۷)

وکیہ لیا جائے کہ اختلاف مسئلہ میں اکثریت کے قول کو ترجیح دینے کی بات
اصول طور پر فقیہوں کے بیان مسلم ہے، جب دینی معاملات میں بھی اختلاف کی صورت
میں اکثریت کا قول معتبر ہے تو انتظامی معاملات میں اکثریت کے قابل اعتبار ہونے
کا دعویٰ قابل قبول نہیں ہو سکتا بلکہ عقل سليم کا تقاضہ ہے کہ جب دینی مسائل میں
اکثریت کا قول معتبر ہے تو انتظامی معاملات میں اس کو بدرباج اولیٰ معتبر ہونا چاہئے،
کیونکہ دینی مسائل میں تو ترجیح کا ایک اور طریقہ موجود تعالیٰ کتاب و سنت کی طرف
مراجعت، لیکن اس کے باوجود ایک قول پراتفاق نہ ہو سکتا تو جس معاملہ میں ترجیح کی
کوئی صورت نہ ہو وہاں بدرباج اولیٰ کثرت رائے کی بنیاد پر ترجیح دی جا کے گی۔ ہاں
اگر ترجیح کا کوئی اور طریقہ متعین کریا گیا ہو جیسے قاعدہ اندازی یا تحریک و غیرہ، یا پہلے متعین
نہ ہو بلکہ بروقت متعین کریا جائے تو انتظامی معاملات میں ان تمام ہی صورتوں پر عمل کرنے کے
گنجائش ہے۔

غرض یہ ہے کہ کثرت رائے کے وجہ ترجیح یا شرعاً معتبر ہونے کے لئے قرآن کریم
امدادیث پاک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، خلفاء، راشدین کا عمل اور فقیہوں کرام
کی تصریحات سب ہی موجود ہیں، اس لئے اگر شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے تو ایک
صورت میں اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے میں شرعاً کوئی تنگی نہیں ہے۔

اگر اکثریت پر فصیلے کی بات باہمی معاہدہ یا رسول انسانی کی صورت میں لے کر لی گئی ہو تو پھر صرف اکثریت ہی کی بنیاد پر فصیلہ کرنے ضروری ہو جائے گا۔

مجلس شوریٰ میں امیر کی رائے کا درجہ

اس موقع پر ایک بحث کی تفہیق بھی ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مجلس شوریٰ میں اختلاف رائے ہو جائے اور اکثریت کی بنیاد پر ترجیح دی جا رہی ہو تو امیر کی رائے کا کیا درج ہو گا، اس موضوع کی سب سے عمدہ وضاحت حضرت عمر فیض اللہ عنہ کی عراق اور شام کی زرخیز مفتونہ زمینوں کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بلاں گئی مجلس شوریٰ میں کی گئی تقریر کے تمہیدی کلمات سے ہوتی ہے۔ یہ تمہیدی کلمات حضرت امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الحراج میں حدیثی غیر واحد من علماء اهلالمدینۃ کہہ کر نقل فرمائے ہیں، یعنی قاضی ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مجھے متعدد علماء آپلے مدینۃ نے بیان فرمایا کہ جب عراق و شام کی زمینوں کے تقسیم کے مسئلہ پر غور و خوض کے لئے حضرت عمر فرض نے مهاجرین و انصار کے نامندوں پر مشتمل مجلس شوریٰ منعقد کی تو اس موقع پر ارشاد فرمایا:

جب سب جمع ہو گئے تو حضرت عمر فرض نے باہم تعالیٰ کی حدوثی کے بعد فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو مرف اپس لئے خلیف دیا گا کہ آپ سن رامانت میں شرک کیں جو میکروں پر ڈال دیا گیا اور اس مجلس شوریٰ میں بریثیت بھی تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

فلما اجتمعوا حمد اللہ و اشتبه علیہ
بما هوا هله ثم قال انی لروا عجمكم
اذا لان تسترکو افی امامتی فبما
حملت من امورکم فانی واحد
کاحد کو (کتاب فراز قاضی ابو یوسف ص ۳۴)

حضرت عمرؓ کا ارشاد اپنے واحد کاحد کو شوریٰ کے موقع پر امیر کی رائے کا درجہ معین کرنے میں نقش صریح کا درجہ رکھتا ہے اس تہبیدی تصریح میں آگے یہ بجا شا فرمایا کہ تمہارے سامنے قرآن موجود ہے، میں نہیں چاہتا کہ آپ میری ہوئی (خواہش، یعنی رائے) کے مطابق بات کہیں بلکہ قرآن کریم کے مطابق جو صحیح موقف ہو اس کے مطابق رائے دیں۔ میری رائے تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

غور فرمایا جائے کہ حضرت عمرؓ یہ نہیں فرماتا ہے ہیں کہ مجلس شوریٰ کے انعقاد کی وجہ یہ ہے کہ آپ حضرات اپنی اپنی رائے دیں، اگر اختلاف ہوتا ہے تو بحیثیت امیر مجھے یہ حق ہو گا کہ اقلیت، اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی ایک موقف کو ترجیح دیوں بلکہ آپ پوری وضاحت کے ساتھ یہ فرماتا ہے ہیں کہ میں بھی شوریٰ کا ایک فرد ہوں۔ اور میری رائے بھی تم میں سے کسی ایک فرد کے برابر ہے۔

امیر کی رائے کا یہ درج کہ اس کو کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے، اگر حضرت عمرؓ کی جانب سے منعین فرمایا گیا ہو تب بھی اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے واجب التسلیم ہوتا، لیکن اس کی اہمیت اس لئے اور زیادہ بڑھ گئی ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس طرح کے الفاظ منقول ہیں، مجمع الزوائد میں ہے:

حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حضرت معاذؓ کو کہنے کا ارادہ کیا تو مصحابہ کرام سے مشورہ کیا جن میں حضر ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابوبکرؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت اسید بن حفیظؓ تھے

عن معاذ بن جبل ان رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم لما اراد ان يسرح معاذاً الى اليمين فاستشار الناس من اصحهٗ فيهما أبو بكر و عمرو و عثمان و على و طلحة وزبير و اسید بن حفسير

جب آپ نے مشورہ کیا تو حضرت ابو بکر رضی عنہ نے
فرمایا کہ اگر آپ ہم سے مشورہ نہ فرماتے تو ہم کو عرض
نہ کرتے، آپ نے فرمایا کہ جن معاملات میں میرے پاس
وہی نہیں آتیں ہیں، میں تم میں کسی ایک کے بذراً
ہوں، چنانچہ اس کے بعد ہر انسان نے اپنی رائے
ناستشار ہم فقال ابو بکر
لولا اسئلہ استشر تنا
ماتکدمنا فقال انی فیما
لم یوہ الی کاحد کم قال
فتکلم کل انسان برایہ الی آخر
الحدیث - (مجمع الزوائد ج ۱۵)

اس روایت میں جو مجمع الزوائد میں طبرانی کی ابومکبیر نقل کی گئی ہے ایک
راوی ابوالعطوف کے بارے میں لکھا ہے لو ارمن ترجیحتہ یعنی ان کے احوال کی طلاق
نہیں ہے، لیکن بقیہ تمام روایات کے بارے میں توثیق کی گئی ہے، اس روایت میں
ان فیمالحریۃ الی کاحد کو فرمایا گیا ہے کہ جو بائیں وحی کے ذریعہ معلوم نہ ہوں ان میں
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں بھی تم میں سے کسی ایک کو
طرح ہی ہوں۔

کتنی صاف بات ہے کہ مجلس شوریٰ مغفرد ہوئی ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی عنہ
نے ارشاد فرمایا کہ حضرت! آپ نے مشورہ طلب کیا تو ہم اپنی رائے ظاہر کر رہے ہیں
اگر آپ کی اجازت نہ ہوتی تو انہمارائے کی جرأت نہ ہوتی، حضرت ابو بکر صدیق رضی عنہ کے اس
مودبادہ عرض کرنے پر آپ کی جانب سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ آپ پوری یعنی تکلفی
کے رائے ظاہر کر دیں کیونکہ جن معاملات میں وحی نہیں آتی ان میں میری رائے بھی تم میں
کے کسی ایک کے برابر ہے، اگر نوعیت وہ ہوتی ہو تو وہ نظر نظر کے دکاء پیش
کر رہے ہیں تو آپ یقیناً یہ دعا صاحت نہ فرماتے بلکہ ارشاد یہ ہوتا کہ آپ ہوئی

بے ملکی سے رائے دیں، مشورہ کا مقصد یہ ہے کہ مسئلہ کے تمام ہم لو داشت ہو جائیں پھر حیثیت امیر میں جس رائے کو مناسب سمجھونا گا اختیار کروں گا۔ مگر سرکار دو عالم مسلم اللہ علیہ وسلم صاف ارشاد فرماتے ہیں اپنی فیما لمو بوج الی کاحد کو، کاحد کم میں کاف تشبیہ کیلئے ہے، موقع مجلس شوریٰ کے انعقاد کا ہے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت مودب ہو کر عرض کیا ہے کہ حضرت! آپ کی اجازت ہے اس لئے بکشائی کی جرأت کر رہے ہیں، درستہ بارگاہ رسالت میں اپنی رائے پیش کرنے کی جرأت کہاں ہے؟ اس کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وحی سے مستثنی تمام معاملات میں پیغمبر علیہ السلام کی رائے، دوسرے صاحب رائے کی طرح ہے۔ حضرت عمرؓ کے ارشاد اپنی واحد کاحد کو اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اپنی فیما لمو بوج الی کاحد کو کے بالکل صراحت کے ساتھی حقیقت منع ہو جاتی ہے کہ اگر کسی شخص کو واقعتہ امارت عالیہ حاصل ہے تو بھی اسکی رائے دوسرے ممبران کی رائے پر فوکیت یا امتیاز نہیں کھٹی، پھر ما تمث قسم کے وہ امراء جو مجلس شوریٰ کے کمیٹیت عہدہ ممبر بنائے گئے ہوں ان کی رائے کو اپنی اہمیت دینا کہ وہ اقلیت یا اکثریت یا اپنی رائے میں سے کسی کو ترجیح دیں، مذکورہ بالا تصریحات کے بالکل منافقی ہوگا۔

حضرت سرہم لامست کے نقطہ نظر کی وضاحت

اس موضوع کے آخر میں سیکم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ کے نقطہ نظر کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ شوریٰ کی بالادستی

کے انکار، اور ہم کے اختیارات کی وسعت کے لئے حضرت اقدس کا نام لے کر غلط ہی پیدا کی جا رہی ہے لیو اور حضرت اقدس ہی کے حلقوثر کے بعض علماء نے اس نقطہ نظر کی تائید کی ہے۔

حالانکہ مدارس عربیہ کے نظام کا میں شوریٰ کی بالادستی کے سلسلہ میں حضرت حکیم القدس سره کی تعداد تحریری ہیں، وہ ۱۳۵۷ھ سے ۱۴۰۰ھ تک دارالعلوم دیوبند کے سربراہ ہے ہیں اس دور میں حضرت اقدس کی حقیقی مطبوعی یا غیر مطبوع متحریریں (جو محافظاتانہ دارالعلوم میں محفوظ ہیں) ہیں ان سے شوریٰ کی بالادستی ہی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً جب حضرت مولانا محمد طیب صاحب حب رحمہ اللہ کو دوبارہ نائب حکیم مقرر کیا گیا اور اس وقت حضرت علامہ کشمیری کا رحمۃ اللہ اور ان کے تلامذہ کی جانب سے اہتمام میں دراثت قائم کرنے پر تکمیل کی گئی اس وقت حضرت حکیم الامت قدس شرمنے دارالعلوم کے سربراہی کی حیثیت کے ایک تحریر "الكلم الطیب" کے نام سے مرتب کر کے اہتمام میں بھی، اس کے اقتباس ملاحظہ ہوں:-

" خود احتر کے قلب میں یہ امر وارد ہوا کہ مستقبل کے لئے ابھی سے کوئی ہم تجویز ہو جانا ضروری ہے کہ اسوق ثابت پر مقرر ہو، پھر موقع پر حکیم بنادیا جائے تاکہ عین وقت ضرورت ہو ریاضی نہ ہو، اس دارالد کوئی میں نے حضرات ائمہ اکان کی خدمت میں سفارش کے ماتھ پیش کر کے منظور کرایا۔"

لہ اس موضوع سے متعلق حضرت حکیم الامت قدس سره کے ایک دعا کے کچھ بھی مثالیں کئے گئے تھے، مگر یہ دفڑائی کا ہے اور حضرت اقدس کے نقطہ نظر کی وضاحت میں جو عبارتیں دی گئی ہیں وہ اس کے بعد کی ہیں امرتب ا

اگر حضرت اقدس رحمۃ اللہ علیہ شوری کی بالادستی تسلیم نہیں فرماتے تو اپنے دارِ قلبی کو ان کی خدمت میں سفارش کے ساتھ پیش کر کے منتظر کرانے کا کیا مفہوم ہوگا، پیش کر کے منتظر کرانا بالادستی کا صریح اعتراف ہے، خصوصاً جبکہ حضرت قدس اللہ عز وجلیں سرپرست بھی تھے۔

پھر اس تحریر میں طولانی تمهید کے بعد ایک اعلان عام ہے، جو اس وقت کے اخبارات و رسائل میں طبع کرایا گیا تھا، اس کا متن درج ذیل ہے :

”اعلان عام کیا جاتا ہے کہ دارالعلوم کی کاملوں نہیں، نہ اس کے اہتمام میں دراثت جاری ہو سکتی ہے، خاندانِ مولا نما محمد قاسم صاحب کو دارالعلوم کے ساتھ خصوصیت بے شک حاصل ہے مگر اس کا یقینہ نہیں ہو سکتا کہ اہتمام دارالعلوم بطور دراثت اسی خاندان میں قائم رہے، اگر ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ بطور حق شناسی و بنیالِ حسنِ انتظام و مصالح دارالعلوم اسی خاندان کے اہل افراد کا انتخاب کرس تو مستحسن ہے اور اگر باوجود مذکورہ عن کی الہیت کے کسی روشن شخص کا انتخاب کرس یہ بھی ان کو اختیار ہے۔

یہ بھی اعلان کیا جاتا ہے کہ مولوی حاجظ قاری محمد طیب صاحب دارالعلوم کی مدرسی کے ساتھ نیابت اہتمام کے لئے بھی نامزد کئے گئے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ وہ نعمتمن ہی بنائے جائیں یا ہمیشہ کے لئے وہ نامب نعمتمن ہیں، مجلس شوریٰ کو ہر وقت تغیر و تبدل کا اختیار ہے“

کتبہ اشرف علی تھانوی

سادس شعبان شمسیہ

اس علان میں حضر مولانا قدس سرہ نے مجلس شوریٰ کی ہستم پر بالادستی کی مکمل تصریح کی ہے، کیونکہ وہ ہر زمانہ کی مجلس شوریٰ کو ہستم کے انتخاب کا اختیار نہ رہے ہیں و تغیری تبدل کا بھی ہر وقت اختیار نہ رہے ہیں اس کے زیادہ اور کیا صراحت ہو سکتی ہے؟ اس کے علاوہ ”بیاض اشرافی“ میں مدارس عربیہ کے لئے ایک ستور اساسی دیا گیا ہے، جسے بنیادی اور اجمالی حیثیت سے حضر تھانویٰ ہی نے مرتب فرمایا ہے، اس میں مجلس شوریٰ اور ہستم کے باعثے میں کئی دفعات ہیں، انکے الفاظ یہ ہیں:

دفعہ سی — اسی طرح ہستم کا نصب عزل بھی قواعد منظور شدہ کے تحت میں صرف ممبروں کی متفق رائے پر ہو سکے گا، اور کسی کا اس میں دخل ہو گا؟

(ص ۸ بیاض اشرافی)

دفعہ — ہستم کے قسم کی باز پرس کا حقیق صرف ممبروں کو ہے خواہ ایک ہی ممبر ہو، پھر اس باز پرس کے بعد اگر ہستم اس کی اصلاح میں متفق ہو جاویں فہرہ، اور اگر ہستم کو اپنے طرزِ عمل پر اصرار ہو تو اس ممبر کو صرف یہ حق ہو گا کہ دوسرے ممبروں کو اطلاع کر دے۔ اگر سب متفق ہو جاویں تو ہستم کو اپنا طرزِ عمل بدلتا واجب ہو گا اور اگر ممبروں میں اختلاف ہے تو حسب قواعد جس حق کو ترجیح دی جائے ہستم کو اس کی پابندی لازم ہو گی (ص ۸ ایضاً ۱)

ان عبارتوں میں مجلس شوریٰ کی ہستم پر بالادستی بالکل واضح ہے کیونکہ ان عبارتوں میں مجلس شوریٰ کو ہستم کے عزل و نصب اور ہستم سے باز پرس کا اختیار دیا گیا ہے اور مجلس شوریٰ کے معین کردہ موقف نے کے مطابق، ہستم پر اپنے طرزِ عمل کا تبدیل کرنا لازم فرار ریا گیا ہے۔

حضرت حکیم لامقت قدس سرہ کے نقطہ نظر کی وضاحت کے سلسلہ میں دوسری بات اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کے اختیارات کی وسعت کا مضمون ہے اس سلسلہ میں اس حقیقت کا مخوذ رکھنا ضروری ہے کہ جب حفظت حکیم لامقت قدس سرہ نے ۱۴۲۳ھ میں دارالعلوم کی سرپرستی قبول فرمائی اس وقت تک موجودہ دستور اسی نہیں تھا، بلکہ دارالعلوم کی رواداری میں آئین مدرسہ کے نام سے کچھ دفعات بمع کردی جاتی تھیں، باقاعدہ پہلا دستور اسی ۱۴۲۴ھ میں مرتب ہوا ہے، دستور اسی سے پہلے بھی مجلس شوریٰ ای طرح ہمیت حاکمیت جیسے آج ہے، بلکہ حفظت مولانا شاہ رفیع الدین صاحب ہتم دوم کے اصول ہشتگانہ سے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ مجلس شوریٰ جزئیات تک میں پوری طرح خیل تھی، کیونکہ ہتم دوم نے ۱۴۲۴ھ میں مجلس شوریٰ سے امور جزویہ کی انجام دہی کی اجازت لی ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ سرپرست کا ہر اعتبار سے احترام محفوظ رہتا تھا اور مجلس شوریٰ اپنی تمام تجاذب میں سرپرست کو مطلع کرتی تھی۔ تعالیٰ میں یہ بات تھی کہ اگر تجاذب مجلس شوریٰ اتفاق رائے سے پاس کرتی تھی تو سرپرست بھی اس کے ساتھ اتفاق کرتے تھے اور اگر سرپرست کو اختلاف ہوتا تو وہ اپنی رائے مدل کر کے دوسرا مجلس شوریٰ میں پیش کرتے تھے، مجلسی گر سرپرست کے دلائل سے اتفاق کرتی تو تجویز میں تیدیلی کرتی اور اگر سرپرست کے اختلاف کے باوجود مجلسی تجویز کو نافذ کرنا ضروری سمجھتی تو سرپرست کو اتفاق کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اگر کسی تجویز میں ممبران شوریٰ کی رائے میں اتفاق نہ ہوتا تو اکثریت یا اقلیت کی رائے کی ترجیح کے سلسلہ میں پرست کی طرف رجوع کیا جاتا تھا، ۱۴۲۵ھ کے دستور اسی میں اسی تعامل کو فصایل کے صورت

دی جانے لگی تو میرن شوری کو اس پر شرح صدر نہ ہوا، آخر کار ۱۲۵۲ھ میں حضرت حکیم لامست قدس سرہ نے سرپرستی کے استعفی دے دیا۔

تاریخ دارالعلوم میں سید محبوب صاحب ضبوی نے تفصیل ان الفاظ میں قلم بند کی ہے :

زمائنہ قدیم سے دارالعلوم کی سرپرستی کی یہ شکل تھی کہ جماعت میں شخصیت اپنے علم و فلسفہ و تقویٰ، بزرگی اور اصابت رائے کے لحاظ سے زیادہ ممتاز ہوتی تھی اس کو دارالعلوم کے انتظامی امور کا مرجع الامر تصور کر کے، مجلس شوریٰ اپنی تجوادیز کے فیصلوں میں سرپرست سے رجوع کرتی تھی ابتداء کے لئے کوئی ضابطہ مقرر نہ تھا اور واقعہ بھی یہ ہے کہ دارالعلوم میں نمود و نمائش کی ضابطہ بندیوں کے بجائے دریافت دیانت و اخلاص و خلوص و لہیت ہر زیادہ تر کاموں کی سرانجامی کا ہمار رہتا آیا ہے، سرپرست کے اختیارات کا حاصل یہ تھا کہ ممبران میں اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا اس میں خواہ سرپرست کی رائے قلت کی ہی جانب کیوں نہ ہو، البتہ اگر ممبران متفق طور کی چیز کو پاس کرنے اور سرپرست کو اس سے اختلاف ہوتا تو وہ وجہ اختلاف کو مدلل تحریر کر کے مجلس میں دوبارہ غور و خوض کے لئے بحیثیتے تھے، اس صورت میں اگر مجلس اپنی سابقہ رائے سے رجوع نہ کرتی تو ابتدہ مجلس ہی کی رائے برقرار رہتی۔ اور بغیر اس تصریح کے سرپرست اس کا نفاذ ہو جاتا تھا یہ

(تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۶۷)

اس تحریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مجلس شوریٰ کے اتفاق رائے کی صورت میں

سرپرست بھی مجلس کے پابند تھے اور ان کے لئے یہ پابندی بالکل ضروری کا درجہ تھی کیونکہ مجلس شوریٰ نے اس سلسلہ میں انکو کوئی اختیار یا کوئی امتیازی حق نہیں دیا تھا۔ مجلس شوریٰ نے مخفی اختلاف رائے کی صورت میں انکو اختیار دیا تھا، اسکے بعد نایرخواہ العلوم میں حفظتہ حکیم الامت کے استعفیٰ کے ٹائے میں اجمالی طور پر نکھا گیا ہے :

” ۱۹۴۷ء میں جب انتظامی امور کے لئے قوانین مدون ہوئے تو مندرجہ بالا طریقی عمل کو باضابطہ بنادیا گیا، مگر ۱۹۴۸ء میں کچھ ایسے حالات پیش آئے کہ اس بانے میں مجلس شوریٰ کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا، ایک جماعت کی رائے اس طریقی عمل کی حمایت میں تھی اور دوسری جماعت اس کو مجلس شوریٰ کی بے کی اور عدم ضرورت سے تعبیر کرتی تھی اور فحیلہ کا مدارکثرت رائے ہے کہ رکھنا چاہتی تھی چنانچہ مجلس شوریٰ کے متعدد اجلاسوں میں میسٹلہ زیر بحث آیا حفظتہ تھانوی رحمہ اللہ علیہ جو ۱۹۴۷ء سے دارالعلوم کے سرپرست تھے از خود مصلحت سرپرستی سے مستعفی ہو گئے۔ جب ۱۹۴۸ء میں مجلس شوریٰ نے حسبیل الغاظ میں یہ استعفیٰ منظور کیا ہے۔

” مجلس شوریٰ کا یہ اجلاس بورے غور و فکر اور احترام و تقدیر میں اور عذر کو ملنا ذرا رکھتے ہوئے حضرت مولانا تھانوی مذکور کے استعفیٰ کو نہیں افسوس کے ساتھ منثور کرتا تھے اور حضرت مدد حضرت سے درخواست کرتا تھے کہ اپنی دعوات صاف کو اور توجہاتِ عالیہ سے دارالعلوم پر برہنہ ظلنگ ستر رہیں گے۔

(تاریخ دارالعلوم جلد اول ص ۲۰)

- پیش کردہ حقائق سے اور ذکر کردہ اقتباسات گے چند باتیں پوری طرح ثابت ہیں:
- ۱۔ حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے شوری کی بالادستی، یا پہنچت حاکم ہونے سے انکار نہیں فرمایا ہے۔
 - ۲۔ اتفاق رائے سے پاس ہونے والی تجویز کے سلسلہ میں سرپرست بھی مجلس شوریٰ کے پابند تھے۔
 - ۳۔ اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی جانب سے دیکھانے والی ترجیح کا معاملہ اس وقت کا ہے جب دستور اسلامی میں کوئی بات اس سلسلہ میں طے نہیں کی گئی تھی کہ اکثریت کی رائے کے مطابق تجویز کا نفاذ ہو گا، بلکہ اگر حقیقت پر نظر ہو کہ جب مجلس شوریٰ الامرکی وہ مجلس ہے جس کے احکام واجب الاطاعت ہیں اور ہندوستان کے مدارس عربیہ میں اس کی حیثیت قائم مقام سلطان کی ہے جیسا کہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت کی خط و کتبت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے اس نے حقیقت پر نظر ہو تو کہتا ہو گا کہ سرپرست کو یہ اختیار بھی مجلس شوریٰ کا دیا ہوا تھا، کیونکہ جب مجلس شوریٰ کو اسلام میں وہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ سلطان کا بھی انتخاب کرتی ہے تو مدارس کے سرپرست کی حیثیت سے کسی ہستی کا انتخاب بھی اسی کا کام ہے۔ اور یہ حقیقت اس طرح تزید منفع ہو سکتی ہے کہ یہ معلوم

کریں جائے کہ کسی شخص کو سرپرست کون بناتا ہے ، ظاہرہ ہے کہ سرپرست خود نہیں بن جایا کرتے بلکہ سرپرستی اگر کوئی منصب ہے تو اس منصب کے لئے تجویز ، انتخاب اور نصب کا عمل جس کی جانب سے وجود میں آیا ہوگا اسی کو بالادست سمجھا جائے گا ۔

چنانچہ جب کسی معاملہ میں شوریٰ اور سرپرست کے درمیان اختلاف ہوا تو سرپرست محترم نے از خود استعفیٰ پیش کر دیا، مجلس شوریٰ کے سامنے استعفیٰ پیش کرنا بھی بالادستی کے اعتراض پر مبنی ہے ، ورنہ اگر اکثریت پر فیصلے کی بات ان کے نقطہ نظر سے خلافِ شرع ہوتی تو وہ ضرور یہ فرماتے کہ ایسا کرنا خلاف شرع یا ناجائز ہے ، اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ جو الفاظ حضرت حکیم الامت کے قلم سے نکلے ہیں وہ بیان القرآن میں موجود ہیں :

”امور متعلقة بالرأي والمشورة میں کثرت رائے کا ضابط بعض
بے اصل ہے“

اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ کثرت رائے کا ضابط خلاف شرع یا ناجائز ہے بلکہ اس کے معنی فقط اتنے ہیں کہ کثرت رائے پر فیصلہ کرنا ان کے نزدیک کسی اصل سے صراحت کے ساتھ اس طرح ثابت نہیں کہ دوسرے ریخ کو اختیار کرنا ناجائز ہو جائے حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک

لفظ غور و نکر اور تدبیر کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اگر حضرت اقدس کثرت رائے کو ناجائز یا خلافِ شرع سمجھتے تو وہ بزلا اس کو خلافِ شرع فرماتے، اور اس موقف کو مدلل کر کے مبرانِ شوریٰ کو صداقت کے قبول کرنے کی تلقین فرماتے جیسا کہ اکابر دیوبند کا طریقہ امتیاز ہے، لیکن اسکا کوئی ثبوت نہیں ملتا، اور اس سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ حضرت حکیم الامت بھی اس کی گنجائش سمجھتے تھے خواہ یہ موقف ان کے نقطہ نظر سے راجح نہ رہا ہو۔

۴ — نیز یہ کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ کا یہ اختلاف صرف سرپرست کے بارے میں تھا، ہم تم کے بارے میں نہیں تھا ہم تم کو حضرت حکیم الامت قدس سرہ نے ہرجگہ مجلسِ شوریٰ کا ماتحت ہای سمجھ کر کلام فرمایا ہے ॥

اب غور طلب بات یہ ہے کہ مجلسِ شوریٰ ۱۳۵۲ء نے جس کے مبران بڑے بالغ نظر قبہ، مشائیخ اور اساطین ملت ہیں۔ سرپرست کو بھی یہ حق نہیں ہا کر وہ مجلسِ شوریٰ میں اختلاف رائے کی صورت میں اکثریت، اقلیت یا اپنی رائے میں سے کسی کو ترجیح دیں جیکہ گمان غالب ہے کہ حضرت حکیم الامت قدس سرہ یہی سے سرپرست کے لئے بجا طور پر اس کی گنجائش تھی، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ دستور اساسی میں شخصیات کی رعایت نہیں کی جاتی بلکہ اصول کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، کیونکہ اگر سرپرست کو مجلسِ شوریٰ پر کسی معاملہ میں بالادستی دے دی جائے

توبہ تک سرپرست حضرت حکیم الامت نے یہ عباری صفت بزرگ ہوں گے فضل خداوندی سے خیری کی امید کی جائے گی۔ لیکن اگر کسی زمانے میں ایسے افراد جہیا نہ ہوئے تو مدارس عربیہ کے نظام کا ریٹن خیر کے غالب ہونے کی توقع باقی ترہ سکے گی جیسا کہ مشاہدے میں آرہا ہے کہ اہتمام کے پاسے میں دراثت کی روشن پرچنے والے حضرات اس عمدہ نظام کا رکاو پانے مقصد میں حارج ہمکراں کو نقصان سینچانے کی سعی کر رہے ہیں۔

انہی مصلحتوں کے پیش نظر مجلس شوریٰ نے حضرت حکیم الامت قدس سرہ بیسے بزرگ کی سرپرستی سے محرومی کی تعلیم حقیقت کو گوارا کیا لیکن دستور اساسی میں مجلس شوریٰ کی بالادستی کو محفوظ رکھا۔ اور اب جبکہ دستور اساسی میں ہر بات منسخ کر دی گئی ہے مجلس شوریٰ، سرپرست، ہتھیں اور تمام عہدے داروں کے اختیارات اور فرائض منصبی داسخ کر دیئے گئے ہیں تواب یہ دستور اساسی — وہ معاہدہ شرعی ہے — جس کی — از روئے قرآن و حدیث — پابندی لازم ہو گئی ہے —

دستور اساسی

دستور اساسی کی حیثیت اس مفہوم طبقاً معاہدہ کی ہے جس کی پابندی ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان کے لئے واجب اور ضروری ہے، اسکے جواز و عدم جواز کا انحصار اس کی دفعات پر ہے، اگر ان دفعات میں سے کوئی دفعہ خلاف شرع ہے تو اس دستور کو ناجائز کہا جائے گا، اور اگر تماکن دفعات میں شریعت کے مطابق ہیں تو اس کو ناجائز یا خلاف شرع قرار دینا درست نہ ہو گا۔

دارالعلوم دیوبند کا دستور اساسی، ایسے بانٹ نظر فقہاء اور پابند شریعت علماء کا مرتب کردہ ہے جن کے بارے میں شریعت سے انحراف کا شبة تک نہیں کیا جاسکتا، پھر اس کی ترتیب و تدوین میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے کہ حضرت نانوتوی، اور حضرت گنگوہی کے دور سے تاریخ تدوین تک مجلس شوریٰ کی بنیادی تجوید آجائیں، ان تمام دفعات کو شریعت اور فقہ کی کسوٹی پر پر کھا جا چکا ہے اور آج بھی ان دفعات میں سے کسی دفعہ پر انگلی نہیں نگائی جاسکتی دستور اساسی کی دفعات میں بعض چیزوں تو ایسی ہوتی ہیں جن کی ایک ہی جانب شریعت میں معین ہوتی ہے مثلاً مقاصد، اور بعض چیزوں یا یہیں ہوتی ہیں کہ شریعت میں ان کی صرف ایک صورت معین ہیں ہوتی جبکہ دونوں جانب اصالتہ مبالغہ ہوتی ہیں، یعنی نظام کارکر کے تعین کے لئے کسی ایک جانب

کو معین کر لیا جاتا ہے مثلاً اختلاف رائے کی صورت میں سرپرست کی رائے یا یا کثرت رائے کے ذریعہ فیصلہ وغیرہ۔

ادارہ میں کام کرنے والے تمام کارکنان کا یہ فریضہ ہوتا ہے کہ وہ دستور اساسی کے مطابق کام کریں، دستور اساسی سے انحراف کی صورت میں مجلس اولو الامر یا ادارہ کے سربراہ کو باز پرس کا حق ہوتا ہے۔

دستور اساسی کی یہ پابندی اصول شریعت سے ثابت ہے، جن میں المسلمون عند شروع طہم کر تمام مسلمانوں کو باہمی شرائط کی پابندی کرنا لازم ہے الضریب زال نقصان کی تمام صورتوں کو ختم کرنا ضروری ہے، وغیرہ ہیں۔

قرآن کریم میں بھی باہمی معاملات کی پابندی کی تائید فرمائی گئی ہے، سورہ مائدہ کی پہلی آیت۔

یا ایها الذین امنوا و فوا بالعقود اے ایمان والو! عہدوں کو پورا کرو
پر معارف القرآن میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے لکھا ہے۔

اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا جملہ ایک ایسا جامع جملہ ہے کہ اس کی تفسیر و تشریح میں ہزاروں صفحات لکھے جاسکتے ہیں۔ (معارف القرآن ج ۲)
حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے فقر و تفسیر کی کتابوں کے حوالے سے بہت قسمی کلام کیا ہے اور اسکے بعد خلاصہ کے طور پر لکھا ہے۔

اسی لئے امام راغب اصفہانی نے فرمایا کہ معاملات کی قسمی قسمیں ہیں سب اس لفظ کے حکم میں داخل ہیں، اور پھر فرمایا کہ اس کی ابتدائی تین قسمیں ہیں، ایک وہ معاملہ جو انسان کا رب العالمین کے ساتھ ہے مثلاً ایمان، طاعت کا عہد، یا حلال

و حرام کی پابندی کا عہد، دوسرے وہ معاهدہ جو ایک انسان کا خدا پنے نفس کیسا تھا ہے جیسے کسی چیز کی نذر اپنے ذمہ مان لے، یا اخلف کر کے کوئی چیز اپنے ذمہ لازم کے تیرے وہ معاهدہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ ہے اور اس تیسرا قسم میں وہ تمام معاهدات شامل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔

حکومتوں کے بین العالمی معاهدات یا باہمی سمجھوتے، جماعتوں کے باہمی عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات نکاح، تجارت، شرکت اجارہ، بہبہ وغیرہ، ان تمام معاهدات میں جو جائز شرطیں باہم ملے ہو جائیں اس آیت کی رو سے ان کی پابندی ہر فریق پر لازم و واجب ہے:-
(معارف القرآن ص ۱۲ جلد سوم)

دیکھئے دستور اساسی بھی وہی باہمی معاهدہ ہے جس میں باہم جائز شرطیں ملے کر لی گئی ہیں، ان میں یہ دفعات بالکل واضح ہیں کہ مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں دارالعلوم کا تمام نظم و نسق ہو گا اور ہر قسم کے اختیارات و انتظامات جو دارالعلوم کے اسکالاً و ترقی اور حصولِ مقصد کیلئے ضروری یا مفید ہوں وہ مجلس شوریٰ کے ہاتھ میں ہوں گے، ان دفعات میں یہ بھی ہے کہ ہم تم کو مجلس شوریٰ کی جانب سے حسب ذیل اختیارات حاصل ہوں گے، پھر ان اختیارات کی نمبر وار دضاحت کی گئی ہے، ان دفعات میں یہ بھی ہے کہ ہم تم مجلس شوریٰ اور مجلس عالمہ کے روپ و رجوب دہ ہوں گے، وغیرہ۔ اس نئے ہم تم اگر کسی وقت مجلس شوریٰ کے عطاکردہ اختیارات سے تجاوز کر کے احکام کا نفاذ شروع کر دیں تو مجلس اول والا مر یا

مجلس شوریٰ کو بجا طور پر ان سے موافذہ کا شرعاً جواز ہے۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنؤی (طیعوا اللہ، و اطیعوا الرسول و ادلي الامر منکو کے تحت لکھتے ہیں۔

سلطان اور عجہدیا استاذیا شیخ یاد الدیاز وغیرہ (وغیرہ میں مجلس شوریٰ بھی یقیناً شامل ہے) جس امر بناح کو لازم کر دیں وہ دو حال سے خالی نہیں ملے یہ کہ امر انتظامی ہو گا جیسے طبق جنگ یا تدبیر قواعد انتظامی، اسکے لزوم میں کوئی کلام نہیں ورنہ حکومتیں باطل اور مصلحتیں معطل اور نظم درہ بربم اور امر مختل ہو جائیں گے، اور یہ لزوم اس عہد پر منی ہے جو حاکم و محاکوم میں ہوتا ہے یہ کہ عبارات و عقائد میں ہو پس ایسا لزوم باطل ہو گا کہ دین میں نئی بات پیدا کرنے کا کسی کو حق نہیں اور وقت اختلاف امور کو حق رجوع حاصل ہے (خلاصة التفاسیر ۲۹ جلد اول)

حضرت مولانا مرحوم نے بالکل وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ انتظامی معالات میں امر بناح کو لازم کرنا بالکل درست ہے اور فقہاء اس معاملہ میں کوئی اختلاف نہیں رکھتے، اور یہ لزوم اس عہد پر منی ہے جو حاکم و محاکوم میں ہوتا ہے، گویا دستور اساسی میں انتظامی معاملات پر، جن بناح چیزوں کی پابندی کو لازم کریا گیا ہے وہ سب واجب ہو جائیں گی، اور کسی کارکن یا مستلزم کے لئے اس سے انحراف کی اجازت نہ ہو گی۔

اسی طرح قرآن کریم کی دوسری آیت میں سورۃ الاسراء میں فرمایا گیا ہے:-

واد فوا بالعہد ان العہد کان مسلولاً

پورا کرو عہد کو، بے شک عہد کی پورچہ چھوڑو گی

قرآن کریم میں صیغہ امر سے پوری وضاحت کے ساتھ حکم دیا جا رہا ہے کہ تمام معاهدات کو پورا کیا جائے، عہد کا لفظ ہر طرح کے معاهدات کوشال ہے، اس آیت کی تفسیر میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے تحریر فرمایا ہے۔

(سورہ ام德ہ کا) دسویں حکم عہد کو پورا کرنے کی تائید ہے، عہد دو طرح کے ہیں ایک وجہ نہ اور انشہ کے درمیان ہیں جیسے ازل میں بندے کا یہ عہد کہ بیشک انشہ تعالیٰ ہمارا رب ہے، اس عہد کا لازمی اثر اس کے احکام کی اطاعت اور اس کی رضا جوئی ہوتا ہے، یہ عہد تو ہر انسان نے ازل میں کیا ہے خواہ دنیا میں وہ مومن ہو یا کافر، دوسرا عہد مومن کا ہے جو شہادۃ ان لا الہ الا اللہ کے ذریعہ کیا گیا ہے جس کا حاصل احکام اللہ کا مکمل اتباع اور اس کی رضا جوئی ہے، دوسری قسم عہد کی وجہ ہے جو انسان کسی انسان سے کرتا ہے جس میں تمام معاهدات سیاسی تجارتی، معاملاتی شامل ہیں جو افراد یا جماعتوں کے درمیان دنیا میں ہوتے ہیں پہلی قسم کے تمام معاهدات کا پورا کرنا انسان پر واجب ہے اور دوسری قسم میں جو معاهدات خلاف شرع نہ ہوں ان کا پورا کرنا واجب ہے، جس معاهدہ کا پورا کرنا واجب ہے اگر کوئی فرقی پورانہ کرے تو دوسرے کو حق ہے کہ عدالت میں مرفوع کر کے اس کو پورا کرنے پر مجبور کرے۔ معاهدہ کی حقیقت یہ ہے کہ دو فرقی کے درمیان کسی کام کے کرنے یا ز کرنے کا عہد ہو۔

رمعاف القرآن ۳۶۹ (جلد بختم)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے ایک بات اور زائد ارشاد فرمائی کہ وہ معاهدات جن میں دستور اساسی بھی با یقین شامل ہے اور جن کو پورا کرنا واجب

ہے اگر کوئی فرقہ ان کو پورا نہیں کرتا، تو وہ سے فرقہ کو عدالت میں مرفوع کر کے پابندی پر مجبور کرنے کا حق ہو گا، مثلاً مسٹرم جوروز اول سے مجلس شوریٰ کے اتحت کام کرنے کے مقابلہ تھے، جن کو مجلس شوریٰ نے کام پر مامور کیا تھا، جن کی تنخواہ کا تین مجلس شوریٰ نے کیا تھا، جن کے نسبت کے ساتھ، جن کا عزل بھی مجلس شوریٰ ہی کے اختیار میں ہے، ہمیشہ کا تعامل اور دستور اساسی کی صراحت جن کے بارے میں شوریٰ کی ماتحتی میں کام کرنے کی ہے وہ اگر اس معاهدہ شرعی اور دستور اساسی کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی وقت مجلس شوریٰ ہی کو تخلیل کرنے کا اقدام کرنے لگیں تو حضرت مفتی صاحب رحہ الشدار شاد فرماتے ہیں کہ وہ سے فرقہ کو یہ حق ہو گا کہ وہ عدالت میں مرفوع کر کے معاهدہ کی تکمیل پر مجبور کرے۔

عدالتی مرفوعہ میں رجسٹریشن کی نہیت

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ رجسٹریشن صرف اس عدالتی مرفوعہ کو مضبوط اور باقاعدہ بنانے کا قانونی طریقہ ہے، مدارس عربیہ کے رجسٹریشن کی حقیقت یہ ہے کہ (گورنگ بادی) مجلس شوریٰ کی جانب سے مرتبہ دستور اساسی کے مطابق ادازہ کو چلانے کا حکومت وقت کے اس محکمہ میں اندرج کرایا جائے جو اسی مقصد کے لئے حکومت نے قائم کیا ہے۔

اس دور میں یہ ایک ضرورت بن گئی ہے، اگر رجسٹریشن نہ کرایا جائے تو عصر حاضر میں تحفظ کی ضمانت نہیں رہتی، جس طرح حکومت نے اوقاف کے تحفظ

یکیے مسلم وقف بورڈ قائم کیا ہے، اور وہ اوقاف کی نگرانی اور حفاظت کی ذمہ دیوں کو پورا کرنے کے لئے ہے، اگر وقف بورڈ میں کسی جائداد کا اندر راجح نہیں ہے تو بھیت وقف اس کے تحفظ کی ضمانت نہیں ہے، اسی مجبوری کے سبب، مدارس عربیہ کے ذمہ دار، ادارہ اور اس کے دستور اساسی کا، عصر حاضر کے قوانین کے تحت جسٹیشن کر لینا مناسب خیال کرتے ہیں، تاکہ ادارہ کا نظم اگر کسی چھوٹے یا بڑے عہدے دار کی خلاف ضابطہ کارروائیوں سے متاثر ہو تو عدالتی کا رکاوی کر کے آسانی کے ساتھ مسائل کا حل تکالا جاسکے۔

چنانچہ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبران نے انہی مصلحتوں کے پیش نظر جسٹیشن کرایا، سوسائٹی ایکٹ کے تحت جسٹیشن کی بعد خاست دی گئی اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔

درجہ اول کے تحت جسٹیشن

ایکٹ شمارہ ۶۷ء کے تحت دارالعلوم دیوبند کے علاوہ مدارالعلوم ایسویلیشن کا مہم نہیں

- ۱ - اس سوسائٹی کا نام دارالعلوم دیوبند ہو گا
- ۲ - اس سوسائٹی کا صدر دفتر دیوبند میں ہو گا
- ۳ - اس سوسائٹی کے اغراض و مقاصد حسب ذیل ہوں گے۔
(الف) علوم عربیہ و دینیہ (یعنی قرآن مجید و تفسیر و حدیث و فقہ و عقائد و کلام و دیگر مذہبی فنون) کی مسلمانان عالم کو تعلیم دینا

(ب) ثانوی مرتبہ میں دیگر علوم و فنون کی تعلیم جو عربی زبان کی تحصیل یا انگلیزی غرض کی تکمیل کیلئے ضروری یا مفید ہو، اسی طرح فارسی واردو و دیگر زبانوں کی بقدر ضرورت تعلیم دینا۔

(ج) حفاظت و اشاعت اسلام کی خدمات بذریعہ تقریر و تحریر بجا لانا اور مسلمانوں میں دینی تعلیم و تبلیغ اور جزو کل میں سلف صالحین جیسے اسلامی اخلاقی و اعمال اور جذبات پیدا کرنا۔

(د) دوسرے فنون اور حرفتوں کو بقدر ضرورت اسی حد تک اختیار کرنا کا اصل مقصد تعلیم میں نقصان واقع نہ ہو اور جنھیں اصل مقصد کے لئے معاون و مددگار سمجھا گیا ہو۔

(۴) علوم دینیہ کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر مدارس عربیہ قائم کرنا اور قائم شدہ مدارس کا دارالعلوم سے الہاق کرنا۔

(۵) دارالعلوم کے معاملات کا انتظام، دارالعلوم کے دستور اساسی کے مطابق مجلس شوریٰ اور مجلس عاملہ کے پرورد ہے جس کے ممبران فی الحال حسب ذیل ہیں۔

ممبران مجلس شوریٰ

نمبر	نام	عہدہ	پتہ
۱	مولانا الحاج قاری محمد طیب حسٹا	مشتملہ دارالعلوم و مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ دارالعلوم دیوبند	
۲	مولانا محمد ابراسیم صاحب	ممبر مجلس شوریٰ و مجلس عاملہ پرنسپل دارالعلوم دیوبند	
۳	مولانا سید غفران الدین صاحب	" " شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند	

- ۳۔ مولانا سید محمد میاں صاحب ممبر مجلس شوریٰ و مجلس عامل سکریٹری ٹرسٹ جمیعت علماء ہند
 ۴۔ مولانا مفتی عیش الرحمن صاحب " " قائم مقام صدر جمیعت علماء ہند و ہبھی
 ۵۔ مولانا محمد نظور صاحب نحافی " " ایڈٹر الفرقان، کپھری روڈ لکھنؤ
 ۶۔ مولانا فاضی زین العابدین حسّا " " استاذ جامع مسجد اسلامیہ نسی دہلی
 ۷۔ مولانا سید راحمد صاحب " " فیکٹری آف تھیلوگی، سلم یونیورسٹی ہنگاؤ
 ۸۔ مولانا احمد رئیس " " محلہ قاضی پاڑہ، بجھوڑ
 ۹۔ مولانا ام غوب الرحمن صاحب رئیس " " ممبر مجلس شوریٰ مولوی منزل، لکھنؤ
 ۱۰۔ ڈاکٹر مصطفیٰ حسن صاحب علوی " " ماظم ندوۃ العلماء لکھنؤ
 ۱۱۔ مولانا ابوالحسن علی صاحب " " محلہ پچھانپورہ، مسوان، عظم گزہ
 ۱۲۔ مولانا حبیب الرحمن صاحب " " خانقاہ رحمانی، ہنگیر
 ۱۳۔ مولانا منت اللہ صاحب " " موقع مادر، دایا نسی مونگیر
 ۱۴۔ مولانا عبد الصمد صاحب " " مفتی اعظم ہمہ کنٹ بیہری پریش
 ۱۵۔ مولانا مفتی محمود احمد صاحب " " بیگ محمد علی روڈ بمبئی
 ۱۶۔ مولانا حامد الانصاری غازی صاحب " " بزرگ منزل سملک فتح سورت
 ۱۷۔ مولانا محمد سعید صاحب " " شیخ الحدیث مدرس عالیہ، کلکتہ
 ۱۸۔ مولانا عبد حمید الدین صاحب " " محلہ سولپور مکان، ہنگاؤ، ہنگاؤ
 ۱۹۔ مولانا عبد القادر صاحب " " عابر روڈ، حیدر آباد
 ۲۰۔ مولانا فضل اللہ صاحب " " دارالعلوم کے دستور اساسی کی نقل جس کے صحیح ہونے کی تصدیق مجلس شوریٰ
 کے سات میلان نے کر دی ہے میں اس میمورنڈم کے ہمراہ مسلک کرتا ہوں ہم لوگوں

نے جن کے پتے ذیل میں درج ہیں ان مقاصد کے لئے جو میمورنڈم میں درج ہیں اپنے آپ کو مستدر کر کے اس میمورنڈم میں درج کر دیئے ہیں اور آج سے ہم نے ایکٹ ۲۱ نسخہ کے تحت سوسائٹی قائم کر لی ہے۔

دستخط

نمبر

- ۱ - مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب، ہمدرم دارالعلوم دیوبند
- ۲ - مولانا محمد ابراسیم صاحب، پرنسپل دارالعلوم دیوبند
- ۳ - مولانا سید فخر الدین احمد صاحب، شیخ الحدیث دارالعلوم دیوبند
- ۴ - مولانا سید محمد سیاں صاحب، سکریٹری ٹرسٹ بورڈ جمیعت علماء ہند دہلی
- ۵ - مولانا مفتی عیق الرحمن صاحب، قائم مقام صدر جمیعت علماء ہند دہلی
- ۶ - مولانا محمد منظور صاحب نعمانی، ایڈیٹر الفرقان لکھنؤ
- ۷ - مولانا فاضی زین العابدین صاحب سجاد، استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ جانشہنگہ تی دہلی
- ۸ - مولانا سید احمد صاحب، اکبر آبادی ایم اے، دینی کلکٹی اف ٹھوپ لوگی مسکم بیونور کیلگڑہ
- ۹ - مولانا مرغوب الرحمن صاحب رئیس، محلہ قاضی پاڑہ بجنور۔ لہ

اس درخواست کے مطابق، سوسائٹی ایکٹ کے تحت دارالعلوم دیوبند کا رجسٹریشن ہو گیا، اور بازار اس کی تجدید کی جاتی رہی، لیکن اپنی قریب میں جب دارالعلوم کے نظم میں ابتدی پسیدا ہوئی تو ایک گروہ نے اسی رجسٹریشن کی بنیاد پر ان خلاف ضابطہ کارروائیوں سے ادارہ کو محفوظار کرنے کی کوشش کی اور خداوند کریم کے فضل و کرم سے وہ ادارہ کی خصوصیات کو محفوظار کرنے اور وراثت کے ناپسندیدہ

عمل سے ادارہ کو بچانے میں کامیاب ہوئے، لیکن درستگرگردہ کی جانب سے رجسٹریشن کے خلاف شروع ہونے اور اس سے گیریز کرنے کی باتیں سامنے آئیں۔

رجسٹریشن پر کئے گئے اعتراضات کا جائزہ

رجسٹریشن کے خلاف ان لوگوں کا سب سے مضبوط استدلال یہ ہے کہ رجسٹریشن سے مدرس عربیہ کے وقف اللہ ہونے کی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ قانوناً منجنگ کیٹی (مجلس شوری) کی ملک بن جاتا ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ادارہ کے حالات درست نہ رہنے کی صورت میں سوسائٹی کی ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور وہ گورنمنٹ کی ملکیت میں چلا جاتا ہے، جن دفعات کی بنیاد پر یہ بات کہی گئی ہے ان کا اردو ترجمہ یہ ہے۔

سوسائٹی ایکٹ کی بعض دفعات کا توجہ

۵۔ ایسی الامک منقولہ و غیر منقولہ جو رجسٹریڈ سوسائٹی کی ملکیت ہیں، اگر پہلے سے ٹرستیان میں ودیعت نہیں کرتی، وہ الامک عارضی طور پر اس سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں ودیعت (ویسٹ) کریں گی، اور جملہ دیوانی و فوجداری کی کارروائیوں میں ان کو سوسائٹی کی گوزنگ بادھی کی جائیدار بیان کیا جائیگا۔
 ۶۔ اگر رجسٹر اکر کو یہ اطلاع ملے کہ سوسائٹی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، اور ادارہ جس کو سوسائٹی چلا رہی ہے وہ بندھی کالشکار ہو جائے تو رجسٹر اکر خود یا اپنی طرف سے کسی بھی شخص کو مقرر کر سکتا ہے کہ وہ معاشرے اور سوسائٹی کے حالات کی

تفییش کرے، سوسائٹی کے ہر عہدے دار کا فرض ہو گا کہ سوسائٹی متعلق جملہ ریکارڈز جو اس کی تحویل میں ہے اور جملہ حسابات اس کے سامنے پیش کرے جس کی تفییش اور معاہنہ کے لئے وہ آیا ہے، رجسٹر ایسی سوسائٹی کے عہدے دار یا امیر یا ملازم کو سوسائٹی کے معاملات میں بخلاف بیان لے سکتا ہے اور ایسے عہدہ دار طالب و ممبر کا بیان لینے کے لئے حاضر ہونا رجسٹر ار کے سامنے ضروری ہو گا، اور ایسا شخص جس نے تفییش یا معاہنہ سوسائٹی کا کیا تو اپنی تفییش یا معاہنہ مکمل ہو جانے کے بعد اس کی رپورٹ رجسٹر ار کو پیش کرے گا، اس رپورٹ کے آنے کے بعد رجسٹر ار کو یہ حق ہے کہ وہ سوسائٹی کی انتظامیہ کو یا کسی عہدے دار کو جیسا مناسب خیال کرے ہدایت دے کر ایسے تمام نقاشع کو سوسائٹی کے معاملات سے دور کریں بصورت قاصر ہے افراد مذکورہ بالا کے رجسٹر ار کو حق ہے کہ دفعہ ۱۲ (دُوی) اور دفعہ ۱۳ (دُوبی) کے تحت کارروائی کرے یعنی رجسٹریشن کیس کر دے یا کورٹ کو لکھ دے کر یہ سوسائٹی کا عدم کی جائے اور اس صورت میں عدالت ہمی یہ طے کرے گی کہ املاک کی ذمہ داری، حساب کتاب بیباق کس طرح کیا جائے۔

ان دونوں دفعات کی بنیاد پر اس فرقی کار جسٹیشن پر یہ اعتراض ہے کہ پہلی دفعہ (یعنی دفعہ ۵) کی رو سے مدارس کی وقف املاک، رجسٹر اسوسائٹی کی ملکیت میں تبدیل ہو جاتی ہیں، یونکہ اس دفعہ میں کہا گیا ہے کہ املاک منقول وغیر منقول کو جلد دیوانی و فوجداری کارروائیوں میں گورنگ بادی کی جائیداد بیان کیا جائے گا۔

اسی طرح دوسری دفعہ (یعنی دفعہ ۱۲) کی رو سے یہ اعتراض ہے کہ ان مدارس

کی املاک، گورنمنٹ کی تحویل میں چلی جائیں گی، کیونکہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر سوسائٹی کے حالات درست نہ ہوئے تو نہادت طے کرے گی کہ املاک کی ذمہ داری اور حساب کتاب کس طرح بیباق کیا جائے۔

یکن واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں دفعات کا یہ نتیجہ بالکل نہیں ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ پہلی دفعہ میں اوقاف کو بالکل مستثنی کر کے حکم لگایا گیا ہے، دفعہ کے الفاظ یہ ہیں کہ: ایسی املاک منقولہ و غیر منقولہ جو رجسٹرڈ سوسائٹی کی ملکیت ہیں اگر پہلے سے ٹرستیان میں ودیعت نہیں کرتی وہ املاک عارضی طور سے اس سوسائٹی کی محکمہ انتظامیہ میں ودیعت کریں گی۔

اس میں یہ بات صاف ہے کہ جو املاک، ارکان سوسائٹی کی نہیں بلکہ سوسائٹی کی یعنی ادارہ کی ملکیت ہیں، اگر وہ پہلے سے ٹرستیان میں ودیعت نہیں کرتیں یعنی اگر وہ وقف نہیں ہیں تو ان املاک کو مقدمات میں گورننگ بادی کی ملکیت بیان کیا جائیگا۔

گویا اس دفعہ کا اوقاف سے بالکل تعلق نہیں ہے، یہ دفعہ صرف ان املاک کے بارے میں ہے جو اوقاف کے علاوہ ادارہ کی ملکیت ہوں، رہایہ کہ ادارہ کا وجود، ارکان سوسائٹی کے وجود سے الگ ہے یا ارکان ہی کو سوسائٹی کہا گیا ہے، تو اس کے لئے ایک مستقل دفعہ دی گئی ہے جس کا متن یہ ہے۔

(۲) ۱۹ سیکشن میں ایک رجسٹرڈ سوسائٹی خیراتی کام کی متولی ہو سکتی ہے اس قانون کے تحت جو سوسائٹی تشکیل پائے اس کی حیثیت ایک کارپوریشن کی ہے یعنی اس کا اپنا ایک علیحدہ وجود ہوتا ہے علاوہ ارکان کے وجود کے۔

اس دفعہ میں ادارہ کا علیحدہ وجود تسلیم کیا گیا ہے، گویا ادارہ کی املاک، ادارہ ہی کی رہتی ہیں، ارکان ادارہ کی نہیں ہو جاتیں، اس حقیقت کو مزید ایک دفعہ میں منقح کیا گیا ہے۔

(۵) یہ حقیقت کہ وہ پراپرٹی جو سوسائٹی کی ہے ٹرستیوں (متینوں) یا انتظامیہ کمیٹی (گورنگ بادی) کے پسروں کی جاتی ہے، ٹرستیوں یا گورنگ بادی کا اس پراپرٹی پر ذاتی مفاد نہیں بنتا اور ویسے وہ جائیداد سوسائٹی کی پراپرٹی تصور کی جانی چاہئے، قانون کے تحت، سوسائٹی کا نام، ارکان کے ناموں کے ملاوہ علیحدہ وجود تصور کیا گیا ہے۔

اس دفعہ میں یہ بات بالکل صاف کر دی گئی ہے کہ ادارہ کا ایک الگ وجود ہے، اور اس کے ارکان بالکل الگ ہیں اس لئے اس گروہ نے جس دفعہ کا سہارا لے کر یہ اشکال پیش کیا ہے کہ جس تریشن سے ادقا، ارکان کی ذاتی جائیداد بن جاتے ہیں صحیح نہیں ہے کیونکہ اول تو اس دفعہ میں جن املاک کا ذکر ہے وہ املاک اوقاف کے ملاوہ ہیں، دوسرے یہ کہیں املاک بھی ارکان کی نہیں ہو جائیں گی، ادارہ ہی کی رہیں گی، البتہ ان کو عارضی طور پر سوسائٹی کی مجلس انتظامیہ میں دیعت کیا جائیں گا، اور ان کو مقدمات میں گورنگ بادی کی ملکیت بیان کیا جائیں گا، اس کی مثال بالکل صحیح یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد پر دعویٰ کرے تو وہ دعویٰ متولی پر کیا جاتا ہے اور اس مقدمہ میں جواب دہ متولی ہوتا ہے، اس کا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ متولی مسجد یا اس کی املاک کا املاک پوچھیا ہے دوسری دفعہ (یعنی دفعہ ۲۲) کی رو سے یہ اشکال ہے کہ ادارہ کی املاک

گورنمنٹ کی ملکیت بن جاتی ہے، کیونکہ اس میں عدالت کا یا اختیار تسلیم کیا گیا ہے کہ اگر رجسٹرار کی مداخلت کے باوجود ادارہ کے حالات درست نہ ہوں تو وہ رجسٹریشن کی کینسل کردیں گے اور اس صورت میں عدالت طے کرے گی کہ اماکن کی ذمہ داری اور حسابات کے بیباق کرنے کی کیا صورت ہو۔

یہاں بھی یہ بات محوظر ہنسی چاہئے کہ اولاً تو یہ ساری گفتگو، اوقاف کے علاوہ دیگر اماکن کے بارے میں ہے، کیونکہ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ رجسٹریشن کی رو سے جو اماکن عارضی طور پر ادارہ کے بجائے ارکان ادارہ میں ودیعت کی گئی ہیں وہ اوقاف کے علاوہ ہیں۔

دوسرے کریں کہ اگر ادارہ کے حالات درست نہیں ہوتے تو یہ اقدام کیا جائیگا کہ عدالت، اماکن اور حسابات کے سلسلے میں فیصلہ کرے گی، یہ واضح نہیں کیا گیا کہ یہ فیصلہ یہی ہو گا کہ اس کو گورنمنٹ اپنی جائیداد بنالے گی، صرف یہ کہا گیا ہے کہ عدالت اس سلسلے میں فیصلے کی مجاز ہو گی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عدالت کو ملکیت تبدیل کرنے کا اختیار ہی نہیں، جب یہ بات طے ہے کہ وہ اماکن ادارہ کی ہیں تو وہ یقیناً ادارہ کی رہیں گی لیکن ان کے تحفظ یا جن رفاهی امور کے لئے ان کا تعین کیا گیا تھا ان کے لئے مفید بنانے کے سلسلے میں عدالت کو کارروائی کا حق ہو گا گویا یہ صرف انتظام کی تبدیلی ہے، ملکیت کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ اس سلسلے میں یہ واضح رہنا چاہئے کہ انتظام کی تبدیلی شوریٰ بھی کرتی ہے جیسے مفردات پیش آنے پر صتم کو تبدیل کر دیا جاتا ہے دغیرہ، اس لئے انتظام کی تبدیلی سے یہ نتیجہ نکان کر دتف ختم ہو گیا اور حکومت کی ملک قائم ہو گئی دغیرہ، یہ سب غلط ہے

خلاصہ یہ ہوا کہ ان دونوں دفعات سے وہ اعتراض پیدا ہی نہیں ہوتا جو اس فرقی نے رجسٹریشن کو خلاف شرع قرار دینے کے لئے بیان کیا ہے، بلکہ یہ وہ معنی ہیں جو ان دفعات کے الفاظ کے خلاف ہیں، چنانچہ مدرسہ مظاہر علوم کے رجسٹریشن کے بارے میں سہارنپور کے ۲۵ وکلاء کے بیان پر مشتمل ایک اشتہار شائع کیا گیا جس میں یہ تلایا گیا ہے کہ رجسٹریشن سے وقف کا تقاضا نہیں ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں۔

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کے رجسٹریشن کے حق میں ۵ مسلم متذمتوں قانون دالا و زامو و کلاما

متقدم بیان

مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور کی مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کے رجسٹریشن کو لے کر آج کل شہر دیر دن شہر میں کافی چرچے ہو رہے ہیں، اور اس بارے میں بہت کچھ فلک افواہیں پھیلائی جا رہی ہیں، ہم نے بحثیت ایک مسلمان کے اپنا فرض کھجتے ہوئے اس مسئلہ پر قانونی نقطہ نظر سے غور کیا پورے غور و خوض کے بعد ہم درج ذیل وکلا اس تجویز پر پہنچ کر مدرسہ مظاہر علوم کی مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کا رجسٹریشن کسی بھی لحاظ سے مدرسہ کے لئے نقصان دہ نہیں ہے اور اس رجسٹریشن سے مدرسہ کی موقد حیثیت ہرگز نہیں بدلتی اور مدرسہ اور اس کی املاک کی حیثیت بھی مجرد ہی نہیں ہوتی مدرسہ مظاہر علوم اور اس کی املاک پھر بھی وقف رہیں گی، رجسٹریشن سے وقف ختم نہیں ہوتا رجسٹریشن مجلس شوریٰ اور اس کے دستور کا ہوا ہے

جناب مولوی انور علی صاحب ایڈوکیٹ کی رائے
 میں نے درسہ منظاہر علوم کی سوسائٹی کے رجسٹریشن سے متعلق کافی دسات
 کا بغور مطالعہ کیا، مدرسہ کی وقف جائیدادوں کے متعلق وقف رجسٹر کا بھی
 معاشرہ کیا اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مدرسہ منظاہر علوم سوسائٹی کا ایکٹ
 ۱۸۶۰ء کے تحت رجسٹریشن مسلم مفاد مامہر میں ہے، جو جائیدادیں مقاصد
 مدرسہ کیلئے وقف ہیں ان کی ملکیت ارکان شوریٰ میں ودیعت (VEST) نہیں کرتی بلکہ مجلس شوریٰ انتظام مدرسہ و جائیداد ہائے موقوفہ متعلقہ مدرسہ
 مذکور کے انتظام کی حق ودیعت (VESTING) کیم کرتی ہے اور جائیداد ہائے
 موقوفہ کی ملکیت بدستور خداوند تعالیٰ کی رہتی ہے، منظاہر علوم کے اس رجسٹریشن
 سے وقف کی حیثیت کا انہدام نہیں ہے، اور مدرسہ کے لئے ضرر سال
 نہیں ہے۔

انور علی ایڈوکیٹ، ۵ جنوری ۱۹۷۸ء

جناب مولوی محمد حسن صاحب ایڈوکیٹ کی رائے
 میں انور علی صاحب ایڈوکیٹ کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں

محمد حسن ایڈوکیٹ

جناب مولوی شماراحمد صاحب ایڈوکیٹ کی رائے

جس طرز سے مدرسہ منظاہر علوم کا رجسٹریشن ہو لے اس سے موقوفہ
 جائیداد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور جائیداد موقوفہ کی نوعیت تبدیل نہیں ہوتی

شماراحمد ایڈوکیٹ

(المشتهرون) :- انور علی ایڈوکیٹ - عزیز حسن ایڈوکیٹ

دلواد احمد ایڈوکیٹ محمد طارق ایڈوکیٹ محمد قاسم ایڈوکیٹ
 معین الدین حسین احمد مادر حسین زیدی محمد حسن
 واجد علی خاں افضل احمد راؤ منصار علی خاں احسن فطیم
 اسلوب احمد انوار احمد صدیقی خورشید احمد خاں محمد انوار انصاری تابان
 اقبال احمد خورشید احمد قریشی رضوان فطیم نظہریہ انصاری
 جی خاں دسمیم احمد رکن الدین ناصر حسن
 معراج الحق کاظمی حافظ محمد فاضل ، اختر حسین زیدی فیصلہ الزماں
 اکبر علی ارشد حسن زیدی طارق مرزا محمد فاروق محمد انور
 ۲۵ مسلم دکل کے اس بیان میں واضح طور پر یہ اعتراف ہے کہ ایکٹ ۱۸۹۸ء کے تحت رجسٹریشن وقف جائیدادوں کی حیثیت پر بالکل اثر انداز
 نہیں ہے، اور وجہ یہی ہے کہ جس دفعہ کی رو سے یہ اشکال کیا گیا ہے اس دفعہ
 میں وقف، بلکہ اس سے بھی عام لفظ ٹرست کو مستثنیٰ کر کے دیگر جائیدادوں
 کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، اس لئے مدارس کے اوقاف سے اس دفعہ کا
 تعلق ہی نہیں ہے۔

رہا اوقاف کا معاملہ تو ان کے تحفظ کے لئے گورنمنٹ نے مستقل نظام
 کیا ہے مسلم وقف بورڈ کا قیام۔ اوقاف کے تحفظ اور ان کی نگرانی ہی کے
 لئے عمل میں آیا ہے مسلمانوں کے جتنے بھی اوقاف ہیں ان سب کا تعلق مسلم
 وقف بورڈ سے ہے، دارالعلوم یا دیگر مدارس کے نام جتنی جائیدادیں وقف
 ہیں ان سب کا تعلق مسلم وقف بورڈ ہی سے ہے، ان اوقاف کا جلد بنزو بست

واقفین کی تصریح کے مطابق کیا جاتا ہے، ان کی تولیت امدنی اور مصارف کے سلسلے میں واقف کی شرائط کی مکمل پاسداری کی جاتی ہے، البتہ وقف کے علاوہ جو جائیدادیں مدرسہ کی ملکیت ہوتی ہیں ان کا انتظام سوسائٹی کے تحت، دستور اساسی کے مطابق کیا جاتا ہے

وقف اور دیگر املاک

یہاں اس حقیقت کا منقح کر دینا نہایت ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مدارس عربیہ کی تمام جائیدادوں اور املاک کی نوعیت کیا ہے؟ حضرات فقہاء کرام ہر جائیداد کو وقف ہنسیں کہتے بلکہ وقف جائیداد کی ایک خاص نوع اور فرقہ کی مخصوص اصطلاح ہے، اس کی مستقل تعریف، شرائط، الفاظ اور احکام ہیں، فقہاء کرام نے ان تمام چیزوں کی امکان انسانی کی حد تک اس طرح تفصیل کر دی ہے کہ ہر جو یہ منقح ہو گیا ہے۔

اگر کسی جائیداد پر وقف کی تعریف صادق نہ آئے یا وہاں وقف کے شرائط نہ پائے جائیں تو اس کو اصطلاحی طور پر وقف ہنسیں کہا جائیگا یہ الگ بت ہے کہ وہاں شخصی ملکیت بھی متحقق نہ ہو، بلکہ ادارہ کی ملکیت یا عمومی ملکیت کے سبب اس کا انتظام و انصرام بھی وقف کی طرح کیا جائے، گویا کسی جائیداد کے وقف نہ ہونے سے اس کا ذاتی ملکیت ہونا لازم ہنسیں آتا۔

وقف کی تعریف

وقف ثلاثی کا مصدر ہے اور اس کے لغوی معنی میں روکنا، باندھنا، اصطلاحی تعریف میں امام اعظم ابوحنیفہ اور صاحبین یعنی امام ابویوسف اور امام محمدؐ کے نقطہ نظر میں فرق ہے، اس کی تعریف کرنے ہوایہ کی عبارت پڑھ ہے شریعت میں امام ابوحنیفہ کے نزدیک هو ف الشرع عند ابی حنیفة
کسی شئی کی ذات کو، واقف کی ملکیت حبس العین علی ملک
میں محبوس کر دینا اور اس کے نفع کو عاشر الواقف والتصدق
کے طور پر تصدیق کر دینا وقف کہلاتا بالمنفعة بمنزلة العاشرية
ہے، اور صاحبین کے نزدیک کسی شئی و عند هما حبس العین
کی ذات کو اشہد کی ملکیت کے حکم میں علی حکوم ملک اللہ
رو کے رکھنا وقف ہے چنانچہ صاحبین تعالیٰ فیزوں ملک
کے نزدیک اس شئی سے واقف کی تعالیٰ الواقف عنه الى اللہ تعالیٰ
ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور اشہد کی على وجہ تعود منفعته
ملکیت اس طرح قائم ہو جاتی ہے کہ الْعَبَادُ فِي لِزَامٍ وَ لَا يَبْاعَ
اس کے منافع بندوں کو حاصل ہوتے دَلَّا يَوْهَبُ وَ لَا يُورَثُ
ہیں، وہ وقف لازم ہو جاتا ہے اس دَالْفَظُ يَنْتَظِمُ بَيْنَهُمَا۔
کو فروخت نہیں کیا جا سکتا، یہ نہیں
کیا جا سکتا اس کو دراثت میں تقسیم

نہیں کیا جاسکتا اور لفظ وقف امام
حرب اور صائمین دونوں ہی کی تعریف کو
 شامل ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ امام صاحب کے یہاں کسی مخصوص چیز کو الک کی ملکیت میں روک کر اس کے منافع کو داقف کی غشا، کے مطابق نیک کاموں کے لئے مخصوص کر دینا وقف کہلاتا ہے، امام صاحب کے نقطہ نظر کی تعبیر یہ ہے کہ الک کے تصرفات کی حد بندی کر دی جائے کہ ملکیت تو اگرچہ اصل مالک ہی کی قائم رہے گی لیکن حقوق تصرف میں حد بندی کر دی جاتی ہے کہ فلاں کام کر سکتے ہو، اور فلاں کام نہیں کر سکتے، جب کہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے یہاں بھی موقوفہ سے الک کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ معنوی طور پر خدا کی ملکیت میں اس طرح آجائی ہے کہ اس کے منافع سے مخلوق جائز طور پر مستفید ہوتی رہے۔

وقف میں الک کی ملکیت کے ازالہ کی مشطیں

یہاں یہ تفصیل بھی ضروری ہے کہ امام صاحب کے نزدیک بھی الک کی ملکیت کا بقاہر حال میں ضروری نہیں بلکہ اگر وقف کے ساتھ حاکم کا فیصلہ بھی شامل ہو جائے کہ الک کی ملکیت ختم کر دی گئی ہے تو وہ ختم ہو جائے گی، یعنی الک کی ملکیت کا بقاہر تجیل اور جسٹیشن سے پہنچے ہے، اگر حاکم کا حکم شامل ہو جائے گا تو الک کی ملکیت ختم ہو جائے گی جبکہ امام ابو یوسف

کے یہاں صرف وقف کرنے سے الک کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد کے یہاں وقف کرنے کے بعد متولی یا مستحقین کو پسرو کر دینا ازاں الک کی ضروری شرط ہے، ہدایہ میں ہے۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف سے زائل نہیں ہوتی مگر کہ کوئی حاکم اس کا حکم دیدے یا واقف اس کو اپنی موت پر معلق کر دے اور یہ کہے کہ جب میں ہر جاؤں تو میں نے اپنا گھر اس کے لئے وقف کیا اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف پر دلالت کرنے والا کلمہ کہتے ہی ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت (قول ۲) زائل نہیں ہوتی یہاں تکہ وقف کے لئے متولی مقرر کرے اور ہائیکورٹ اس کے پسرو کر دے۔

علامہ ابن ہمامؓ نے ہدایہ کی اس عبارت کی شرح ان الفاظ میں لکھی ہے امام ابوحنیفہ نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت وقف سے زائل نہیں ہوتی

قال ابوحنیفۃ لا یزول ملک الواقف عن الوقت الا ان یحکوبه حاکم او یعلق بموته، فيقول اذا مت فقد وقفت داری على عذر و قال ابو یوسف یزول ملکه بمجرد القول و قال محمد لا یزول حتی یجعل للوقف ولیا ویسلمه اليه۔

(ہدایہ ۲۶)

قال ابوحنیفۃ رحمہ اللہ لا یزول ملک الواقف

محیر کہ کوئی حاکم اس کا حکم (یعنی الک کی ملکیت سے خارج کرنے کا حکم) دیدے یا وقف کو واقف اپنی موت پر متعلق کرے کہ میں مر جاؤں تو میرا بکان اس پر وقف ہے اور امام ابو یوسف نے فرمایا کہ واقف کی ملکیت مغض قول سے ختم ہو جائے گی، یعنی وہ اقوال جن کے ذریعہ وقف کا صحیح ہونا بیان کیا جا چکا ہے اور امام محمد نے فرمایا کہ وقف کی ملکیت اس وقت تک زائل نہیں کی جب تک کہ وہ وقف کیلئے متولی مقرر کر کے شئی موقوف کو اسکے پردہ نہ کرو یعنی وقف کے الفاظ کے ذریعہ وقف کرنے کے بعد پردہ نہ کرے، امام محمد کے مسلک کو مشائخ بخاری نے اختیار کیا ہے۔

(فتح القدير ج ۲ ص ۲۹)

علوم ہوا کہ امام صاحب کے یہاں واقف کی ملکیت کی بقارہ حکم حاکم سے پہلے تک ہے، اگر حاکم ازالہ ملکیت کا حکم دیدے تو واقف کی ملکیت ختم ہو جاتی ہے، البته امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک ازالہ ملک کے لئے حکم حاکم کی ضرورت نہیں، امام ابو یوسف کے یہاں جو کلمات سے وقف صحیح ہو جاتے ہے

عن الوقف الا ان يحڪم
به حاكمواي بخر وجهه عن
ملكه او يعلقه اي يعلق
الوقف بمorte فيقول
اذامت فقد وقفت
دارى على حدا و قال
ابو يوسف يزول بمجرد
القول الذي قدمنا
صحة الوقف به و قال
محمد لا يزول حق
يجعل للوقف متوليا
و سلمه اليه بعد
ذلك القول وبه اخذ
مشائخه بخاري۔

ان کے ذریعہ وقف کرنے کے بعد مالک کی ملکیت کے ازالہ کے لئے کوئی شرط نہیں، اور امام محمد کے پہاں ان کلمات کے ذریعہ وقف کرنے کے بعد ازاں لے ملک کے لئے یہ شرط ہے کہ وقف کامتوں مقرر کر کے شئی موقوف کو اس کی تحویل میں دیدیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ امام محمد کے پہاں صرف متولی کے سپرد کر دینے کا عمل وقف نہیں ہے بلکہ سپرد کر دینا تمکیں وقف کی ضروری شرط ہے، وقف کی اصل حقیقت الفاط وقف ہی سے متعلق ہوتی ہے، صاحب فتح القدير نے امام محمد کے منلک کی وضاحت میں "بعد ذلك القول" کا اضافہ اسی لئے فرمایا ہے کہ عرض عمل کو وقف قرار دینا درست نہیں ہے۔

وقف کی شرائط

وقف چونکہ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے صرف منافع سے استفادہ کی راہ قائم کرنے کا عمل ہے اور شرعاً یہ خصوصی تصرف ہے اس لئے فقہاء کرام نے اسکی شرائط کو تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، یہ شرطیں نقہ کی متبادل کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہیں، فتح القدير ^{۳۸} اور الجواب الرائق ^{۴۹} میں گیارہ شرطیں ذکر کی گئی ہیں، پہاں فتاویٰ عالمگیری سے ان شرائط کو تعلق کیا جا رہا ہے۔

اما شرائطہ، ف منها العقل	رہا وقف کی شرائط کا بیان تو ان
والبلوغ ومنها الحرية	شرطوں میں سے واقف کا عاقل

اور بائیع ہونا ہے، اُزاد ہونا ہے، البتہ
اسلام صحت وقف کی شرط نہیں ہے
ادا نہی شرائط میں سے یہ ہے کہ جس
کام کئے وقف کیا گیا ہے وہ بذات
خود ثواب کا کام ہو، اور انہی شرائط
میں سے یہ ہے کہ واقف وقف کے
وقت اس حصہ کا مالک ہو، یہاں تک کہ
اگر کسی شخص نہیں کسی زمین کو غصب کے
وقف کر دیا پھر اس کو مالک سے خرید
لیا اور قیمت ادا کر دی یا جو مالک کو دیا
تھا اس پر صلح کر لی تو یہ زمین وقف نہیں
ہو گی (البخاری) کسی شخص نے کسی
دست کی زمین کسی معین کام کئے
وقف کر دی پھر واقف اس زمین کا
مالک ہو گیا تو یہ جائز نہیں ہاں اگر
مالک ہی نے اجازت دیدی تو درست
ہے رفتادی قاضیان) اور اگر اس شرط
پر زمین خریدی کہ بائیع کو خیار بیع حاصل
رہے گا اسی دوران مشری نے اس

واما الایسلام فليس
بشرط، ومنها ان يكون
قربة في ذاته
ومنها الملك وقت الوقف
حتى لو غصب ارضها
فوقفها شرعاً شرعاً
من مالكها ودفعه
الثلث عليه او صاحبه
على مادفعه، اليه
لا يكتون وقفاً كذا
في البعد الرائق - رجل
وقف ارضه الرجل آخر
في برساته ثم ملك
الارض لويجن، و
ان اجانت المالك
جاً عن دنا
كذا في فنادق قاصي
خار، ولو اشتري ان
البائع بالخيار فيها

کو وقف کر دیا پھر ائمَّه نے اجازت دے
دی تو وقف جائز نہیں (البخاری) اور
اگر کسی شخص کو کوئی زمین ہبہ کی گئی اس
شخص نے قبضہ کرنے سے پہلے اس کو
وقف کر دیا پھر اس پر قبضہ کیا وقف صحیح
نہ ہوگا (فتح القدير)

ملکیت کی اسی شرط پر یہ مسئلہ بھی متفرع
ہے کہ سلاطین کی جانب سے جاگیر دوں
کا وقف کرنا بھی جائز نہیں الایہ کہ زمین
غیر آباد اور ویران پڑی ہو یا خود امام
کی ملکیت ہو اور امام یہ زمین کسی کے
نام کر دے، اسی طرح امام کیلئے حوز
کی زمینوں کا وقف کرنا بھی جائز نہیں
کیونکہ وہ ان کا مالک نہیں ہے ارض
حوز کا مطلب یہ ہے کہ زمین کا مالک
زمین میں کاشت قائم رکھنے اور
خارج ادا کرنے سے ماجز ہو جائے
اور وہ زمین امام کے پرد کر دے تاکہ
زمین کی امدنی سے خارج کاتمارک

فوقہا شرعاً جائز البائع
لمریجن الوقف کذ اف
البحر الراشق ولو وقف
الموھوب له الارض قبل
تبضمها كما يصح الوقف
کذ اف فتح القدير
ويترفع على اشتراط
الملك انه لا يجوز وقف
الاقطاعات الا اذا
كانت الارض مواتا او
كانت ملكا للامايم فاقطعها
الامايم رجلا وانه
لا يجوز وقف اس حق الحوز
للامايم لانه ليس بملك
له او تفسير ارض الحوز
ارض عين صاحبها عن
زراعتها واداؤ خراجها
فدفعها الى الامايم ليكون
منافعها جبرا للخراج

کیا جائے (البهر الفائق)

اسی ملکیت کی شرط پر یہ مسئلہ مقرر ہے
کہ مرتد کے لئے زمانہ ارتدا میں وقف کنا
جا رہ نہیں اگر وہ اسی ارتدا کے سبب
قتل کیا گیا ہو یا اسی دوران میں گیا ہو،
کیونکہ اس زمانہ ارتدا میں اس کی ملکیت
موقوف کردی جاتی ہے (البهر الفائق)
وقف کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ
واقف پر کم عقلی یا مقرر و ضریب ہونے کے
سبب پابندی مائدہ کی گئی ہو، انہی
شرائط میں مجھوں نہ ہونا ہے چنانچہ اگر
کسی نے اپنی زمین کا غیر معین حصہ
وقف کر دیا تو باطل ہے۔ انہی شرائط میں
سے یہ ہے کہ وقف ناقص اور غیر متعلق ہو
انہی شرائط میں سے یہ ہے کہ وقف کے
سامنہ واقف نے اس کو بھیپنے اور اسکی
قیمت کو اپنے اور مرف کرنے کی شرط
نہ لگائی ہو، اگر اس نے اس کا ہا ہے تو وقف
قول مختار پر صحیح نہیں ہے۔

کذا فی البحدار ائمۃ۔

وَكَذَلِكَ أَعْدَمْ جُوازَ وَقْفٍ

المرتد زمان سدتہ ان

قتل علی ذلك او مات

لان ملکه یزول بجاذب والا

موقوفاً، كذا ف النهر

الفائق۔

وَمُنْهَا ان سلا بیکوت

محجوراً عليه لسفره او

دین و مُنْهَا عدم

الجهالة فلود قعف من

ارضه شيئاً ولو يسمة

سوان با طلا و منها

ان يَكُونُ مُنْجَزاً

غير متعلق و منها ان سلا

بِذِكْرِهِ اشتراط

بعده و صرف الثمن الى

حاجته فان قاله لسو

يصح الوقف في المختار۔

اور انہی شرائط میں سے یہ ہے کہ قف
ہمیشہ کے لئے ہو اور یہ تمام ائمہ کے
یہاں شرط ہے لیکن اس کا ذکر ہونا
ام ابو یوسف کے یہاں ضروری نہیں
اور یہی صحیح ہے اور انہی شرائط میں
سے یہ ہے کہ امام ابو عینیف اور امام محمد
کے یہاں آمدی کو ایسے کام کے
مقرر کیا گیا ہو جو کبھی ختم ہونے والی
نہ ہو اگر یہ بات مذکور نہ ہو تو ان دونوں
کے نزدیک وقف صحیح نہیں ہے اور
ام ابو یوسف کے یہاں اس شرط
کا ذکر کرنا ضروری نہیں ہے، اس کے
 بغیر بھی صحیح ہے۔

وقف کے تحقیق کی یہ شرطیں شریعی موقوف، داقف اور موقوف علیہم تینوں
ہی سے متعلق ہیں، اور ان شرطوں کے زپائے جانے کی صورت میں وقف کی
حقیقت کا تحقق نہ ہونا تمام ہی فقہاء کے نزدیک تسلیم شدہ ہے، ان شرائط میں
سے وقف کے وقت، واقف کی ملکیت کو فقہا کرام کے یہاں اتنی اہمیت رہی
گئی ہے کہ اگر وقف کے وقت ملکیت میں کوئی بھی کمی ہے تو وہ اس وقف کو
درست قرار نہیں دیتے، اس شرط پر متعدد جزئیات متفرع کرتے ہوئے یہ بات

و منها الْتَّابِدُ وَ هُوَ
شَرْطٌ عَلَى قَوْلِ السَّكَلِ
وَكَنْ ذَكْرُهُ لِيَسِ
بِشَرْطٍ عَنْدَ أَبْيَاضِ يُوسُفِ
وَهُوَ الصَّحِيحُ وَمِنْهَا
أَنْ يَجْعَلَ الْاجْرَةَ
بِجَهَةِ لَا تَنْقُطُمْ أَبْدَا
عَنْدَ أَبْيَاضِ حَنِيفَةِ وَخَمْدَادِ
وَأَنْ لَوْبَدَ كَرَذَالَكَ لَعَ
يَصْحَحَ عَنْدَ هَمَادَ وَعَنْدَ
أَبْيَاضِ يُوسُفِ ذَكْرُهُ ذَرَا
لِيَسِ بِشَرْطٍ مُبْلِيَصَارَ
• (فتاویٰ فالبگری میزہ بہمن)

واضح کی گئی ہے کہ اگر زمین غصب کر کے وقف کر دی تو اگر بعد میں واقف کو صحیح طور پر ملکیت حاصل بھی ہو جائے تو وقف صحیح نہیں ہے، حدیہ ہے کہ اگر زمین خیار شرط کے ساتھ خریدی گئی تھی اور خیار بائع کو حاصل تھا تو مشری کا وقف کرنا صحیح نہیں ہے خواہ بالائے بعد میں خیار ختم کر کے بیع کو تمام کر دیا ہو۔ یا اگر کسی کو زمین ہبہ میں ملی لیکن اس نے قبضہ کرنے سے پہلے اس کو وقف کر دیا تو وقف صحیح نہیں ہے، اسی شرط پر یہ بھی متفرع ہے کہ سلاطین جن زمینوں کے مالک نہیں ہیں اگر وہ ان زمینوں کو وقف کرتے ہیں تو وقف درست نہیں ہے، مرد اگر زماں ارتدار میں وقف کرتا ہے تو جونکہ اس زماں میں اس کی ملکیت کو موقوف کر دیا جاتا ہے اس لئے وقف درست نہیں، وغیرہ۔

وقف کے الفاظ

اس کے ساتھ یہ بیان کر دینا بھی ضروری ہے کہ تمام ہی فقهاء کام نے وقف کے باب میں اس بحث کو بھی بہت اہمیت دی ہے کہ وقف شرعی کے تحقیق کے لئے کن الفاظ کی ضرورت ہے اور کن الفاظ سے وقف کی حقیقت تتحقق نہیں ہوتی، فتح القدیر میں ہے۔

و امساکت فالالفاظ الخاصة	رہا وقف کے کرن کا بیان تو وہ خاص
کیان یقول امر ضمی هذہ	الفاظ میں مثلاً یہ کہے کہ میری یہ زمین
صدقة موقوفة موبدة	ابدی طور پر مساکین کے لئے صدقہ
علی المساکین ول الاخلاف فی	موقوفہ ہے اور وقف کے، شرائط

ثبتہ بہذ الفاظ
بعد شروعہ دلہ باس
ان نسوں شیئا من الالفاظ
(فتح القدير ج ۱۹)

وقف کے پائے جانے کی صورت میں ان الفاظ کے ذریعہ ثابت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور مضائقہ نہیں کہم کچھ الفاظ ذکر کریں۔

اسکے بعد علامہ ابن ہمام نے چند الفاظ اور ان کے احکام بیان فرمائے ہیں کہ ان الفاظ سے وقف ثابت ہو جائیگا اور ان الفاظ سے ثابت نہ ہوگا، اسی طرح علامہ ابن حبیم رحمۃ اللہ علیہ اس نے الہجران میں استقراء کر کے ان الفاظ کے استیعاب کی کوشش کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

داما رکن، فا الالفاظ المخاصة
الدالة عليه وهي سستة
وعشرون لفظاً، الا دل امر ضي
هذا صدقۃ موقفة
مودۃ على المسکین دل
خلاف فيه انا (الہجران ج ۱۹)

ربما وقف کارکن، تودہ خصوصی الفاظ
میں جو وقف پر دلالت کریں اور حبیس
الفاظ میں، جن میں پہلا الفظه ہے کہ
میری یہ زمیں ابدي طور پر مساکین کے
لئے صدقہ موقوفہ ہے اور اس میں کوئی
اختلاف نہیں۔

پھر علامہ ابن حبیم نے یہ حبیس کلمات تفصیل کے ساتھ شمار کئے ہیں، جن میں سے بعض کلمات میں وقف کی مراحت ہے، بعض کلمات میں وقف کی مراحت نہیں لیکن وہ معنی وقف پر دلالت کرتے ہیں، ان کلمات میں سے بعض کے بارے میں انہوں نے فقہاً کا اختلاف بھی نقل کیا ہے، ان میں سے بعض کلمات ایسے بھی ہیں جن سے وقف کی تامیت بولنے والے کی نیت کو وفاوت

پرستوں ہے اور ضمن میں ایسے کلمات بھی ذکر کئے گئے ہیں جن سے وقف صحیح نہیں ہوتا، اس بحث کو فتاویٰ عالمگیری میں پوری ایک فصل میں بیان کیا گیا ہے، فصل۔ فی الالفاظ التي ينتهي بـها الوقف وما لا ينتهي بـها (فتاویٰ عالمگیری ج ۶ ص ۲۳) الفاظ جن سے تمام نہیں ہوتا۔

۲۳ فصل میں فتاویٰ عالمگیری کے طرز کے مطابق متقدمین و متاخرین کی کتابوں کے حوالہ سے وہ الفاظ یا تعبیرات جمع کی گئی ہیں جن سے وقف کا تمام ہونا یا نا تمام ہونا معلوم ہوتا ہے، یہ الفاظ اگرچہ تعداد میں ال جوازان کے چیزیں کلمات سے کچھ زائد ہو گئے ہیں لیکن حقیقت کے لحاظ سے یہ تعبیر کا تنوع ہے، یہاں طوالت کے خوف ان تمام کلمات کو نقل نہیں کیا جا رہا ہے، لیکن ان حوالوں سے اجاتی طور پر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقف کی تمامیت کے لئے مقررہ کلمات یا ان کے ہم معنی تعبیر کا ہونا ضروری ہے۔

یہ بات کہ وقف کے لئے وقف پر دلالت کرنے والے الفاظ بھی ضروری ہیں الاستباء والنظر میں صراحةً کے ساتھ مذکور ہے، علامہ ابن نجیم نے پہلے ایک اصول بیان کیا ہے کہ لا یشرط مع نية القلب التلفظ في جميع العبادات یعنی عبادات میں قلب کی نیت کے بعد لفظ کی ضرورت نہیں ہے پھر اس کے بعد صراحةً فرمائی ہے۔

اس قاعدة کلیہ سے چند مسائل
و خرج عن هذا الامر
مستثنی میں ان میں سے ایک
مسئل منها النذر لاتکنی

نذر ہے کہ اسکے وجوب کیلئے نیت
کافی نہیں بلکہ نذر کا لفظ بھی ضروری
ہے، فقہاء نے باب الاعتكاف میں
اس کی تصریح کی ہے، اور ان ہی
مصنفات میں سے وقف بھی
ہے خواہ مسجد ہی ہو کہ اس کے لئے
دلالت کرنے والے الفاظ کا ہونا ضروری ہے
علامہ ابن حبیم ایک دوسرے موقع پر وقف کے ایک جزئیہ کی تصریح
کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فی ایجابہ النیۃ بل لا بد
من التلفظ به صرحوابہ
فی باب الاعتكاف، ومنها
الوقف ولو مسجد لا بد
من اللفظ الدال علیه
(الاشباء والذنار مسمیٰ ۲۸)

کو وقف کے بارے میں اصول یہ ہے
کہ اگر مقاصد پر الفاظ دلالت نہ کرتے
بلکہ نظر میں، تو ان کا اعتبار نہیں کاہے۔
ان تصریحات سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ وقف کے تحقق کے لئے
الفاظ ضروری ہیں، بلکہ نظر میں، بخشنے کے ذمیں میں بعض ایسے الفاظ
بھی شامل کئے ہیں جن سے بظاہر وقف کے ثبوت کا شہرہ پیدا ہو جاتا ہے
لیکن متقدمین و متاخرین سب کا آتفاق ہے کہ اس لگن سے وقف کا تحقق
نہیں ہوتا، مثلاً مبسوط سرخی میں ہے۔

ان المقاصد اذا وعید
عليه اللفظ لا يعتبر -
(الاشباء والذنار مسمیٰ ۲۹)

شو لا خلاف انه لو
قال تصدقت بارضي
ہے کہ اگر کسی نے یہ کہا کہ میں نے اپنی

یہ زمین فقراء و مساکین پر صدقہ کی تو
یہ وقف نہیں ہو گا بلکہ اگر کہنے والے
نے یہ الفاظ اپنے اور لازم کرنے کی
نیت سے کہے ہیں تو اس کو صدقہ کرنے
کی نذر قرار دیا جائیگا، پھر یہ کہا گر
اس نے کسی انسان کو بھی معین کر دیا
ہے تو اس کو اس شخص کے لئے تملیک
کے طور پر صدقہ قرار دیا جائے گا جو
تسیم اور تفسیر دینے کے بعد تمام ہو گا۔

اس طرح کے کلامات کے بارے میں فتح القدير میں ہے۔

میری یہ زمین صدقہ ہے یا یہ کہا کہ میں
نے اپنی اس زمین کو مساکین پر صدقہ
کیا تو یہ وقف نہ ہو گا بلکہ اس کو نذر
قرار دیا جائے گا اور اس زمین کو یا
(نیچ کر) اس کی قیمت کو صدقہ کرنا
 ضروری ہو گا، اگر ایسا کریا تو نذر پوری
 ہو جائے گی درہ (ترک نذر کا گناہ ہو گا)
 اور وہ زمین اس کی مملوک سمجھی جائیگی)
 اسکی وراثت میں وہ زمین (منہ کیے بعد)

هذه علی الفقراء والمساكين
انه لا يحون وقفها
بل يكون ذلك نذراً
بالصدقة اذا أقصد
به اللازم فان عيّن
انساناً فهو تصدق عليه
طريق التملّك ولا يتو
الابالتسليم.

(رسبو طرسوس پڑی)

ارضی هذه صدقة اول
قال تصدق بتراضی هذه
على المساكين لا تستكون
وقفاً بل نذراً يحب
التصدق بعيّنها او بقيمةها
فإن فعل خرج عن
عهدته النذر والادرث
عنده كمن عليه
نزهة او كفاره نمات

بلا ایصاد تو رشت
عنه۔

(فتح القدير ص ۱۸)

شامل ہو گی جیسے وہ شخص جس پر زکۃ
یا کفارہ واجب ہوا درودہ وصیت کے
بغیر مر جائے تو مال و راثت میں تقسیم کیا جائے ہے۔

اس طرح کے کلمات کے بارے میں فتاویٰ عالمگیری میں ہے۔

فتاویٰ میں یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے
یہ کہا کہ میری یہ زمین صدقہ ہے تو یہ صدقہ
دینے کی نذر ہے حتیٰ کہ اگر اس نے اس
زمین کو یا بیچ کر اس کی قیمت کو فقراء
پر صدقہ کر دیا تو جائز ہے (کذافی الخلاصہ)
اور اگر اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی یہ
زمین مسکین پر صدقہ کی تو زمین وقف
نہیں ہو گی بلکہ اس کو نذر قرار دیا جائیگا
اور خود اس زمین کو یا اسکی قیمت کو
مدقر میں دینا واجب ہو گا، پھر اگر کہنے
والے نے صدقہ کر دیا تو نذر کی ذمہ اوری
پوری ہو جائیگی ورزہ وہ زمین کہنے والے
کے مرنس کے بعد و راثت میں شامل ہو گی
(کذافی فتح القدير) اور قاضی اسکو صدقہ
کرنے پر مجبور نہیں کریگا اسلئے کہ یہ نذر کے

وف الفتادی رجل قال
ارضی هذہ صدقۃ حان
نذر بالتصدق حتیٰ لو
تصدق بعينها او بقيمتها
على الفقراء جائز كذا في
الخلاصة . ولو قال تصدق
بامضی هذہ على المساكین
لا يكون وقفاً قبل نذرها
يجب التصدق بعينها او
بقيمتها فان فعل خرج
عن عهدة النذر و الا
وراثت عنه كذا في
فتح القدير ولا يحتج به
القاضی على الصدقۃ
لات هذَا بمنزلة النذر

کذاف فتاویٰ قاضی خا^ن
دلو قال ارضی هندا
صدقہ علی وجہ الخیر
والبر لوبیکن ذلك وقنا
بل نذر را، گذاف الغلوپریہ (مالکی^ب) (کذافی الظہیرۃ)

در جمیں ہے (کذافی فتاویٰ قاضی خا^ن)
اور اگر یہ کہا کہ میری یہ زمین خیر اور
ئیک کے کاموں کیلئے صدقہ ہے تو بھی
وقف نہ گا بلکہ نذر قرار دیا جائے گا،

ان حوالوں کا حاصل یہ ہوا کہ زمین یا جامیاد کو محض نیک کاموں کیلئے
دینیا وقف نہیں ہے، بلکہ وقف قرار دینے کے لئے خصوصی الفاظ اور مستعد
شرط، میں اور ان کے نہ ہونے کی صورت میں وقف کی حقیقت متحقق نہیں
ہوتی، فقہاء کرام نے فتاویٰ کی کتابوں میں ایسے ہزاروں جزئیات قلم بند کئے
ہیں کہ شرائط متحقق نہ ہونے کی وجہ سے وقف تام نہیں ہوتا، مثلاً فتاویٰ مالکی^ب
ہی میں امام خصاف کی طرف مسوب کرتے ہوئے یہ جزئیہ لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص
اپنے بڑے گھر میں سے کوئی کوٹھری وقف کر دے لیکن اس کا راستہ وقف
نہ کرے تو وقف کرنا درست نہیں ہے۔

ذکر الخصاف في وقفه
اذ وقف بيتمان داس
فان وقفه بعليقه جان
الموقف وان لم يقفه بعليقه
لعربي جل الوقف کذافی المحيط
(فتاویٰ مالکی^ب)

خصاف نے وقف کے بیان میں ذکر
کیا ہے کہ اگر کسی نے گھر میں کوئی
کوٹھری وقف کی تو اگر اسکو راستہ
کے ساتھ وقف کیا ہے تو وقف جائز
ہے اور اگر راستہ کے ساتھ وقف
نہیں کیا تو وقف جائز نہیں (کذافی المحيط)

انھی تام بخشوں کا اختصار کرتے ہوئے حضرت مولانا فتح محمد صاحب تائب
لکھنؤی نے تطبیر الاموال المعروف پر عطر بڑا یہ میں وقف کی بحث میں وقف کو
باطل کرنے والی چیزوں کو اس طرح بیان کیا ہے۔

مبطل وقف ۱۔ وہ کئے ہیں جو عنی خلاف پر دلالت کریں مثلاً
یہ کہے کریے گاؤں درویشوں کو دیا، یہ مکان مدرسہ کیلئے ہے، یہ وقف نہیں، ہبہ و
تصدق ہے (مسئلہ) وہ تمام معافیاں اور جائیدادیں جن کے وقف ناموں میں
اس قسم کی عبارتیں ہوں ہبہ ہیں وقف نہیں۔ ۲۔ مصارف محترمہ جیسے بخلانے
کے خرچ کے لئے وقف کرنا (عالمگیری) یا تعزیز داری یا مجلس غنا کے لئے۔
۳۔ مال کا غیر متقوم و منسوب النفع ہونا جیسے محض نکمی شی یا خریا خنزیر یا
تصادر یا مزامیر وغیرہ، ۴۔ غیر ملوك یا مستحق کا وقف کرنا، غصب کی
زمین یا جس میں حق شفعہ یا حق مرثیہ وغیرہ باقی ہو، ۵۔ توقيت و خیار یعنی
یہ کہے کریے زمین دس برس کے لئے وقف ہے یا مجھے اختیار ہے چاہے وقف باقی
رکھوں یا نہ (عطر بڑا یہ مسئلہ)

حضرت مولانا فتح محمد صاحب نے ان پانچوں چیزوں کو مبطل وقف قرار
دیا ہے جن میں کلام وقف یا شرائط وقف پائے نہ جانے کی وجہ سے حقیقت
وقف متحققاً نہیں ہوتی، ان میں سے پہلی بات انھوں نے یہ فرمائی ہے کہ اگرایے کلام
استعمال کئے گئے جو وقف کے بجائے وقف کے خلاف کسی اور عنی پر دلالت
کرتے ہوں، مثلایہ کہے۔ یہ گاؤں درویشوں کو دیا یا یہ کہا کہ یہ مکان مدرسہ کیلئے
ہے تو اس کو وقف قرار نہیں دیا جائیگا، بلکہ یہ چیزیں درویشوں اور مدرسہ کیلئے

ہبہ اور صدقہ قرار دی جائیں گی۔

حضرت مولانا فتح محمد صاحب کا یہ ارشاد مبسوط سرخی، فتح القدر اور فتاویٰ عالیگیری کے انھیں جزئیات کی طرح ہے جو اور پر نقل کی گئی ہیں کہ ان الفاظ کے ذریعہ وقف کی حقیقت متحقق ہنس ہوتی بلکہ جس طرح اسے ضمیم ہڈہ صدقۃ علی المساکین کلہ نذر ہے، اسی طرح یہ کلمات کہ گاؤں دو شیوں کو دیا یا مکان مرسہ کیلئے ہے، یہ تملیک کے کلمات ہیں جن سے ہبہ اور صدقہ کی حقیقت متحقق ہو جائے گی یعنی ان کلمات سے مدرسہ کی ملکیت قائم ہو جائے گی مگر مدرسہ کیلئے مکان وقف قرار نہیں دیا جائیں گا۔

مدرسہ یا ہبہ بمسجد کی ملکیت

اس سے یہ بھی ثابت اور واضح ہو گئی کہ اگر کوئی چیز مدرسہ یا مسجد کو ایسے الفاظ کے ذریعہ دی جائے جن سے حقیقت وقف متحقق نہ ہو بلکہ وہ کلمات تملیک پر دلالت کرتے ہوں تو وہ چیز مدرسہ اور مسجد کے لئے وقف نہیں ہوتی بلکہ ان کی ملکیت میں آجائی ہے، فقہاً کرام نے ایسے جزئیات بھی لکھے ہیں جن میں وقف کے بغیر مسجد یا دوسرے کاموں کے لئے اموال کا دیا جانا اور ان کا شرعاً صحیح ہونا مذکور ہے۔

ذکر الصدر الشهید فی	صلد شہید نے باب وادی میں یہ جزئیہ
باب الواو اذا صدق بخلافه	لکھا ہے کہ اگر کسی شخص نے اپنا گمراہ سجد میں یا مسلمانوں کے راستے کیلئے

صدقہ کے مود پر دیدیا تو اس سے
میں اختلاف ہوا ہے لیکن مختار یہ
ہے کہ ایسا کرنار یعنی ان کاموں کیلئے
دینا شرعاً جائز ہے جس طرح کو وقف کرنا
الذخیرۃ۔

(فتاویٰ مالکیہ ۲۷: ۱۰۵)

مفہوم یہ ہوا کہ جس طرح مسجد کے لئے یادوں کے امور خیر کیلئے جائیداد کو
وقف کیا جاتا ہے اسی طرح وقف کے بغیر ان کاموں کے لئے صدقہ دینا بھی
وقف ہی کی طرح درست ہے، اس سے زیادہ صراحت کے ساتھ یہ جزئیات
فتاویٰ میں موجود ہیں۔

کسی شخص نے مسجد کی عمارت کے لئے
یا مسجد کے خرچ کے لئے یا مسجد کی
مصلحت کے لئے درہم دئے تو یہ
درست ہے کیونکہ اگرچہ اس کو وقف
قرار دے کر توضیح ہنیں کیا جاسکت
لیکن مسجد میں ہبہ کے ذریعہ مسجد کی
ملکیت قرار دے کر صحیح کہا جاسکتا ہے
اور اگر کسی نے یہ کہا کہ میں نے اپنا مگر
مسجد کو ہبہ کیا یا عطا کیا تو یہ صحیح ہے اور
اس کو مسجد کی ملکیت میں دینا قرار دیا جائے

رحد اعلیٰ درہما فی
عمارة المسجد او نفقة
المسجد او مصالحة المسجد
صحیح لاتہ ان حسان
لایکن تصحیحه وقفها
لیکن تصحیحه عملیکا
بالہبة للمسجد ولو
قال وہیت د اسرائی
للمسجد او اعطیتها
لصحته ویکون قدس بکا

و یشتreq التسلیم کمالو
قال و قفت هذہ المائشة
للسجد یصہ بطریق
التمییک اذا اسلم للقیم
حذف المحتلوب العتابیة
(فتاویٰ مالکیگری ۱۰۳۲)

اور ہبہ کی طرح یہاں قبضہ دینا شرط
ہو گا جیسے مثلاً اگر یہ کہا کر یہ سورپے
میں نے مسجد کیلئے وقف کئے تو اگر
اس نے یہ رقم متولی کو دیدی تو اس کو
(وقف کے طور پر نہیں) مسجد کی ملکیت
قرار دیکر صحیح کہا جائیگا کہ ان اتفاقوں کی اعتباریہ

ان عبارتوں کا صاف اور صریح مفہوم یہ ہوا کہ فقہاء کرام شرائط متحقق
نہ ہونے کی صورت میں مسجد میں دینے کو صحیح اور درست قرار دے رہے ہیں
لیکن یہ دینا مسجد کو بالک بنانا ہے، مسجد کیلئے وقف کرنا نہیں ہے، مثلاً مندرجہ
بالا دو مثالوں میں غیر منقول جائیداد یعنی مکان کے سلسلے میں چونکہ دینے والے
نے کلماتِ وقف کا استعمال نہیں کیا، بلکہ اعطایا یعنی کلمہ تمییک استعمال کیا ہے
اسلئے وقف کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی تو انھوں نے اس کو مسجد کی ملکیت
قرار دیدیا، یا منقول اموال یعنی رقم کے سلسلے میں اگرچہ دینے والے نے کلمہ وقف
”وقفت“ استعمال کیا ہے لیکن یہاں دوسری شرط پائے نہ جانے کے سبب
لفظ وقف کے باوجود حقیقت وقف متحقق نہیں البتہ ملکیت یہاں بھی
ثابت ہے۔

مسجد کی ملکیت کے اعتراف کا صاف مطلب یہ ہوا کہ فقہاء کرام نے
تبریز نافلہ کے باب میں مسجد کو شخص حکمی تسلیم کیا ہے اور جس طرح شخص
حقیقی یعنی زید عمر و بکر وغیرہ کی ملکیت اور جائیداد ہوتی ہے وہ اسی طرح مسجد

اور مسلمانوں کی دیگر ضروریات کے لئے قائم کئے جانے والے اداروں کو شخص حکمی قرار دے رہے ہیں اور ان کیلئے املاک کا وجود بھی تسلیم فرار ہے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ وقف قرار نہ دینے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں کہ وہ جائیداد کسی کی ذاتی ملکیت بن جائے گی بلکہ ملکیت تو وہ مدرسہ یا مسجد ہی کی رہے گی اور اس میں وقف ہی کی طرح تحفظ بھی ہو گا، ہاں یہ ضرور ہے کہ اس پر وقف کے سب احکام جاری نہ ہوں گے، مثلاً وقف کا حکم یہ بھی ہے کہ اگر واقف نے تولیت کے بارے میں دراثت کی تصریح کر دی ہو تو واقف کی تصریح کے مطابق تولیت میں دراثت قائم رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن اگر جائیداد مسجد یا مدرسہ کی ملکیت بن گئی ہے تو اب اس کی تولیت میں دراثت کے احکام جاری نہ ہوں گے۔

در اشرف العلوم کا پور کی سید اک سلسلے میں علماء کے فتاویٰ

اگر کسی جائیداد کو مدرسہ میں وقف کی تصریح کے بغیر دیدیا جائے تو وہ مدرسہ کی ملک تو ہو جاتی ہے لیکن وقف نہیں ہوتی، اس سلسلے میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ اشرف العلوم کا پور کے بارے میں پیش آنے والے واقعہ کی مختصر روداد پیش کر دی جائے۔

مدرسہ اشرف العلوم ایک مسجد میں قائم تھا کہ وہاں کے ہم تم کو یہ پیش کش کی گئی کہ تم مدرسہ کیلئے کوئی جگہ ملاش کرلو، ایک صاحب خیر

اس کو خرید کر اس پر مدرسہ کے لئے عمارت بنوادیں گے، چنانچہ دہاں کے متینم نے جگہ تلاش کی، وہ جگہ مدرسہ کیلئے خریدی گئی، پھر اس پر تعمیر کی گئی اور مدرسہ شروع ہو گیا لیکن دو چار دن کے اندر ہی متینم مدرسہ اور ان صاحب خیر کے درمیان اختلاف ہو گیا تو ان صاحب خیر نے مدرسہ کی عمارت خالی کرالی اور اس کو ایک متینم خانے کے نام وقف کر دیا۔

اس صورت میں متینم مدرسہ کا دعویٰ تورہ تھا کہ جائیداد مدرسہ کیلئے خریدی گئی اور مدرسہ ہی کے لئے تعمیر کی گئی ہے اس لئے وہ مدرسہ ہی کی ہے، اور متینم خانہ کے متولی کا استدلال یہ تھا کہ صاحب خیر نے اگرچہ اس نیت سے جائیداد خریدی اور تعمیر کی تھی کہ مدرسہ کیلئے وقف کی جائے گی، مگر ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی تھی اس لئے صاحب خیر کا مدرسہ اشرف العلوم کے بجائے متینم خانہ کے لئے وقف کرنا صحیح ہونا چاہئے۔

چنانچہ دونوں فرقے نے اپنے بیانات قلم بند کر کے علامہ کلام سے مقابی حاصل کئے، متینم مدرسہ نے تفصیلی واقعات لکھ کر جواستفتا مرتب کیا اس میں

درج تھا ک

۱۔ یہ جائیداد مدرسہ اشرف العلوم کیلئے وقف ہو گئی یا نہیں؟

۲۔ یہ وقف نامہ جو متینم خانہ کے حق میں لکھا گیا ہے وہ شرعاً صحیح ہے یا باطل؟

چنانچہ مولانا اظفرا حمد صاحبؒ نے تھانہ بھون سے جواب دیا۔

۱۔ یہ عمارت مدرسہ اشرف العلوم کی ہے اور مدرسہ مذکور کیلئے وقف ہو چکی ہے۔

۲۔ جب یہ زمین و عمارت مدرسہ اشرف العلوم کے لئے وقف ہو چکی ہے۔

تواب تیم خانہ کیلئے اس کا وقف بالکل باطل ہے۔

(رابراز المکتوم ضمیر عطر بہایہ مت ۲۶)

جب کہ مولانا عبدالغفینظ صاحب شیع آبادی نے اس کے خلاف فتویٰ دیا، مولانا صدر الدین صدر درس جامع العلوم کا پورا مولانا غلام حکیم اور دہلی کے مشیر علماء نے اس کی تصریق کی، اس کا خلاصہ یہ تھا۔

بُر محض نیت سے وقف ہیں ہوتا، اب جبکہ یہ جائیداد صاحب خیر ہی کی ملکیت میں ہے اور اشرفِ العلوم کیلئے زانخوں نے وقف کیا اور زندوق ثابت ہوا تو یہ جائیداد ابھی تک انہی کی ملکیت میں رہی لہذا اس کا تیم خانہ کے لئے وقف کرنا بالکل صحیح ہے۔ (ایضاً م ۲۶۳)

ان متصاد فتاویٰ کے بعد، پھر خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون سے شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدفیٰ سے اور حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب کا پوری سے رجوع کیا گیا، خانقاہ امدادیہ سے اصل جواب تو مولانا عبد الکریم صاحب نے لکھا لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ نے اس پر ایک خلاصہ تحریر فرمایا۔ حضرت کی عبارت یہ ہے

”خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ زمین مدرسہ اشرف العلوم کے لئے وقف ہو تو بھی اور اگر مدرسہ کیلئے وقف نہ ہو مگر مدرسہ کی لکھ ہوتی بھی یہ حکم مشترک ہے کہ زمین کسی حال میں شیخ عبد اللطیف کی لکھ نہیں، اس لئے ان کو دوسرا جگہ اس کے دینے کا کوئی حق نہیں، ہر حال میں درسہ کا حق ہے خواہ فکا لمدرسہ خواہ وتفاالمدرسہ۔“

کتب اشرف مغلی

حضرت حکیم الامت نے اشرف العلوم کے لئے وقف ہونے کی صراحت کے ساتھ تو شرق یا تردید نہیں فرمائی یعنی انہوں نے اس جائزہ کو تیسی طور پر وقف قرار نہیں دیا اور لکھا کہ یہ زمین اور تعمیر مدرسہ اشرف العلوم ہی کی ہوگی خواہ اس کو مدرسہ کی ملک قرار دیا جائے یا اس کو مدرسہ کے حق میں وقف قرار دیا جائے اسکے ساتھ یہ ہوا کہ دونوں فریق کے کافی ذات شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدفن کے پاس رواز کئے گئے تو آپ نے تحریر فرمایا۔ میکے نزدیک یہ زمین خالص ملک مدرسہ اشرف العلوم کی ہے اور عمارت بھی اسی کی، ن صاحب خیر کو اس میں کوئی حق تصرف ہے ن تیم خانہ کوان میں سے کسی کو بھی اس میں حق مداخلت نہیں اور وقف نامہ دربارے تیم خانہ) باطل ہے ادا (ر ایضا م ۲۸۲)

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے مدرسہ کیلئے وقف ہونے کی صراحت سے تردید نہیں فرمائی، لیکن ملک مدرسہ قرار دینا وقف ہونے کی تردید ہے کیونکہ وقف کسی کی ملک نہیں ہوتا، اس لئے کہا جائیگا کہ صاحب خیر نے جو زمین مدرسہ کو خرید کر دی تھی پھر اس پر مدرسہ ہی کیلئے تعمیر کرائی تھی وہ سب مدرسہ کی طکیت بن گئی۔

اسکے بعد فریقین کے بیانات، ان تمام فتاویٰ کے ساتھ حضرت مولانا شفیع محمد صاحب کے صاحبزادے اور شیخ الہند کے تلمیذ رشید حضرت مولانا سید حمزہ صاحب لکھنؤی رحمۃ اللہ کی خدمت میں پہنچے تو حضرت مولانا تحریر فرمایا۔ چونکہ معلم اکا ایک لفظ بھی تقریر کرایا تحریر را ایسا مذکور نہیں جو تھیں

نقطوں مخصوصہ وقف میں سے ہو یا جس کی دلالت معنی و قبی پر ہوتی ہو اس لئے صورت مسولہ میں احقر کے نزدیک زمین و عمارت کا درسہ اشرف العلوم پر وقف ہونا ہمارے امکان تلاش میں سے کسی کے نامہب پر ثابت نہیں ہوتا ہے پس مولانا ناظر احمد صاحب و مولانا عبدالکریم صاحب کے فتوویں میں جو حکم وقف لگایا گیا ہے وہ صحیح نہیں ہے : (ایضاً م ۱۸۲)

پھر مفصل بحث کے بعد لکھا۔

یہ زمین درسہ ہی کی ملک میں آئے گی اور درسہ ہی اسکا مالک ہو گا زکر عبداللطیف (صاحب خیر) صاحب خیر نے جو اسیں تعمیر کی ہے وہ بھی درسہ ہی کیستے ہو گی زکر عبداللطیف کیلئے (پھر چند صفحات کے بعد) چونکہ حسب تصریح فقہاء صحت وقف کے لئے موقوف کا بوقت وقف مملوک واقف ہونا ضروری ہے اس لئے اس کا تسلیم خانہ کیستے وقف بالکل باللہ ہے اور اس عمارت کو درسہ اشرف العلوم کے قبضہ میں دینا واجب ہے (ایضاً م ۱۸۹)

ابران المکتوم فی اثبات التصدق علی اشرف المعلوم کے نام سے درسہ اشرف العلوم کا پور کی زمین و عمارت کے سلسلے میں کی گئی یہ فقہی بحث مطہرہ ایہ کے ضمنیہ کے طور پر تقریباً تیس صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔

اسکا خلاصہ یہ ہوا کہ درسہ اشرف العلوم کا پور کے لئے ایک صاحب خیر نے زمین خریدی، پھر اس پر اپنی ذاتی ملک ہے زکر چندہ سے عمارت تعمیر کرائی اور اکابر علماء نے اسکے باوجود یہ فتویٰ دیا کہ یہ جائیداد درسہ اشرف العلوم کی ملک ہے وقف نہیں ہے، وجہ یہی ہے کہ وقف شریعت کی ایک مخصوصی صفت ہے

اور وہ شریعت کی مقررہ شرائط کے بغیر متحقق نہیں ہوتا۔

سلاطین کی جانب سے بیجا یوں حاصلہ ایدادیں وقف نہیں ہیں، میں

در مختار میں تصریح ہے کہ سلاطین کی جانب سے علماء یا تعلیم گاہوں کیلئے جو جائز ایدادیں مقرر کردی جاتی ہیں وہ اوقاف نہیں ہیں بلکہ ان کا نام ارصاد یعنی مصارف تعلیم کے انتظام میں مقرر کردہ جائز ایداد ہے، در مختار میں ہے والارصاد من السلطان لیست سلطان کی جانب سے دی گئی چاگریں ای باوقاف البته (در مختار ۲۷۹) ارصاد کھلاتی ہیں وہ یقیناً وقف نہیں ہیں میں اس پر علامہ شامی قدس سرہ نے تحریر فرمایا۔

رصد کے معنی راستہ کے ہیں اور رصدۃ باب قتل (نفر) سے آتا ہے، کسی کا راستہ پر انتظار کرنا، قعد فلان بالمرصد کے معنی ہیں کہ راستہ میں بیٹھ کر کسی کا انتظار یا نگہبانی کرنا، اسی لغت سے ارصاد السلطان کی اصطلاح افозд ہے کہ سلطان بیت المال کی جائز ایدادیں سے کچھ کاشت کی زمین یا گاؤں فیرہ کو مسجدوں، مدرسوں یا بیت المال

الرصد الطریق در صدۃ من
باب قتل قعدۃ لہ علی
الطریق و قعد فلان بالمرصد
ای بطريق الارتقاب والانتظار
و منه سی ارصاد
السلطان بعض القری
والمزارع من بیت
المال علی المساجد
و المدارس و نحوها

کی امنی کا استحقاق رکھنے والے علماء
اممہ اور موزعین کو دیدیں تو یہ وہ امداد
ہے جو ضروریات زندگی کے راستے میں
ان حضرات کا انتظار کر رہی ہے،
سلطان کی جانب سے بیت المال سے
دی جانے والی یہ املاک حقیقتہ وقف
اس لئے نہیں ہیں کہ وہ سلطان کی
ملکیت میں نہیں تھیں بلکہ سلطان کا یہ
عمل بیت المال کی کسی چیز کو بعض
ستحقیقین کیلئے خاص کرنے کا عمل ہے
اور اس لئے بعد میں آنے والے کسی
حاکم کیلئے اس میں تغیر و تبدیل جائز
نہیں جیسا کہ یہ بحث مفصل گذر چکی ہے

لمن یستحق من بیت المال
حال قرار والائمه والمؤذنین
ونحوه و مکان مارصلہ
قائمه علی طریق حاجاتہو
براقبها و انسان سریکن
وقفا حقیقتہ لعدم ملک
السلطان له، بل هو
تعین شو من بیت
المال علی بعض مستحقیہ
فلا یجوز لمن بعدہ
ان یغیرہ و بدلہ
کافد منا ذلک محسوظا

(در المغار ۲۶)

اس عبارت میں فرمایا گیا ہے کہ سلطین کی جانب سے اگر مساجد یا مدارس
وغیرہ کو کچھ جائیداد بیت المال کی املاک میں سے دیدی جائے یا ان لوگوں
کو دیدی جائے جو بیت المال سے امداد کے مستحق تھے تو حقیقی طور پر اسکو
وقف قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ وقف کے لئے یہ ضروری ہے کہ وقف کرنے
والا اس جائیداد کا مالک ہو اور وہ اپنی شخصی ملکیت ختم کر کے اسکو وقف
کرے، یہاں سلطان چونکہ بیت المال کے اموال و املاک پر ملکیت نہیں

رکھتے اس لئے ان کا بیت المال کی جائیداد کو کسی کام کیلئے یا کسی فرد کیلئے دینا وقف قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ یہ کہا جائیگا کہ انہوں نے مستحقین کو ان کا حق پہنچا دیا۔ سلاطین کے اس عمل کے لئے فقہاء اخناف نے وقف کے علاوہ ایک اور تقلیل اصطلاح ارصاد استعمال کی کہ سلاطین کا یہ عمل ارصاد کے نام سے موسم کیا جاسکتا ہے، علامہ شاہی نے لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی مناسبت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ رصد کے معنی راستے کے ہیں اور رصد کے معنی راستے پر پیغمبر کی انتظار کرنے کے ہیں، اس لئے ارصاد کے معنی ہوئے وہ اموال جو زندگی کی راہ پر میں ضرورت مندوں کے منتظر ہوتے ہیں، گویا ضروریات زندگی کی تکمیل کے طور پر، مستحقین کو بیت المال سے کچھ املاک سلطان کی جانب سے دیدی جائیں تو وہ "ارصاد" ہیں وقف نہیں ہیں۔

علامہ شاہی فرماتے ہیں کہ یہ بحث ہم تفصیل سے کرچکے ہیں، یہ بحث جس کا انہوں نے حوالہ دیا ہے ٹڑے قیمتی افادات پر مشتمل ہے بیت المال کی جائیداد اور سلاطین دامراء کے اوقاف پر بحث کرنے کے بعد لکھا ہے۔

اس سے یہ بات صراحت سے معلوم ہوئی کہ سلاطین نے بیت المال کے اموال سے جو وقف کئے ہیں وہ ارصادات ہیں جو حقیقتہ اوقاف نہیں میں اور یہ کہ جوار ارصادات ان لوگوں کیلئے ہوں جو بیت المال کا مهرف تھے	فی هذ اتصریح بان ادقان السلاطین من بیت المال ارصادات لا اوقاف حقیقتہ واف ماسکان منها علی مصارف لا ينقض بخلاف ما وقف
---	---

ان کو ختم کرنا جائز نہیں، بخلاف ان
الماک کے جن کو سلطان نے اپنی
اولاد یا اپنے موالی کیلئے وقف کیا ہو
(کہ ان کا ختم کرنا جائز ہے) اور جبکہ
یہ اوصاد کی صورت ہے تو وقف کی
شرائط کا محفوظ رکھنا لازم نہ ہوگا،
کیونکہ وقف صحیح نہیں ہے، کیونکہ
وقف کے صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ
وہ واقف کی ملکیت ہو اور سلطان
ان الماک کو بیت المال سے خریدے
بغیر ان کا الماک نہیں ہے، یہ معلوم ہو چکا
ہے کہ علامہ اکمل الدین کی اس سلسلے
میں بھی لائے ہے، اور جو بسطوں سے
اور مولیٰ ابوالسعود سے نقل کیا گیا تھا
وہ بھی اسکی کو موافق ہے اور شارح
جو کتاب النہر سے وقف کے باب میں
نقل کریں گے وہ بھی بھی ہے کہ بیت المال
سے نامزد کردہ جاگیروں کو وقف قرار دینا
صحیح نہیں ہے الای کہ وہ زمین غیر باد

السلطان علیہ اولادہ
او عتقائیہ مشلاً و انه
حیث حیانت اوصادا
لا یلزم مراعات شروطها
لعدم کونهاد فقا صحیحا
فان شرط صحته ملک
الواقف والسلطان
بدون الشرا من
بیت المال لا یملک
و قد عملت موافقة
الا عمل علیه ذلک
و هو موافق لما مار عن
المبسوط وعن المولى
ابي السعود ولما سید ذکر
الشارح في الوقف
عن النہر من ان وقف
الاقطاعات لا یجوز
الا اذا حیانت اوصا
مواتا او ملکا للامام

اور بخبر ہی ہو یا امام کی اپنی ملکیت
ہو پھر اس نے کسی شخص کے نام اس
کو الٹ کر دیا ہو، البته یہ مضمون اسکے
خلاف ہے جو تخفیف ہر فضیلہ میں علامہ فاسد
کی جانب مسوب کیا گیا کہ سلطان کا
بیت المال کی زمین کو وقف کرنا صحیح
ہے۔ میں عرض کروں گا کہ شاید وقف
سے مراد حقیقت وقف نہیں بلکہ یہ
کہ عوامی مصلحت کیلئے ایسا کیا گیا ہے
تو اب یہ نامزدگی لازم ہو گئی ہے اور تغیر
جاائز نہیں ہے جیسا کہ طرطوسی نے
قاضی خاں سے نقل کیا ہے کہ سلطان
اگر عام مسلمانوں کی مصلحت کیلئے مال
کی زمین وقف کر دے تو جائز ہے، ابن
وصبان نے اس کی تشریح یہ کہے
کہ اگر سلطان نے ابدی طور پر اس کا
صرف شرعی معین کر دیا تو اس نے
ظالم امراء کو دوسرے غیر شرعی صرف
میں صرف کرنے سے روک دیا اس کا

فاقت عهار جلا و هذنا
خلاف ماف التحفة
المرضية عن العلامة
قاسم من ان وقف
السلطان لا رض بيت
المال صحيح . قلت :-
وعل المراد انه لا زمام
لا يغير اذ احسان على
مصلحة عامة كما
نقل الطرطوسى عن
قاضي خان من ان
السلطان لو وقف
ارضا من بيت مال
المسلمين على مصلحة
عامة للمسلمين جائز
قال ابن دهبان، لامه
اذ ابداه على مصرفه
الشرعى فقد من من
يعرفه من امراء السجور

مفہوم یہ ہوا کہ یہاں لفظ و قف کے اطلاق سے مراد وقف کے حقیقی معنی نہیں ہیں بلکہ یہاں وقف کے معنی سلطان کی جانب سے عوامی مصلحتوں کے لئے صرف شرعی کا ابدی طور پر تعین ہے اور بالکل یہی معنی اس لفظ انصار کے میں جو زیر بحث ہے اس لئے معنی مرادی کے اعتبار سے کوئی تعارض نہیں ہے۔

فی غیر معرفہ اهٗ فقد افاد ان المراد من هذَا الوقف تابید صرفہ علی هذة الجهة المعینہ التي عینها السلطان مما هو مصلحة عامة وهو معنی الارصاد السابق نلايناف ماتقدم

(روا المختار ۲۸۳)

علامہ شامی کی اس عبارت میں پہلے تو یہ بیان کیا گیا ہے کہ بیت المال کے جو اموال سلاطین کی جانب سے وقف کئے جاتے ہیں وہ اوقاف نہیں ہیں دلیل یہ ہے کہ وقف تو اسی وقت صحیح قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس پر واقف کی ملکیت وقف سے پہلے قائم ہو، پھر اس شخص نے اپنی ذاتی ملکیت کو ختم کر کے اس کو ملکیت خداوندی میں دیدیا ہو لیکن جہاں واقف خود بالکل ہی نہیں ہے تو وسرود کی ملکیت کو یہ کیسے وقف کر سکتا ہے، اس مضمون کو علامہ شامی نے چارا کا بر ملماء کی طرف مسوب کیا ہے۔

۱۔ علامہ اکمل الدین شارع ہدایہ کی یہی رائے ہے

۲۔ مطبوعہ میں امام سفرسی نے بیت المال کی زمینوں کے سلسلے میں یہی

فرا یا ہے۔

۲۔ مولیٰ ابوالسعود جو اوقاف سلطانیہ کے سلسلے میں بڑی گھری نظر رکھتے ہیں، ان کی بہی رائے ہے۔

۳۔ اور خود صاحب درختار آستہ نہر سے نقل کریں گے کہ سلطان کی جانب سے جائیدادوں کو صرف اسی صورت میں وقف کہا جاسکتا ہے جب وہ زمینیں غیر آباد اور اقتادہ ہوں یا امام نے اپنی ملکیت کو وقف کیا ہو، لیکن اگر وہ سلطان کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ بیت المال کی ملکیت تھی اور وہ بھی غیر آباد نہیں بلکہ آباد زمین تھی تو ایسی جائیداد کی نامزدگی وقف نہیں ارادا ہے جس کی تشریع گذر چکی ہے۔

اس مضمون کو چارخوالوں سے نقل کرنے کے بعد، علامہ شامی نے ان حضرات کے قول کی تاویل کی ہے جنہوں نے اس طرح کی جائیداد پر وقف کا اطلاق کیا ہے، انہوں نے بتایا کہ تحفہ مرضیہ میں علامہ قاسم خنفی کی جانب مسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے سلطان کی جانب سے بیت المال کی زمینوں پر اس طرح کے تصرف کو وقف صحیح قرار دیا ہے، مگر علامہ شامی کی تحقیق یہ ہے کہ ایسی زمینوں پر وقف کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ یہاں وقف کا اطلاق شخصی ملکیت ختم کر کے ملکیت خداوندی کو قائم کرنے کے معنی میں نہیں اس لئے کہ شخصی ملکیت تو قائم ہی نہیں تھی بلکہ یہاں اگر وقف کے الفاظ استعمال بھی ہوئے، میں تو یہ اطلاق مجازی ہے کہ سلطان نے بیت المال کے بعض اموال کا مصرف شرعی، ابدی طور پر معین کر دیا ہے، پھر انہوں نے یہ بتایا کہ وقف کے یہ معنی مجازی وہی ہیں جو ارادہ کے مراد ف ہیں۔

علامہ شامی رحمہ اللہ کی بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ بیت المال کی جائیدادوں میں سلطان کے اس طرح کے تصرفات کو وقفِ حقیقی قرار نہیں دیا جائیگا اور بن ملک نے بیت المال کی ابلاک میں سلاطین کے اس طرح کے تصرفات کو وقف کہا ہے انہوں نے وقف کے اصطلاحی اور حقیقی معنی مراد نہیں لئے بلکہ معنی مجازی مراد لئے ہیں۔

ہندوستان کے مدارس عربیہ

یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کے عربی مدارس جن کی بنیاد اسلامی حکومت کے ختم ہونے کے بعد عوامی چندہ پر رکھی گئی ہے بالکل خی نویت کے حامل ہیں یہ مدارس اپنے مقصد تاسیس اور مقاصد عظیمی کے لحاظ سے اسلام کے تحفظ کے قلمعے اور دعوت و تبلیغ کے مرکز ہیں، طریقہ کار کے لحاظ سے یہ دینی اور دینی تعلیم گاہیں اور اقتصادی نظم کے اقباد سے یہ محدود قسم کے بیت المال ہیں۔ یعنی یہاں مجلس اولوالا مرکزی اجازت سے محدود ذرائع امنی اور اسکے معین مصارف ہیں، اسلامی بیت المال کی طرح یہاں کے ذرائع امنی اور مصارف مام نہیں ہیں ششائی، خراج، عشرہ اور محصول وغیرہ کی آمدی یہاں نہیں ہے، مصارف میں عام غرباً و مساکین کی امداد اور نظارات نافعہ رپی، ڈبلوڈی کا تصور تک نہیں ہے، نیز امنی کی دسویابی کیسے جبرا کوئی حق نہیں ہے، بلکہ اس محدود بیت المال میں کچھ صدقات واجبه اور کچھ صدقات نافلہ کی امنی ہوتی ہے اور مسلم دین کے لئے اپنی زندگی کو وقف کرنے والے طلبہ و علماء خاص طریقہ کار

کے ساتھ اسکے مصادر ہیں، ان صدقات نافذ اور تبرمات ہی سے کبھی کوئی جائیداد بھی خرید لی جاتی ہے، یا کبھی کوئی جائیداد ہی چندہ میں حاصل ہو جاتی ہے پا ان کے نام وقف بھی کردی جاتی ہے، اس لئے ان تمام مدارس پر وقف ہونے یا نہ ہونے کا یکساں حکم نہیں رکھا جاسکتا بلکہ اس سلسلے میں صحیح نتیجہ کی پہنچ کے لئے مدارس عربیہ اور وقف کے سلسلے میں کی گئی گفتگو کے مندرجہ ذیل نقاط پر غور کرنے کے بعد تجزیہ کر کے حکم بیان کرنا ہوگا۔

الف ۔۔ جائیداد موقوفہ کا وقف کے وقت واقف کی ملکیت میں ہونا ضروری ہے

ب ۔۔ وقف کی حقیقت کے تحقق کیلئے فقہار کرام کے معین کردہ الفاظ یا معنی و قوی پر دلالت کرنے والی تعبیر کا ہونا ضروری ہے۔

ج ۔۔ اگر اسی تعبیر اختیار کر لی گئی جو وقف کے علاوہ تملیک، هبہ، یا نذر وغیرہ پر دلالت کرتی ہو تو وقف کے بجائے ہبہ، نذر یا تملیک کی حقیقت متحقق ہو جائے گی۔

ان نقاط کی بنیاد پر اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مدارس عربیہ اور ان کی تمام جائیدادوں کا ایک حکم نہیں ہے، اگر کسی فقیہ یا عالم نے ان پر ملکی اطلاق وقف کا اطلاق کیا ہے تو علامہ شامی کی توجیہ کے مطابق یہی کہا جائے گا کہ اطلاق مطلقاً حد حقیقی معنی میں نہیں ہے بلکہ مجازی ہے، اور مندرجہ بالا نقاط اور اپنی نو میتوں کے اختلاف کے سبب خود مدارس عربیہ کی اور ان کی املاک متعدد صورتیں ہوتی ہیں اور ان کے احکام الگ الگ ہیں، مثلاً

۱۔ اگر یہ صورت ہے کہ کسی شخص نے اپنی مملوک جائیداد تمام شرائط وقف کو

پورا کرتے ہوئے مدرسہ کے طور پر وقف کی ہے یعنی مدرسہ پہلے سے نہیں تھا بلکہ مدرسہ کا آغاز ہی اس طرح ہوا ہے تو وہ مدرسہ اصطلاحی اور حقیقی وقف ہے۔

۱۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ کرایہ کیا ہارت کی جائیداد میں پہل رہا ہے اور اس کی اپنی کوئی جائیداد نہیں ہے، جو چندہ آتا ہے وہ طلبہ اور علماء کی ضرورت آتی میں خرچ ہوتا رہتا ہے تو ایسا مدرسہ کسی بھی طرح کا وقف نہیں ہے کیونکہ وقف جائیداد ہوتی ہے اور یہاں کوئی جائیداد نہیں ہے۔

۲۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ پہلے سے موجود تھا اور اس مدرسہ کے لئے کسی شخص نے اپنی ملکہ کر جائیداد تمام شرائط وقف کو پورا کرتے ہوئے وقف کی ہے تو یہ جائیداد وقف ہے، اور مدرسہ کی حیثیت اس جائیداد کے لئے موقوف علیہ کی ہے، خود مدرسہ کے وقف ہونے یا نہ ہونے کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

۳۔ اگر یہ صورت ہے کہ مدرسہ پہلے سے موجود تھا اور اس مدرسہ کے لئے کسی شخص نے اپنی ملکہ کر جائیداد اس طرح دی کہ اس میں شرائط وقف تتحقق نہیں، میں تو یہ جائیداد مدرسہ کی لذک ہو جائے گی مگر شرائط وقف متحققاً نہ ہونے کے سبب وقف نہیں کہا جائیگا۔

۴۔ اگر یہ صورت ہے کہ جائیداد کسی ایک شخص نے نہیں دی بلکہ مدرسہ کے لئے جو چندہ کیا جاتا ہے اس سے مدرسہ کیلئے جائیداد خریدی گئی ہے تو اس جائیداد کی نوعیت کے تعین کے لئے چندہ کی نوعیت اور اس کے طریقہ استعمال کی نوعیت کے مطابق حکم لگایا جائیگا۔

اگر چندہ عموی تھا جو مدرسہ میں داخل کر دیا جاتا ہے اور وہ چندہ خود مدرسہ کی ملک بن جاتا ہے، پھر اب انتظام غیر دستوری مدارس میں اس چندہ کو اپنی صوابید کے مطابق اور دستوری مدارس میں، دستور اساسی کے مطابق خرچ کرتے ہیں، تو یہ جائیداد ان بنيادوں کی وجہ سے وقف نہیں ہو سکتی۔

اولاً۔ اس لئے کہ چندہ خود وقف نہیں تھا، چندہ کے وقف ہونے کے سلسلے میں اکابر دیوبند کااتفاقی رائے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وقف نہیں ہے قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہ اللہ سے معلوم کیا گیا کہ مدرسہ میں جو چندہ وغیرہ کاروپیہ آتا ہے وہ وقف ہے یہاں ملک، اگر وقف ہے تو بقولہ عین واجب ہے اور صرف بالاستلاک ناجائز، اگر ملک ہے اور مستحبہ وکیل تو مصلحی چندہ اگر مر جائے تو غیر مار و درثا کا حق ہے تو حضرت اقدسؐ نے جواب تحریر فرمایا۔

مدرسہ کا ہستم قسم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا کہ امیر زائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جوشی کسی نے ہستم کو دی ہستم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے اسکے قبض سے ملک معطلی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ جھوٹی الکیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطلی کے ملک ورثہ معطلی کی اس میں نہیں ہو سکتی اور ہستم بعین وجوہ میں وکیل معطلی کا ہو سکتا ہے، بہر حال نیہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطلی کی رہے گی اور نہ خود ملک مصلحی کی رہے گی ۔ (ذکرۃ الرشید ص ۱۲۲)

بالکل یہی جواب حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ اس طرح کے سوال کے

جواب میں دیا۔

”عاجز کے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف ہنسیں مگر اہل مدرسہ عمال بیت المال معطین و آخذین کی طرف سے وکلا رہیں، لہذا ان اس میں زکوہ واجب ہو گی اور زہ معطین واپس لے سکتے ہیں۔“

(فتاویٰ نظاہر علوم جلد اول ۳۱۹)

حضرت حکیم الامت قدس سرہ سے بھی اس طرح کا سوال کیا گیا کہ چندہ کے احکام وقف کے ہوں گے یا اور تجویز میں تحریر فرمایا۔

”یہ وقف ہنسیں۔“ (اماوا الفتاویٰ ۵ جلد دوم)

گویا چندہ کے سلسلے میں اکابر دیوبند کا اتفاق ہے کہ یہ وقف ہنسیں ہے، اس لئے جب چندہ خود وقف ہنسیں ہے تو اس کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد کے حقیقی وقف قرار دیئے جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

ثانیاً۔ اس لئے کہ یہ چندہ وقف نہ ہونے کے ساتھ مدرسہ کی ملک بن گیا تھا، اس لئے جو حکم مدرسہ کے حق میں چندہ کا تھا وہی حکم چندہ کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد کا رہے گا، کیونکہ اس حکم کو بدلتے کی کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

ثالثاً۔ اس لئے کہ چندہ دینے والے جو رقم کے اصل مالک تھے مدرسہ میں رقم دینے کے بعد اس سے بے تعلق ہو گئے، شرعاً اس لئے کہ وہ مدرسہ کو مہبہ یا صدقہ کرنے کے بعد رقم کے مالک نہیں رہے اور عملًا بھی ان سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہے ان کی تعداد بھی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ان کو ایک نقطہ نظر پر لانے کے لئے کوئی اقدام نہیں کیا جاتا، اس لئے چندہ کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد

پر وقف کا حکم لگانا درست نہیں۔

رابعًا۔ اس لئے کہ جن ارباب انتظام نے جائیداد خریدی ہے، انہوں نے بھی وقف کی تصریح نہیں کی، اور اگر وہ تصریح بھی کر دیں تو چونکہ وہ خود قسم کے مالک نہیں ہیں اس لئے وقف کے لفظ کے استعمال سے حقیقت وقف متحقق نہیں ہو سکتی۔

۵۔ اور اگر یہ صورت ہے کہ جائیداد عام چندے سے نہیں خریدی گئی بلکہ خرید آراضی کے لئے خصوصی چندہ کیا گیا ہے یا کسی ایک ہی فرد نے خریداری کے لئے رقم عطا کی ہے تو اس میں یہ تفصیل ضروری ہو گی کہ اگر معطلی نے صراحت کی ہے کہ جائیداد خرید کر اس کی طرف سے وقف کر دی جائے اور ہم تم کو معطلی نے صرف وکیل بالشراء بنیا یا ہے اور ہم تم نے ایسا ہی کیا اور تمام شرائط وقف کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ عمل کیا تو یہ جائیداد وقف ہو جائے گی، مدرسہ کی جیشیت اس جائیداد کے حق میں موقوف علیہ کی رہے گی، نیز یہ کہ چونکہ یہ رقم مدرسہ کی نہیں ہوئی تھی اس لئے اگر ایسی صورت میں خرید جائیداد سے پہلے معطلی کا انتقال ہو جائے تو یہ رقم دار شین کو واپس کرنا ہو گی

۶۔ اور اگر یہ صورت ہے کہ خرید آراضی کے لئے حاصل کیا گیا یہ چندہ اس طرح آیا ہے کہ ہم تم وکیل بالشراء نہیں ہے بلکہ چندہ مدرسہ میں داخل کر دیا گیا ہے اور مدرسہ اس کا مالک ہو گیا ہے تو اس کے ذریعہ خرید کر دہ جائیداد کے وقف ہونے اور نہ ہونے کے سلسلے میں دونوں نقطہ نظر ہیں۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ جائیداد وقف ہے اور عملاً چونکہ یہ ہوتا ہے

کر چندہ مدرسہ کی ملک بن جاتا ہے اور زمین وغیرہ کی بیع بھی مدرسہ ہی کے نام ہوتی ہے اس لئے اس نقطہ نظر کے مطابق یہ توجیہ ضروری ہے کہ یہ کارروائی بظاہر اس طرح ہوئی ہے لیکن شرعاً اس کا اعتبار نہیں ہے بلکہ جو رقم مدرسہ میں آئی ہے وہ اگرچہ قانوناً مدرسہ کی ہو گئی ہے مگر معنوی طور پر وہ ابھی تک معطلی ہی کی ملک ہے، یعنی جو بینامہ مدرسے کے نام ہوائے وہ صرف کافذات میں مدرسے کے نام ہے حقیقت یہ ہے کہ اس رقم کے ذریعہ خرید کردہ جائیداد معنوی طور پر معطلی کی ملکیت میں آئی پھر معطلی کی جانب سے وہ مدرسہ کیلئے وقف کی گئی، مگر اس نقطہ نظر پر متعدد فقہی اشکالات ہیں۔

(الف) پہلا اشکال یہ ہے کہ وقف کے تحقق کیلئے کلمات وقف یا ان کے ہم معنی تعبیر کا ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں ایسا نہیں ہوا۔

(ب) دوسرا اشکال یہ ہے کہ وقف کے تحقق کے لئے ضروری ہے کہ منافی وقف معنی پر دلالت نہ پائی جائے یعنی تمیلک، ہبہ، نذر وغیرہ پر دلالت کرنے والے کلمات نہ پائے جائیں جبکہ یہاں یہ چیزیں پائی گئی ہیں۔

(ج) تیسرا اشکال یہ ہے کہ وقف کے وقت، واقف کی ملکیت کا تام ہونا ضروری ہے جب کہ یہاں رقم دینے والا، مدرسہ میں رقم داخل کرنے کے بعد بالکل بے تعلق ہو گیا اور زمین کی بیع بھی مدرسے کے نام ہوئی ہے۔

اس نقطہ نظر کے وکاران اشکالات کا ہی جواب دیتے ہیں کہ یہ سب ظاہری عمل ہے حقیقتہ زمین رقم دینے والے کی ملکیت میں آئی ہے، پھر اس کی جانب سے اس جائیداد کو مدرسے کے حق میں وقف کیا گیا ہے۔

اس نقطہ نظر کے وکلام کے پاس تین دلائل ہیں، ان کی پہلی دلیل یہ ہے کہ فقر کی تمام کتابوں میں یہ مسئلہ موجود ہے۔

اگر کسی نے سلطان کیلئے پانی پلانے کی جگہ بنائی، یا سرائے بنائی جس میں مسافرین رہیں یا مجاہدین کیلئے قیام گاہ بنائی یا اس نے اپنی زمین کو قبرستان بنادیا تو اسکی ملکیت ان چیزوں سے اس وقت تک ختم نہ ہو گی جب تک کہ حاکم اس کا حکم نہ دیدے یہ امام اعظم کے نزدیک ہے اور امام ابو یوسف کے یہاں مالک کی ملکیت محض قول سے ختم ہو جاتی ہے اور امام محمد کے نزدیک جب لوگ سقایہ سے پانی پینے لگیں، سراۓ اور مرکز مجاہدین میں مسافر قیام کرنے لگیں اور قبرستان میں تھین کامل شروع ہو جائے تو ملکیت ختم ہو جائے گی

اس مسئلہ میں امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک، اس نقطہ نظر کا مستدل ہے،

اس عبارت کی بنیاد پر ان لوگوں کا خیال ہے کہ امام محمد کے یہاں ان چیزوں کا معوض بناؤ کر دیدیں ہی وقعت ہے، کسی کفر و قف کی غرورت نہیں ہے مگر امام محمد

من بنی سقاية للصلهين
او خانا نيسكنه بنوالسبيل
او سباطا او جعل ارضه مقبرة
لعزيز ملكه عن ذ لك
حتى يحکم به الحاكم
عند ابي حنيفة و عند
ابي يوسف يزدعي ملكه
بالقول و عند محمد
اذا استنقى الناس
من السقاية و سكنوا
الخان والرباط و دفنوا
في المقبرة زال الملاع
(فقادی فالگیری تغیرہ ۱۰۳)

کے مسلک کی بنیاد پر یہ خیال قائم کرنا درست نہیں ہے کیونکہ فتح القدر کے حوالہ سے یہ بات ۳۲۱ پر گذر چکی ہے کہ ان چیزوں کا بنا دینا وقف نہیں ہے، وقف تو واقف کے وقف کرنے سے ہی متحقق ہو گا، اس عبارت میں واقف کے ازالہ ملک کی شرط کا بیان کیا گیا ہے کہ وقف کرنے کے بعد قبضہ دینا ازاں الملک کی شرط ہے۔ مزید توضیح کے لئے صدر الشریعہ کی مختصر الوقایہ اور اس کی شرع جامع الرموز کی عبارت پیش ہے

شئی کی میں، اور مملوک چیز کی ذات کو	حبس العین و منع الرقبة
قول کے ذریعہ واقف کی ملک میں رکتے	المسدوكۃ بالقول عن تصرف
ہوئے غیر کے تصرف سے محفوظ کر دینا	الغير حال کونہا مقتصرة على ملك
وقف کھلاتا ہے۔	الواقف۔ (بجوالہجاح الرموز ۲۲۵)

جامع الرموز میں قہستانی نے اس کی شرح میں لکھا ہے

لوقف کی تعریف میں) قول کی قید اس	و انساقید بالقول بانہ لکتہ
لئے لگائی ہے کہ اگر شرائط کے ساتھ	صورة الوقفية، مم الشرائط
وقف کی دستا دیز لکھ دی گرت لفظ	بلا لفظ بغير وقف
نہ کیا، تو بالاتفاق وقف متحقق نہ ہو گا	بالاتفاق عَنْاف
جو اہر میں اسکی طرح ہے۔	الجواهر (جامع الرموز، ۲۲۵)

ان دونوں عبارتوں سے بالکل واضح ہے کہ وقف میں تلفظ اور قول بالکل ضروری ہے، اور قہستانی نے لفظ کے بغیر وقف نہ ہونے پر ائمہ اخناف کا اتفاق نقل کر دیا ہے۔

ان مذکورہ بالا چیزوں کے بارے میں بعض عمل سے وقف ہونے کی بات یوں بھی واضح ہے کہ یہ تمام چیزیں موقوفہ بھی ہوتی ہیں اور مملوک بھی، ان دونوں کے درمیان امتیاز کے لئے الک کی تصریح ضروری ہے، مثلاً قبرستان مملوک زمین میں بھی ہوتا ہے اور وقف میں بھی اس لئے تصریح کے بغیر بعض مدفین کی اجازت کو وقف قرار دینا کسی بھی حال میں درست قرار نہیں دیا جاسکتا، البتہ جو چیزیں مملوک نہیں ہو سکتیں صرف وقف ہی ہوتی ہیں جن کی مثال مسجد ہے، ان کے بارے میں چونکہ وقف اور ملک کے درمیان فرق کی ضرورت نہیں اس لئے بعض فقیہوں کے نزدیک الک کی تصریح کے بغیر بھی وباں وقف کا تحقق ممکن ہے جبکہ بعض فقیہوں اس صورت میں بھی واقف کی جانب سے تصریح کی ضرورت بیان کرتے ہیں جیسا کہ الاشباه والنظائر کے حوالے سے ۔ ۔ ۔ پر یہ بات گذر چکی ہے اس نقطہ نظر کے وکلاء کی دوسری دلیل یہ ہے کہ بعد نی تمام کتابوں میں تصریح ملتی ہے۔

الوقف یثبت بالضرورۃ راجعہ الرائق (۱۹۱) وقف ضرورت سے بابت ہو جاتا ہے ان حضرات کے نزدیک اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ وقف کے ثبوت کیلئے مندرجہ بالا شرائط کا واقعی وجود ضروری نہیں ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر ان شرائط کے بغیر بھی وقف ثابت ہو جاتا ہے، لیکن ان الفاظ کا یہ عام مطلب نہیں ہے، ان کا نام مفہوم ہے، البحر الرائق میں وقف کے جو چیزیں کلمے شمار کئے گئے ہیں، ان میں بیسوال کلمہ ہے۔

العشرون۔ اشتراطہ امن غلة بیسوال کلمہ یہ ہے کہ مسیکہ اس

داری هذہ عل شہر مکان کی آمدی سے ہر ہسینے دس درهم
کی روٹی خریدی جائے اور اسکو ساکین پر تقسیم کر دیا جائے تو یہ مکان وقف
الدار و قفا (ابوالافق ۱۹۱)

اس بیسویں کلمہ کی وضاحت میں ابن عابدین رحمہ اللہ حاشیہ مختصر الخاقان
میں لکھتے ہیں۔

قال فِي الْفَقْهِ . فَرَعَ ،
يُثْبَتُ الْوَقْفُ بِالضَّرُورَةِ
وَصُورَتِهِ أَنْ يُوصَى بِغَلَةٍ
هذِهِ الدَّارُ لِلسَاكِنِينَ
أَبْدًا وَلِفَلَانَ وَبَعْدَهُ
لِلْمَاهِينَ أَبْدَافَاتٍ
هذِهِ الدَّارُ تَصِيرُ وَقْفًا
بِالضَّرُورَةِ (مختصر الخاقان ۱۹۱، فتح العدیر ۱۹۱)

مفہوم ہے کہ یُثْبَتُ الْوَقْفُ بِالضَّرُورَةِ کا مطلب مام نہیں ہے کہ ضرورت کے موقع پر شرائط کے بغیر بھی وقف کو ثابت ان لیا جائے بلکہ اس کی خاص صورت ہے کہ اگر متكلم نے ایسے الفاظ استعمال کئے جن کو صحیح قرار دینا وقف ثابت کئے بغیر ممکن نہیں تو صحیح کلام کی ضرورت سے وقف ثابت ان لیا جائے گا، چنانہ کوئی بعد پھر وضاحت فرماتے ہیں۔

فقہار نے اس مسئلہ میں یہ تصریح کی ہے
کہ بیسوں کلر کے الفاظ، معنی و قف کو
ستلزم، اس اور یہ ایسا ہی ہے جسے
یہ کہے کہ میں نے اپنا یہ گھر اپنے منے
کے بعد مسائیں پر وقف کیا۔ اور اس
مسئلہ میں مجھے اصحاب کے دریان
اختلاف کا علم نہیں ہے

ونصوافیہ ان هذہ اللفظ
یودی الی معنی الوقف
وصارہ کا الوقاہ و قفت
داری هذہ بعد موئی
علی المسائین ولا اعلمر
فیها خلافاً فابین الاصحاب
(منظر الناقق ج ۱۹ ص ۲)

اس کا مطلب واضح ہے کہ بیسوں کلر کی وضاحت میں فقہار نے تصریح
کی ہے کہ معنی و قف کو مستلزم ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا کہنے والا یہ
کبیر ہا ہے کہ میں نے اس مکان کو منے کے بعد مسائیں پر وقف کر دیا، اسی
بیسوں کلر کی وضاحت میں الوقف یثبت بالضرورت کے الفاظ استعمال کئے
گئے ہیں، جن کا خاص مفہوم یہ ہے کہ اگر واقف نے ایسے کلمات استعمال کئے ہیں
جن کی تصحیح معنی و قفی کے بغیر ممکن ہیں تو وہاں تصحیح کلام کی ضرورت میں وقف
ثابت ان یا جاتا ہے، فتاویٰ شامی میں بھی یہ بحث درکنہ الالفاظ الخاصة
کے تحت دی گئی ہے اور جتنی مثالیں ذکر کی گئی ہیں ان سب میں تصحیح کلام کی
بجوری میں وقف کو ثابت اٹا گیا ہے۔ فتاویٰ شامی ج ۲۹ ص ۲

اس نقطہ نظر کے وکار کی تیسری دلیل عرف ہے، یعنی عرف کی بنیاد پر شرائط
کے بغیر باصرحت کے بغیر وقف تسلیم کریا جائیں لیکن وقف کی بحثوں میں عرف کی بنیاد پر یہ ضمنوں
نقہ کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے، عرف کا ذکر وقف کے دوران فقہار نے تین شمار

پر کیا ہے۔

پہلی جگہ یہ ہے کہ منقول اشیاء کے وقف کے مسئلے میں عرف معتبر ہے، یعنی جن اشیاء کے مسئلے میں عرف وقف کرنے کا نکا وقف کرنا درست ہے اور جن اشیاء میں عرف نہیں ہے ان کا وقف کرنا درست نہیں ہے۔

(فتاویٰ شامی ۱۷)

دوسری جگہ الفاظ وقف کے بارے میں ہے کہ جو الفاظ عرف میں وقف کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں وہ وقف کے بارے میں معتبر ہوں گے۔ یہ بحث فتاویٰ شامی میں نہایت اختصار کے ساتھ "موقوفہ" کے لفظ کے ذریعہ وقف کرنے کے ذیل میں آئی ہے۔

تیسرا جگہ یہ ہے کہ مسجد کے بارے میں عرف کی بخیاد پر تصریح کے بغیر وقف ممکن ہے، لیکن دوسرے امور میں عرف متحقق ہی نہیں ہے، فتح القدير میں اپنے مسئلہ پر بحث کے دوران لکھتے ہیں۔

و نحن نقول ان العرف جار	ہم کہتے ہیں کہ عرف چونکہ یہ رائج ہے کہ
ب ان الاذن في الصلة على وجه	نماز کی عمومی اجازت اور عمل اجازاد
العموم والتخلية يفيد الوقف	کو اس کام کے لئے خالی کر دینا اس
على هذه الجهة فكان كالتعبيه	جهت پر (یعنی مسجد کے طور پر) وقف
في كان ممن قدم طعاماً إلى	کہلاتا ہے اس لئے یہ کلمہ وقف کے
ضيقاً نشر نشار ا كان اذنا	تلفظ کی طرح ہو جائیگا جیسے کوئی شخص
فـ حـدـ وـ الـقـاطـ	ہمان کے سامنے کھانا رکھ دے یا رقم

کی بکھیر کرے تو یہ کھانا کھانے اور بکھیر
کو چکنے کی اجازت شمار ہوتا ہے وقف
علی الفقرا کا یہ حکم نہیں ہے کیونکہ
یہاں خالی کرنے اور اجازت دینے
کی بنیاد پر استفادہ کی راہ قائم کرنے
کی عادت یعنی عرف، رائج نہیں ہے۔

بغلاف الوقف علی
الفقراء لعدت جو عادة فيه
ب مجرد التخلية والا ذن
بالاستغلال۔
(فتح القدير م ۲۰)

اس عبارت سے یہ واضح ہے کہ مساجد کے بارے میں تعرف کو قائم کرنا
تصریخ کے ان یا گیا ہے، لیکن دیگر امور خیر بر وقف کے سلسلے میں ایسا نہیں
ہے، نیز یہ بات بھی ملاحظہ رہے کہ مساجد کے بارے میں فقیہانے یہ تصریخ بھی کی ہے
کہ اس اجازت اور تخلیک کے ساتھ کوئی امر منافی وقف نہ پایا جائے کیونکہ اجازت
کے باوجود اگر کوئی بات منافی وقف پائی جائے گی تو وقف کی حقیقت متحققة
ہوگی، مثلاً۔

صدر شہید نے واقعات میں لکھا ہے
کہ ایک شخص کی زمین جس میں تعمیر
نہ ہو اگر اس شخص نے اس زمین پر
لوگوں کو جماعت سے ناز پڑھنے کی
عام اجازت دیدی تو اس کی تین موسمیں
یہیں ایک صورت یہ ہے کہ وہ ابدی طور
پر نماز پڑھنے کی صراحت کر دے مثلاً

ذکر الصدر الشهید في
الواقعات رجل الله ساحة
الابباء فيها امر قوماً ان
يصلوا فيها بجماعة فهذا
على ثلاثة اوجه
احدها امان امر هر
بالصلوة فيها ابدا نصا

یہ کہدے رہاً حضرات پہاں، میشہ
کے نے نماز پڑھا کریں، یاد و سری
صورت یہ ہے کہ نماز کا حکم تو متعلق ہو
یکن نیت ابد کی ہو تو ان دونوں
صورتوں میں یہ جگہ مسجد بن بائیگی
اور دراثت میں شامل نہ ہوگی، تیسری
صورت یہ ہے کہ وہ اجازت کو موقت
کر دے کر ایک دن یا ایک ماہ یا ایک
سال کیلئے نماز پڑھا کریں تو اس صورت
میں زمین مسجد نہ ہوگی، اگر کہنے والے
کہ انتقال ہو جائے تو یہ جگہ اسکی دراثت
میں شامل کی جائے گی۔

تیسری صورت میں ظاہر ہے کہ صرف توقیت کی قید، منافی و قف پائی
گئی اور اسی لئے نقبا، نے اس صورت میں وقف تسليم نہیں کیا، اسی طرح اگر
منافی و قف کوئی اور بات پائی جائے گی جیسے تملیک یا نذر وغیرہ کے صیغہ
تو ان صورتوں میں بھی حقیقت وقف متحقق نہ ہوگی جیسا کہ یہ مضمون ثابت
کیا جا چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس خصوصی چندہ میں مہتمم کی حیثیت صرف دکیل بالشراء
کی نہ ہو بلکہ وہ چند و درسہ میں داخل کر دیا جائے اس چندہ کے ذریعہ خرید کر دہ

بان قال صلوانیها ابدا
اوامر هو بالصلة مطلقا
ونوى الابد ففى هذين
الوجهين صارت الساحة
مسجد الا يورث عنه
وامان وقت الامر باليوم
اد الشهـ او السنة ففى هذا
الوجه لا يصبر الساحة
مسجد الومات يورث
عنه۔

(فتاویٰ عالمگیری (ج ۱۷))

جائیداد کے وقف ہونے کا نقطہ نظر ہر اس بارے سے کمزور ہے، لیکن چونکہ یہ بھی ایک نقطہ نظر تھا اس لئے اس کی وضاحت بھی کردی گئی اور ان کے جن دلائی کا علم ہوا ان کا بھی جائزہ لے لیا گیا (واعلم عند اللہ)

اس طرح کا خصوصی چندہ کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ خرید کرده جائیداد مدرسہ کی ملک ہے وقف نہیں ہے، اس نقطہ نظر کے مطابق تو جیسے ہے کہ معطلی نے رقم مدرسہ میں داخل کر دی تو اب مدرسہ اس رقم کا مالک ہو گیا اور معطلی کا اس سے کوئی خلقت باقی نہیں رہا، بلکہ اگر معطلی نے رقم دیتے دلت کوئی شرط بھی لگائی تھی تو فقہاء کی تصریح کے مطابق ملک کے قبضہ کرنے کے بعد ہبہ تام اور شرط فاسد ہے، زیادہ سے زیادہ اس کو ایک وعدہ قرار دیا جاسکتا ہے جس کی پابندی ایفاء وعدہ کے طور پر کی جائے گی، شرط کے طور پر نہیں کی جائے گی۔

اس طرح کا خصوصی چندہ چونکہ ہندوستان کے مدارس عربیہ سے پہلے نہیں تھا اس لئے یہ جزئیہ عربی کتابوں میں ملنا و شوار ہے، البتہ ہندوستان کے فقہاء و علماء نے اس سلسلے میں جو تحقیق ظاہر فرمائی ہے وہ مدرسه اشرف العلوم کانپور کے نزاع کے سلسلے میں موجود ہے، خانقاہ امدادیہ تھا انہوں کے حقیقت حضرت مولانا عبدالکریم صاحب نے معطلی کی رقم کے بارے میں لکھا

”چونکہ اس رقم پر پر قبضہ کے بعد ہبہ تام ہرگز تھا اور روپیہ مدرسہ کی ملک ہو گیا تھا (نظیرہ مافی العالمگیریہ کتاب الوتف الفصل الثاني)“
اععلیٰ درہ مافی عمارۃ المسجد او نفقة المسجد او مصالح المسجد ص ۱۷

ان کا ان لامکن تصحیحہ و تفایل ممکن تصحیحہ تمیل کا بالہبہ للمسجد اور
الملائک للمسجد اور اس بنا پر زمین مدرسہ کی طرف سے مدرسہ کے روپیہ
سے خریدی گئی اور شیخ عبداللطیف اعلیٰ چندہ خصوصی) کی ملک میں زمین بالکل
داخل نہیں ہوتی اخذ (ضمیر عطر ہمارہ ۲۷)

علوم ہوا کہ حضرت مولانا عبد الکریم صاحب رحمہ اللہ نے خصوصی چندہ کو مدرسہ
کے حق میں ہبہ قرار دیا اور اس کے ذریعہ خرید کر دہ زمین کو بھی معطی کی ملک میں
داخل کئے بغیر، براہ راست مدرسہ کی ملک قرار دیا۔

شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدفنی قدس سرہ نے اسی زراع کے
موقع پر اپنے فتویٰ میں تحریر فرمایا۔

یہ بعینہ ایسی صورت ہے کہ ایک ادارہ قومیہ دینیہ کا ناظم ایک
مالدار کے پاس جاتا ہے کہ میکے مدرسہ کو فلاں زمین یا عمارت
کی ضرورت ہے وہ اس کو روپیہ درج کرتا ہے کہ اس زمین یا عمارت
کو خرید لو، شرعاً یا عرفیاً معاملہ اس معنی میں سمجھا جائیگا کہ مالدار
نے یہ نقود اس ادارہ کو ہبہ کر دئے ہیں اور یہ روپے اس کی
ملک سے نکل کر اس ادارہ کے ہو گئے ہیں (ایضاً ۲۸)

حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے اس عبارت میں ناظم مدرسہ یا اسہم
کو معطی کا دیکھیں بالآخر قرار نہیں دیا بلکہ انہوں نے صراحة فرمائی کہ یہ رقم
مدرسہ کیلئے ہبہ ہو گئی اور معطی کی ملکیت سے نکل کر یہ رقم مدرسہ کی ملک
میں داخل ہو گئی ہے۔

حضرت مولانا مفتی سید احمد صاحب لکھنؤی رحمہ اللہ نے اس رقم کے بارے میں
تحمیر فرمایا۔

و مال متصدق (بالفتح) کے متصدق علیہ یا اس کے وکیل یا نائب
یا سفیر کے قبضے میں آجائے سے دہبہ تام و لازم ہو جاتا ہے اور
متصدق (بالفتح) ملک متصدق (بالکسر) سے نکل کر ملک متصدق
علیہ میں آ جاتا ہے اور متصدق کو اس کے واپس لینے کا اختیار
باتی نہیں رہتا۔ اس لئے زرِ ثمن ملک معطی سے نکل کر ملک
درسہ میں آگیا۔ (ایضاً ۲۸۳)

حضرت مولانا مفتی سید احمد صاحب رحمہ اللہ نے بھی خصوصی چندہ کو معطی کی
ملک قرار نہیں دیا بلکہ مضموم یا اس کے نائب کے قبضہ کر لینے کے بعد یہ رقم درسہ
کی ملک میں آگئی۔ گویا مندرجہ اکابر علماء اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ زمین
کی خریداری کیلئے جو خصوصی چندہ ارباب خیر سے یا جاتا ہے وہ حقیقت کے
اعتبار سے معطی کی ملک سے خارج ہو کر درسہ کی ملک بن جاتا ہے اور اب
اس رقم سے جو جائیداد بھی خریدی جاتی ہے وہ درسہ کی ملک ہوتی ہے اس
دوسرا نقطہ نظر پر ازروئے فقہ کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔

درسہ کی املاک کا حکم

آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ درسہ یا مسجد کی جو جائیدادیں
وقف نہیں ہیں بلکہ شرائط وقف پائے نہ جانے کے سبب انھیں درسہ یا مسجد کی

ملکیت قرار دیا گیا ہے، ان پر کسی انسان کا مالکانہ تصرف قائم کرنا جائز نہیں ہے بلکہ مدرسہ اور مسجد کی ان املاک کا تحفظ بھی وقف ہی کی طرح ضروری ہے، تیم کی جائیداد اور بیت المال کی زمینوں کے بارے میں صراحت موجود ہے۔

شوان ارض اليتيم في حکو
پھر ہر کی تیم کی زمین، وقف کی زمین کے
حکم ہے جیسا کہ جو ہرہ میں ذکور ہے
ابوالترن کے مصنف نے یہی فتویٰ دیا ہے
اور لیسے، کی بیت المال کی زمین کا بھی
یہی حکم ہے، فتاویٰ خیریہ میں یہی ہے
اور انہوں نے کتاب الدعویٰ میں فرمایا ہے
کہ بیت المال کی آراضی پر، ابدی اوقاف
کے احکام جاری ہیں۔
الوقوف الموبدة (فتاویٰ شاہی ۲۲)

علوم ہوا کہ شرائط پائے نہ جانے کے سبب وقف قرار نہ دینا، ایک
اسطلاحی بات ہے، جہاں تک ان املاک کے تحفظ یا ان کے استعمال میں دیانت
و امانت کو محفوظ رکھنے کا معاملہ ہے تو اس سلسلے میں مدارس عربیہ یا مساجد کی
جائیدادیں وقف ہی کی طرح ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ اوقاف کی تولیت منclarی
وراثت کا حکم، املاک میں باقی نہیں رہتا۔ وَاللَّهُ أَعْلَمْ۔

هذا اخر ما درنا ایرادہ فی هذالكتاب والله

الموفق وهو المستعان

ضمیمه

فقیر العصر حضرت مفتی محمد حمزہ صاحبے، دامت برحماتہم علامہ دیوبند میں اسی وقت سندھ کی جیش رکھتے ہیں۔ شوریٰ کی شرعی جیشیت، بحق حضرت زید مجوم کی معاشرے اور اصلاح کے بعد حدیث ناظرین کی چار ہوڑتے، آخر میں منصب معلوم ہوا کہ حضرت موصوف کا ایک فتویٰ ملی ضمیمہ کو طور پر شائع کر دیا جائے ہے، یہ فتویٰ میں دیگر اپنا تکفیر اس کے مشتمل اجزاء کو جیش موضع پر منتظر ہیں اسیلے انشاء اللہ اسر فتویٰ کی روشنی میں زیر بحث موضع کو گھمنا آنکھوں کا

الستقیع

بِاسْمِهِ تَعَالَى

حضرت والا ! دامت برکاتہم - سلام مسنون

ہمارے یہاں کئی سال ہوئے چند اہل خیر حضرات نے مسلم بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے مدرسہ قائم کرنے کا مشورہ کیا اس پر تفقی ہو کر کام شروع کر دیا گیا، زمین حاصل کی گئی، چندہ جمع کیا گیا، نقشہ میوپسٹی سے منظور کر کے تعمیر شروع کر دی گئی، اللہ تعالیٰ نے مرد فرمائی مدرسہ بن گیا، اس کی ضروریات (دارالاقامہ و مطبع و غیرہ بھی) فی الجملہ تیار ہو گئیں، یہ سب کام مجلس تنظامیہ کے تھے اور یہ طے پایا کہ مدرسہ کیلئے اساتذہ اور دیگر ملازمین کا تقرر و عزل و نصب اور ان کی تخلیقا ہوں کا اور عہدوں کا تعین وغیرہ

تمام چیزیں مجلس انتظامیہ کیا کرے گی، مجلس انتظامیہ میں اکثر اہل علم میں بعض غیر عالم میں تعمیر و غیرہ کی دیکھ بھال کرنے ہیں مگر سب اہل فہم و اہل مدین ہیں، اساتذہ و ملازمین کا تقریر ہو گیا، طلبہ داخل ہوئے اور تعلیم شروع ہو گئی، مدرسے متعلق ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی، مسجد کے لئے ایک امام صاحب کو رکھا گیا، ایک صاحب کو مدرسے کا مستحب تجویز کیا گی، مستحب صاحب کو تمام حسابات آمد و خرچ درست رکھنے کا ذمہ دار بنایا گیا مجلس انتظامیہ کا ہے گا ہے (عامۃ تین ماہ گذرنے پر) حسابات کی جانچ کرتی رہی اور مدرسے کیلئے جائیداد خرید کر اور وقف دے کر آمدنی کی صورت میں پڑھاتی رہی، مستحب کی کوتا ہیوں پر حسن ادب کیساتھ توجہ دلاتی رہی مگر مستحب صاحب نے کوتا ہیوں کی اصلاح نہیں فرمائی جس سے نظام متاثر ہوا بار بار توجہ دلانے پر مستحب صاحب نے اپنا رخ بدلا اور فرمایا کہ میں مختار کل ہوں، آپ لوگوں کی حیثیت تو صرف مشیر کیا ہے میرا دل چا ہے تو کسی بات میں مشورہ کروں نہ دل چا ہے تو مشورہ نہ کروں، اور بھرپور بھی ضروری نہیں کہ میں آپ کے مشورہ پر عمل کروں، آپ بحث یہ شروع ہو گئی کہ صاحب اختیار مستحب صاحب ہیں کہ جس کو چا ہیں ملازم رکھیں جس کو چا ہیں الگ کر دیں، یا مجلس انتظامیہ جس کو مشیر یا مجلس شوریٰ بھی کہا جاتا ہے۔

ادھر مسجد کے امام صاحب نے بھی فرمایا کہ امام پر نکتہ چینی کرنے کا کسی کو حق نہیں، نہ از پڑھانے والا صرف ایک شخص ہوتا ہے جو کو مصلحتی پر کھڑا ہوتا ہے وہی امام ہے بقیہ سب لوگ ارکان شوریٰ وغیرہ مقتدی ہیں سب امام کی حرکت و سکون کے تابع ہیں، کسی کو اختلاف کرنے کا حق نہیں ہے، اگر امام نماز میں غلطی

بھی کرتا ہے تو اس میں بھی امام کا اتباع لازم ہے۔ اگر امام میں کوتا ہی ہو تو اس کو بھی برداشت کرنا ضروری ہے۔

ہشتم صاحب اور امام صاحب نے مل کر ایک مقالہ تیار کیا جس میں اپنا اقتدار اعلیٰ ثابت کیا ہے اور سب کو اپنے کامیابی، اتحاد اور تابع قرار دیا مقالہ طویل ہے اس میں خیر دین سیکو اربعہ ددراہن کا، گروہ بھر مشاہ و دیسل یا ہے متابکلکٹر ایک ہوتا ہے اور تمہارا مضمون اسے آئتا ہے اور تابع ہوتے ہیں گوئیں ایک ہوتا ہے اشتر ایک ہوتا ہے دزیراعظہ ایک ہوتا ہے دغیرہ دنیرو ان مشاہوں کو بطور دیلیں بیان کیا ہے ان کے متعلق تو ہمیں کچھ نہیں پوچھنا کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ مثالیں شرعی سائل کی بنیاد نہیں ہے حکومت نے کہی یہ دعویٰ کیا ہے کہ بھارتی حکومت شرعی حکومت ہے بلکہ وہ تو بار بار اعلان کر کی ہے کہ یہ لادینی حکومت ہے، جو شخص لادینی نظام پر دینی نظام کو قیاس کرنا چاہے فناہر ہے کہ اس سے زیادہ لغویت کیا ہوگی۔ اس کے جواب کی تو ضرورت نہیں کیونکہ کوئی مسجدوار آدمی اس مخالفت میں نہیں آیے گا۔ البتہ مقالہ کے بعض مندرجہ امور سے شبہ ہوتا ہے ان کے متعلق دریافت کرنا ہے۔

① گھر کا امیر اپ ہوتا ہے اولاد سب تابع بوقت ہے، اولاد کو یہ کہنے کا کام حق نہیں کرہم کاتے ہیں آپ بھارتے تو کوئی کی حیثیت سے رہنے گھر کی خدمت انجام دیجئے اور جو کچھ ہم اس کے معاوضہ میں دیں یہ کہا یا کہجئے۔

② حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہم امور میں حسب ارشاد باری تعالیٰ

صحابہ سے مشورہ کیا پھر جو کچھ شرح صدر ہوا اس پر عمل کیا صحابہ کی رائے یا ان کی کثرت رائے کے پابند نہیں ہوئے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے مشورہ کیا آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے سلسلہ میں مگر ملائکہ کی رائے کے خلاف عمل کیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایمیر مجلس شوریٰ کا پابند نہیں۔

(۲) کیا ایمیر کی اطاعت ہر کام میں لازم ہے جبکہ وہ معصیت نہ ہو
کیا ایمیر کی کسی غلطی پر توجہ دلانا شرعاً حرام اور بغاوت ہے۔

(۳) کیا ایمیر پر اعتراض کرنے والا اور اس کی رائے سے اختلاف کرنے والا واجب القتل یا مستحق قتل ہے، اسلاف میں اس کے کچھ نظائر ہوں تو پیش فرمائیں۔

(۴) ہم تم صاحبِ یہ بھی فرمایا کہ نسختم کی حیثیت سلطان وقت کی ہے کہ اس کو پورے اختیارات حاصل ہیں البتہ اسکے پاس فوج، پولیس، خزانہ نہیں ہے اس لئے وہ شرعی سزا نہیں دے سکتا، اس حد تک وہ سلطان معمور ہے کیا امام نماز کے لئے بھی ایسا ہی اقتدار ہے کہ مقتدی اس کی تمام غلطیوں میں اتباع کرنے پر مجبور ہے۔

(۵) اگر مقتدی امام صاحب کی غلطیوں کی وجہ سے ان کے کچھ نماز پڑھنے سے اخوش ہوں تو ایسی حالت میں امام صاحب کا جرأت نماز پڑھانا اور کہن کہ مجھے کوئی الگ نہیں کر سکتا یہاں تک درست ہے۔

(۶) کیا کثرت رائے کسی عالت میں بھی معتبر نہیں اور یہ غیر دینی طریقہ ہے اس

پر عمل کرنے سے گناہ ہوگا

(۱۱) امام صاحب، مہتمم صاحب، ملازم صاحب، کو کسی بھی حالت میں بر طرف کیا جاسکتا ہے یا وہ ہر حالات میں اپنے عہدوں پر تابیخات برقرار و تنخواہ دار رہیں گے۔

(نوٹ سے) سوالات طویل ہو گئے مگر امید ہے کہ ہماری مجبوری کو زنفر رکھتے ہوئے مدلل مفصل جوابات تحریر فرمائیں گے، ان اطراف میں مہتمم ناخلب کے اس مقالے سے بڑا خلفتار ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو جزاً نے خیر دیتے ہیں۔

والسلام

مسعود عالم

الجواب و اللہ الہادی الى الصواب

محترمی و علیکم السلام و رحمۃ اللہ و برکاتہ
خمدۃ و نصلی علی رسول الکریم۔

۱

باب سے متعلق یہ خیال اور قول صحیح ہے، باب کا درجہ بنتیت ہے، مشدود آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت کا حکم فراتے ہوئے وَاللَّذِينَ كُلُّ شَأْنٍ أَعْتَدْنَا لَهُمْ^۱ کا بھی حکم فرمایا ہے جیسے و قضی ربلقۃ ان لَا تَعْجِدُ دِيَالًا إِنَّا هُنَّ بِاللَّذِينَ احْسَنَاهُمْ نیز صدیث شریف میں ہے انتہو مقالک لَوَاللَّذِي كَانَ مُشْكُورًا^۲ اور فقیر نے لکھا ہے کہ اگر ایک شخص نے ایک دُکان شروع کی پھر اس کا

بیٹا بھی اس میں کام کرنے لگا جس سے ترقی ہوئی، پھر باپ بڑھا ہو گیا کام کے قابل نہیں رہا تو بیٹا نہیں کہہ سکتا کہ میں دکان کا مالک ہوں یا اس میں شریک و حصہ دار ہوں کیونکہ میری محنت سے ترقی ہوئی ہے، بلکہ وہ دوکان باپ کی ملکیت ہوگی اور بیٹا معاون شمار ہو گا، نیز بیان کیا ہے کہ بیٹے کے لئے جائز نہیں کہ باپ سے ملازم کی طرح خدمت لے کر یہ احترام والد کے خلاف ہے، لیکن اس سے مسئلہ ہتم پر استدلال کرنا غلط اور مغایط ہے کیونکہ باپ تواصل ہوتا ہے اور اولاد اس کے ذریعہ وجود میں آتی ہے دو اولاد کی پردوش کرتا ہے تعلیم و تربیت کرتا ہے۔

درسہ میں شوریٰ کا وجود منصب پہنچے ہے اس نے اپنہاں کا منصب تجویز کیا اور مستہم صاحب کو لا کر بٹھایا اور ان کے لئے تخواہ تجویز کی، پس مستہم درسہ اور شوریٰ کا حال باپ اور اولاد کے حال سے بالکل برکھس ہے۔

۲

حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے رسول اور موید بالوحی ہوئے کے باوجود حکم خداوندی دشادرهم فی الامر کے تحت اہم امور میں صحابہ سے مشورہ بھی فرمایا اور فرقاً ذاعزمت فتوکل علی اللہ کے تحت شرح صدر پر عمل بھی فرمایا اور بعض مواقع میں اپنی رائے عالی کو صحابہ کی دلخواہ کے پیش نظر ترک بھی فرمایا غزوہ احمد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے مدینہ طیبہ سے باہر بارہنگ کرنے کی نہیں تھی مگر شہادت کے شوقین صحابہ کی رائے کو اختیار فرمایا غزوہ خندق کے موقع پر اپ کی رائے منساقحت کی تھی مگر انصار کے دو قبیلوں

کے سرداروں کی رائے نہیں ہوئی، آپ نے ان کی رائے کو قبول فرمایا۔

من قال لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ كَعْدَتْ كَلْمَةٍ جَنْتَ كَلْمَةً خُوشَجَرِيَ سَانَةً كَمَا وَاسَطَ حَضْرَتْ
ابو ہریرہؓ کو نعلین شریفین فے کر بھجا لیکن حضرت عمرؓ کی رائے نہیں ہوئی، آپ نے
اپنی رائے عالی کو ترک فرمادیا، یہ سب واقعات کتب احادیث صحاح میں صاف
ساف مذکور ہیں، ظاہر یہ ہے کہ ان موقع پر صحابہؓ کی رائے پر شرح صدر اور
عزم ہو گیا بنی کام مقام اتنا بلند ہے کہ وہاں غلط چیز پر شرح صدر نہیں ہو سکتا
کیونکہ وحی الہی عاصم و محافظ ہے۔

یکن مجلس شوریٰ اور مسلم کو اس پر قیاس کرنا غلط در غلط ہے، صحابہؓ کرام
رضی اللہ عنہمؓ کو رفع مقامات آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم و تزکیہ اور
فیض صحبت کی بدولت حاصل ہوئے یتلو علیہم رأیتہ وینزکیھو و یعلیمہو
الکتاب والحكمة صحابہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب رسالت نہیں
دیا بلکہ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ پھر مسلم کے منصب اہتمام کو جو کہ شوریٰ
کا دیا ہوا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب رسالت پر کیسے قیاس کیا جاسکتا
ہے، استغفار اللہ العظیم۔

(۲)

جماعت ملائکر کے لئے مجلس شوریٰ کا القتب بڑا عجیب لقب ہے، اور
آیت قرآنی دا ذ قال ربک للملائکة انی جاعل فی الارض خلیفہ، کام طلب
مشورہ طلب کرنا عجیب در عجیب ہے، زیہاں شوریٰ ہے نہ مشورہ ہے لہذا
یہ نتیجہ نکالنا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ملائکر کی شوریٰ کے پابند نہیں اسی طرح مہتم

بھی مدرسہ کی شوری کا پابند نہیں بالکل بے محل ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر اپنا خلیفہ بھیجنے کیلئے ملائکہ سے اپنا رادہ ظاہر فرمایا کہ جس طرح دیگر کائنات سے متعلقہ خدمات ملائکہ کے پسروں میں اس خلیفہ سے متعلقہ خدمات ہیں ان کے پسروں کی جانبیں گی ملائکہ کو تخلیق آدم کی حکمت کا علم نہیں تھا اس لئے انہوں نے اپنے منصب سے بڑھ کر بات کی جس پر ان کو جواب دیا گیا اذن علوم مکاہ تعلموں پھر انہوں نے اعتراف قصور کیا۔

حق تعالیٰ خاتی ہیں، ملائکہ مخلوق ہیں، خالق کو مخلوق سے مشورہ لینے کا کیا محل ہے، اللہ پاک کا علم ذاتی ہے، ملائکہ کا علم حصولی (اللہ تعالیٰ کا دیاموا) ہے پھر وہاں مشورہ کی کیا گنجائش ہے، ملائکہ کو ملائکہ اللہ نے بنایا، اللہ تعالیٰ کو واللہ تعالیٰ ملائکہ نے نہیں بنایا کیا مدرسہ کے ستم اور شوری کا بھی یہی حال ہے نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔

(۲)

امیر (سلطان) کی اطاعت واجب ہے جب کہ موافق شرع ہو
معصیت نہ ہو امر السلطان ینفذ اذا وافق الشرع والاعلافا . اشباه
من القاعدة الخامسة و فوائد شتى فلوامر قضاته بتحلیف الشهود
وجب على العلماء ارجون صحوى ويقولوا الله لا تكفل قضاتك الى امر
يلزم منه سخطك او سخط المخالف ام در فختار وفي ط عن الحموي
ان صاحب لبع ذكر ناقلا عن امتهنا ان طاعة الامام في غير معصية

واجبہ فلوا مر بصوم یوم و جب اہشافی میں ۲۲ میکن اگر اکثر کے نزدیک
امام کی رائے میں ضرر ہو تو اکثر کی رائے کا اتباع کیا جائے قال فی الملحق و
ینبغی للاما مان یعرض الجیش عند خول دار الحرب یعلو الفارس
من الرجال قال فی شرحہ و ان یکتب اسماء ہم و ان یوم علیهم من کان
بصیرا بامر الحرب و تدبیرها لوم من المولی و علیهم طاعته لان خالفۃ
الامیر حرام الا اذا اتفق اکثر انہ ضرر یتبع اہشافی میں ۲۲۔



نہ بغاوت ہے نحرام ہے بلکہ ضرر سے بچانے کیسے خواہ ضرر دیوی ہو
یا اخروی امیر کو نصیحت کرنا علماء کے ذمہ واجب ہے جیسا کہ میں گذر را —
وجب على العلماء ان ینصحوا اه



عَزَّ حَذِيفَةُ زَيْدٍ قَالَ قَلْتَ يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّكَ أَنْتَ بَعْدَ هَذَا الْخَيْرِ
شَرِّ كَمَا أَنْ قَبْلَهُ شَرٌ قَالَ نَعَّمْ قَالَ فَمَا الْعَصْمَةُ قَالَ السَّيْفُ قَلْتَ وَ
هَلْ بَعْدَ السَّيْفِ بَقِيَّةٌ قَالَ نَعَّمْ تَكُونُ امَارَةً عَلَى أَقْلَاءِ دَهْدَنَةٍ عَلَى
دَخْرِ قَلْتَ ثُوْمَادًا قَالَ ثُرِيَّنْ شَادِعَةُ الصَّلَالِ فَإِنَّ اللَّهَ فِي
الْأَرْضِ خَلِيفَةٌ جَلَدَ ظَهِيرَكَ وَأَخْذَ مَالَكَ فَاطَّعَهُ وَلَا افْتَدَ وَانتَ
عَدُّهُ عَلَى جَذْلٍ شَجَعَةٍ الْحَدِيثِ اه اس کی شرح مرقاۃ میں ۱۲۲ میں ہے ایک
ہی شخص کو ایک وقت رفع شرکیتے سیف (قال) کا حکم دیا اور دوسرے وقت
میں جسمانی و مالی اذیت و ظلم کو برداشت کرتے ہوئے اطاعت امیر خلیفہ کا حکم دیا

نیز مکمل حق عند سلطان جائز کو افضل الجہاد قرار دیا، کذا فی شرح الجامع الصغیر مولیٰ
 چند واقعات دا قول امراء (خلفاء) کے نقل کئے جاتے ہیں، جن
 سے معلوم ہو گا کہ امیر کی رائے سے اختلاف اور امیر پر اعتراض کی ان کے پہاں
 کیا سزا اور کتنی قدر تھی۔ سب سے اول اور سب سے افضل خلیفہ حضرت ابو بکر
 صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جب وہ خلیفہ ہوئے تو خطبہ دیا اور فرمایا شوت تکلو
 ابو بکر فحمد اللہ و اثنی علیہ شوقال اما بعد ایہا الناس فانی قد
 ولیت علیکو ولست بخیر کوفان احسنت فاعینو فی وان اسات
 فقومونی ه تاریخ الخلفاء وہ فاذا رأیتمو فی استقامت فاتبعونی دا ذا
 رأیتمو فی زعمت فقومونی اه تاریخ الخلفاء مت یعنی اگر میں سیدھا سیدھا
 چلوں تو میرا تبع کرو اور میری اعانت کرو۔ اگر میں ٹیڑھا پن اختیار کروں تو
 (اس میں میرا تبع مت کرو بلکہ) مجھے ہی سیدھا کرو۔

اس کا ارشاد سے امام مالک نے نتیجہ نکالا قال مالک لا یکون احد
 اماماً ابداً الا على هذ الشرط اوه تاریخ الخلفاء کوئی شخص کسی بھی امام نہیں
 بن سکتا مگر اسی شرط کے ساتھ رجو خلیفہ اول نے بیان فرمائی (خلیفہ ثانی حضرت
 عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا لَا تزید و اني ملهم النساء على اربعين
 اوقية فمن زاد القيمة الزيادة في بيت المال فنالت امرأة ما زالت
 اليك قال ولم قالت لان اللہ يقول و آتيدت احدهن قنطرارا فقال
 عمرة امرأة اصابت و رجل أخطأ امه مرقاة المفاتيح ج ۲۴ ص ۱۷۱ ایک
 عورت نے امیر المؤمنین کی رائے سے اختلاف کیا اس کی قدر فرمائی عتاب نہیں فرمایا۔

عَزَّاجِی وائل قال جلست مع شیبه علی الكرسی فی الكعبۃ فقال
لقد جلس هذہ المجلس عمر فقال لقد حممت ان لا ادع فیها صفراء
ولا بیضا، الا قسمتہ قلت ان صاحبیک لعی فعلاً قال هما امر آن
افتدى بهما - بخاری شریف باب کسوة الکعبۃ ۲۲ - یہاں بھی کوئی عتاب
نہیں فرمایا بلکہ اپنی رائے کو ترک فرمایا -

وَعَزَّ شَوَّالَ الْكَنْدِیَ ان عَمَرَ بْنَ الْخَطَّابَ كَانَ بَعْسًا بِالْمَدِینَةِ
مِنَ الظَّلَلِ فَسَمِعَ صَوْتَ رَجُلٍ فِی بَيْتٍ يَتَغَنَّی فَتَسْوَرَ فَوُجِدَ عَنْهُ مَرْأَةٌ
وَعِنْدَهَا خَمْرٌ فَقَالَ يَا عَدُواَ اللَّهِ أَظْنَنْتُ أَنَّ اللَّهَ يُسْرِكُ وَأَنْتَ عَلَىٰ
مُعْصِيَةٍ فَقَالَ وَأَنْتَ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ لَا تَعْجَزْ عَنِّي نَأْكُنْ عَصِيَّتِ اللَّهِ
وَاحِدَةٌ فَقَدْ عَصَيْتِ اللَّهَ فِي ثَلَاثَةِ، قَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ لَا تَجْحِسْ سَوَادَ قدْ
تَجَسَّتْ وَقَالَ وَأَتَوَ الْبَيْوَتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَقَدْ تَسْوَرَتْ عَلَى دَخْلَتِ
عَلَى بَغِيِّ رَأْذَنَ وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَىٰ لَا تَدْخُلُ خَلْوَابَيْوَتَ غَيْرَ بَيْوَتِكُو حَتَّىٰ
تَسْتَلِذَنَسُوا وَتَسْلِمُوا عَلَىٰ أَهْلِهَا، قَالَ عَمَرٌ فَهَلْ عَنْدَكُمْ مِنْ خَيْرٍ
عَفْوٌ عَنْلَمَيْ قَالَ نَعَمْ فَعَفَعَ عَنْهُ وَخَرَجَ وَتَرَكَهُ أَدْهَمَ اَذْلَالَ الْخَفَافَ ۲۳
وَدِیْکَیْسَے یہاں نہ صرف اختلاف کیا بلکہ کتنی سخت گرفت کی یکن حضرت عمر نے
سزا نہیں دی - خلیفہ ہونے کے بعد خطبہ دیا، اسی خطبہ میں فرمایا -

دَرْوِیْ اَنْهَ قَالَ يَوْمًا عَلَىٰ الْمِنْبَرِ يَا مَعَاشِ الرَّسُولِ مَا ذَا تَقُولُونَ
لَوْمَلَتْ بِرَاسِيِ الْدُّنْيَا كَذَا وَمَيْلَ رَأْسَهْ فَقَالَ مَالِيْهِ رَجُلٌ فَاسْتَلَ سَيفَهُ
وَقَالَ اَجْلَ كُنْتَا نَقْوِلَ بِالسَّيفِ كَذَا وَاَشَارَ إِلَىٰ قَطْعَهِ فَقَالَ اَبَا اَیِّ

تعنی بقوله قال نعم ایاک اعنى بقولی فنہ عمر ثلثا و ہو یہ نہ
عمر فقال عمر رحمک اللہ الحمد للہ الذی جعل فی رعیتی من اذَا
تَوَجَّتْ تَوَمَّنی - ازالۃ الخفاء مترجمہ چہارم مترجم -

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن ممبر پر ارشاد فرمایا، ائمہ مسلمانوں کے
گرد ہو! تم کیا کرو گے اگر میں اپنا سرد نیا کی طرف جھکا لوں۔ اس طرح۔ اور
اپنے سر کو جھکایا۔ ایک شخص کھڑا ہوا اور توار کھینچ کر بولا کہ ہاں پھر ہم اپنی
تلوار سے اس طرح کر دیں گے اور گردن کاٹنے کا اشارہ کیا، حضرت عمر رضی اللہ
عنہ نے فرمایا (استخانا) کیا تو اپنے قول سے مجھے ہی مراد لے رہا ہے، اس نے کہا
ہاں، میں اپنے قول سے آپ ہی کو مراد لے رہا ہوں حضرت عمر نے اسکو شیش
مرتبہ جھڑ کا دہ حضرت عمر کو جھڑات کر رہا اسکے بعد حضرت عمر نے فرمایا۔
اللہ تعالیٰ پر رحم کرے۔ اللہ کا شکر ہے جس نے میری رعیت میں ایسے شخص
کو رکھا کہ اگر میں ٹیڑھا ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دے۔

قال عمر رضی اللہ عنہ فی مجلس فیہ المهاجرین والانصار اراثتیم لو ترخصت
فی بعض الامور ما ذا کنتم فاعلین فسکتنا فقال ذلك مرتبین او ثلثا
لو ترخصت لکو فی بعض الامور ما ذا کنتم فاعلین قال بشربن سعد
لو نعلت ذلك لقومنا تقویوالقدح فقال عمر ما انتم اذَا انتم
ازالۃ الخفاء مترجمہ چہارم مترجم -

حضرت عمر نے خلیفہ ہوتے ہی ما اجازت دی کہ میری جوبات قابل
اعتراض ہو سردار مجھے لوک دیا جائے، آپ کی طرف سے اعلان دیا گیا کہ

احب الناس الى من رفع الى عيوبى يعني سبب زيارة میں اس شخص کو پسند کروں گا جو میکرے عيوب پر مجھے اطلاع دے اس کے بعد ادنی ادنی لوگوں نے سر دبار آپ پر نکتہ چینی شروع کی، اگرچہ وہ نکتہ چینی غلط ہوتی تھی مگر آپ اس پر خوش ہوتے تھے اور بڑی توجہ سے سنتے تھے اور اس کا جواب دیتے تھے امیر سیرت فاروق اعظم ۱۵۔

آپ خطبہ پڑھنے کیلئے تشریف لائے تو حضرت سلام فارسی نے ٹوکا۔

اتت بِرُودْ مِنَ الْيَمَنِ إِلَى عَمْرِبِنِ الْخَطَابِ فَقَسَّمَهَا بَيْنَ أَصْحَابِ سَوْلِ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِرْدًا بِرْدًا شَوَّصَدَ لِمَنْبِرِ يَوْمِ جَمِيعَةٍ فَخَطَبَ النَّاسَ
فِي حَلَةٍ مِنْهَا وَالْحُلَّةِ عَنْدَ الْعَرَبِ تُبَيَّانٌ مِنْ جَنْنٍ وَاحِدٍ وَكَانَ ذَلِكَ
مِنْ أَحْسَنِ زِيَّهِمْ فَقَالَ إِلَّا اسْمَعُوا، ثُمَّ وَعَظَ النَّاسَ فَقَامَ سَلَامٌ فَقَالَ
وَاللَّهِ لَا نَسْمَعُ وَاللَّهِ لَا نَسْمَعُ قَالَ وَمَاذَا الْكَوْ قَالَ أَنْكَ اعْطَيْتَنَا تُبَيَّانًا شَوَّبًا
وَرَحْتَ فِي حُلَّةٍ فَقَدْ تَفَضَّلْتَ عَلَيْنَا بِالدُّنْيَا، فَتَبَسَّرْتُ شَوَّقَالْ بَعْلَتْ
يَا بَاعْدَ (اللَّهُ رَحْمَنُ اللَّهُ) أَنِّي كُنْتُ غَسَلْتُ تُبَيَّنَ الْخَلْقَ فَاسْتَعْرَتْ
بُرُودْ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَمْرٍ فَلَبِسْتَهُ مَعْبُرَدِي فَقَالَ سَلَامٌ إِلَآنْ نَسْمَعُ -

(ازالله الخفاء ۱۲ جلد چہارم مترجم)

قَالَ أَبْنَ عَوْنَ حَانَ الرِّجْلَ يَقُولُ الْمَعَاوِيَةُ وَاللَّهُ لَتَسْتَقِيمَنَ بِنَا يَا
مَعَاوِيَةً أَوْ لَنْقُومَنَكَ فَيَقُولُ بِمَاذا فَيَقُولُ بِالْخَشْبِ فَيَقُولُ أَذَا نَسْتَقِيمَ
تَارِيَخُ الْخَلْفَاءِ ۱۲۰ دِيْكَيْهَ حَفَرْتُ مَعَاوِيَةً كَوْ كَنَسْخَتْ كَلْمَهُ كَهَا مَگْرَأْخُونَ نَزَّ
كِيَا مَعَاوِيَةَ کِيَا۔

یزید کو جب ولی عہد بنلئے کا قصہ پیش آیا، حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر اور حضرت عبدالرشد بن عمر سے گفتگو کے بعد حضرت عبدالرشد بن زبیر کا نمبراً یا شر ارسل الی ابن الزبیر فقال یا ابن الزبیر اماماً نت شلب راغ علماء خوج من بھر دخل فی آخر و انک عمدت الی هذین الرجلین ففاختت فی منازھہا و جعلتهما علی غیر رائٹھا فقال ابن الزبیر ان کنت قد ملت الامارة فاعتز لها و هلم ابنک فلنبايعه ارأیت اذا بايعدت ابنک معک لا بکما نسمع و نطیع لاتجتمع البعثة کما ابدل ام - تاریخ الخلفاء ۱۵۵

غور کیجئے اور بخاریہ بن قدامہ کا کالم حضرت معاویہؓ سے کتنا سخت ہے اس کو بھی دیکھئے۔ فیھا ان قواشو السیوف الی لقیناک بھا بصفین فی ایدینا قال (معاویہؓ) انک لتهدد فی قال انک لو تمکنا قسرة و لم تتعنا عنزة و کننا عطیتنا عھودا و مواثیق فان وفیت لنا و فینا و ان ترغبت الی غير ذلك فقد توکنا و راسارجالاً مداداً و ادر عاشلدا و السنة حد ادا فان بسطت الینا ختما من عذر و لقنا اليك بیاع من ختر قال معاویہ لا اکثر اللہ فی امثالک ام - تاریخ الخلفاء ۱۵۳ -

یزید ان اقص ابو خالد بن الولید نے جو خطبہ دیا اس میں صاف صاف اعلان کیا فاں ارد تو بیعتی علی الذی بذلت لکھ فانا لکھ و ان ملت فلا بیعتی لی علیکو و ان رأیتم احداً فوی منی علیها فانا اول من بیاعیه و یہ خل فی طاعۃ واستغفرالله لی و لکم ام تاریخ الخلفاء ۱۹۲ -

دیکھئے ان اکابر اسلام کے پاس فوج اور پولیس بھی تھی بیت المال کا خزانہ بھی

تھا مگر اپنے سے اختلاف کرنے والوں اور اعتراض کرنے والوں کو قتل نہیں کیا ز قید کیا بلکہ غایت تحمل سے کام لیا اور تاکیدی اعلانات کئے کہ ہم سے جو کوتا ہی ہو جائے وہ بلا خوف ہمارے سامنے پیش کروتا کہ ہم اس کی اصلاح کریں۔ اگر اختلاف کرنے والے کو قتل کرنا واجب ہوتا تو یہ حضرات قدرت کے باوجود ترک واجب کا گناہ اپنے سرزنشتے۔

(A)

امام کا مقام بہت بلند ہے، اس کو حق جل شانہ کی بارگاہ میں اپنا نامہ نہ
بنانکر نماز ادا کی جاتی ہے وہ اعلیٰ صفات کے ساتھ متصف ہونا چاہئے، احکام
نماز کا وہاں سب سے زیادہ عالم ہو، قرآن کریم تجوید کے ساتھ صحیح پڑھنا ہو، سب
سے زیادہ متقنی ہو وغیرہ وغیرہ الحق بالامامة تقدیماً بمقابل نضبا الاعلم
با حکماً الصلوة بشرط اجتنابه للفواحش الظاهرة ثواب الحسن تلاوة
و تجوید اللقراء ثواب الاوصى ای الاکثر اتقاء للشبهات احمد در مختас
علی هامش رد المحتار (۲۶۳)

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ امام نے بھول کر غلطی کی توقیتی کو اس غلطی
میں بھی اتباع لازم ہوتا ہے تاکہ امام کی مخالفت فعلًا لازم نہ آئے مثلاً قنوت،
تکبرات العید، قندة اولیٰ سجدہ سہو، سجدہ تلاوت اگر امام ترک کر دے تو
مقدتی بھی اتباع امام میں ترک کر دے امام کی مخالفت نہ کرے تجب
متابعہ للإمام في الواجبات فعلًا وحداً وإن لزم من فعله
مخالفة الإمام في الفعل كترك القنوت أو تكبيرات العيد أو القندة

الاولی او سجود السهو والتلاوة فیترکہ الموعـالضامـ شامی ص ۲۱۶۔
لیکن ہر فلسطی کا یہ حکم نہیں ہے۔

جو امور بدعت ہوں یا مسروخ ہوں یا نماز سے ان کا تعلق نہ ہو اُنہیں
امام کا اتباع نہیں کیا جائیگا، مثلاً ایک سجدہ زائد کرے یا تکیرات عید میں اقوال
صحابہ پر زیادتی کرے یا نماز خازہ میں چار سے زائد تکبیر کرہے یا پانچ ہو تک رکعت
کے لئے بھول کر کھڑا ہو جائے تو ان صورتوں میں امام کا اتباع نہیں کیا جائیگا
وانہ لیس لہان یتابعہ فی البدعۃ والمسروخہ و مالا تعلق لہ بالصلوۃ
فلا یتابعہ لوزاد سجدة او زاد علی اقوال الصحابة فی تکبیرات العیدین
او علی اربع فی تکبیر الجنائزہ او قام الری الحامستہ اہ شامی ص ۲۱۶۔

سنن میں فعلاؤتر کا اتباع واجب نہیں مثلاً امام تکبیر تحریم کے لئے رفع
یدین ذکرے یا شنادرن پڑھے یا رکوع و سجود کے لئے تکبیر نہ کہے یا سبحان ربی
العظم اور سبحان ربی الاعلیٰ نہ پڑھے یا اسماع اللہ من حمدہ نہ کہے تو ان امور میں
امام کا اتباع واجب نہیں۔ وانہ لا تجب المتابعة فی السنن فعلاً و كذلك
ترک حافلہ یتابعہ فی ترك رفع اليدین فی التحریمة والثناء وتکبیر
الرکوع و السجود و التسبیح فیها و التسیع اہ شامی ص ۲۱۶۔ اگر امام
کسی واجب قولی کو ترک کر دے جس کے کرنے سے واجب فعلی میں مخالفت
لازم آتی ہو مثلاً تشهد، سلام، تکبیر تشریق کو ترک کر دے تو اس میں امام کا
اتبع نہیں کیا جائیگا و كذلك یتابعہ فی ترك الواجب القولي الذي
لایلزم من فعله المخالفۃ فی واجب فعلی اکال الشهد و السلام و تکبیر
الشریق اہ شامی ص ۲۱۶۔

ہر فرض میں اتباع امام کو کلیتہ فرض کہنا بھی صحیح نہیں، وکون المتابعة
فرضی الفرض لا یصم علی الاطلاق لما مرجویه من ان المسبق لوقام قبل تعود
اماقدرت الشهد فی الصلة تضم صلوٰتہ ان قراؤماً تجوز بہ الصلة بعد تعود
الامام قدر الشهد والا لامع انه لم يتابع في العدة الاخيرة فلو كانت
المتابعة فرضی الفرض مطلقاً بطلت صلوٰتہ اہ شافی م ۳۱۶۔



جس شخص کی امانت کو قوم ناپسند کرے اسلئے کہ اس میں خرابی ہے یا اس
سے زائد لائق امانت دکھنے کے آدمی موجود ہیں پھر وہ شخص جبرا امام بن کر نماز پڑھانے
تو اس کیلئے ایسا کرن کرده تحریکی ہے اسکی نماز مقبول نہیں۔ دلوام قوما و هوله
کار ہون ان اکراہتہ لفاذ فیہ او لانہم احق بالامامة منه کوہ له ذلك
تحریم الحدیث ابی داود لا یقبل اللہ صلوٰتہ من تقدیم قوما و هوله
سوار ہون اہ در مختار م ۳۶۷۔

قدر سنت سے قرات واذ کار کو طویل کرنا جو کہ قوم پر بار ہو کرده تحریکی ہے۔
ویکرہ تحیریات طویل الصلة علی القوم زاند علی قدر السنة فی قوله واذ کار اہ
در مختار م ۴۰۸۔ حضرت معاذ رضی عنہ عشار کی نماز میں قرات طویل کی ایک مقتدی نے نماز توڑ دی
معاملہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو امام صاحب ہی کو تنبیہ فرمائی فاقبل
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی معاذ قتل یا معاذ افتان انت اقرأ و الشمر و ضعها
والضھی واللیل اذا یغشی، سبھم اسورد بک الاعلى (متفق علیہ الحنفی) مکہ
یہاں سے قرات مستورہ کا ندازہ ہوا۔ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر شکایت کی کہ

فلان شخص صحی کی نماز طویل پڑھاتا ہے جس کی وجہ سے میں شرک نماز نہیں ہوتا
یہ شکایت سنکرایم پر بہت شدید عتاب فرمایا۔ عن قیس بن حازم قال اخبار بن
مسعود ان رجلا قال دا اللہ یار رسول اللہ ان کا تاخر علی صلوٰۃ الغداۃ من اجل
فلان ما یطیل بن افماریت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی موعدہ شد غضبا
من یومئذ ثوقاً از من کو منفیں فایکو ماصلی بالناس فلیت جو زمان فیہ
الضعیف والکبیر وذا الحاجة (متفق علیہ اؤ مشکوٰۃ شریف م ۱۱۷)

تمام عالی صفات کے باوجود اگر امام سے نماز میں غلطی ہو جائے خواہ سہوائی
ہواں سے کہتے ہیں کیا جائیگا بلکہ اس کو متینہ کیا جائیگا، اگر قرات میں
غلطی ہو جائے تو نماز کو فساد سے بچانے کیلئے لقمہ دیا جائیگا غلطی فاحش ہو جانے
کی صورت میں اعادہ نماز کا حکم ہو گا، اگر صلوٰۃ رباعی میں تیسرا رکعت پڑھ کر
بیٹھنے لگے تو اسکو یاد دلا کیا جائیگا کہ کھڑا ہو جائے، اگر چوتھی رکعت پڑھ کر کھڑا
ہونے لگے تو اسکو بھٹھا کیا جائیگا اگر وہ نہ بیٹھے تو اس کا اتباع نہیں کیا جائیگا
اگر امام سے سہوائی کوئی واجب ترک ہو جائے تو سجدہ سہو سے مرکافات کی جائیگی
اگر نماز میں واجب کا ترک ہونا یاد ہی نہ آیا یاقصد اسجدہ سہو نہ کیا یا عمداً واجب کو
ترک کیا تو اعادہ نماز کا حکم ہو گا۔ غرض اصلاح نماز کی کوشش میں امام کے
بلند درجات حائل وانع نہیں، حضرت بن اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول ہو گئی تو
مطلع ہونے پر مرکافات فرمائی نیز ارشاد فرمایا انما انا بشروم مثلکو انسی کیا نتسون
فاذا نسیت فذ کفر نی (متفق علیہ اؤ مشکوٰۃ شریف م ۱۱۸) یہ بھی حکم فرمایا کہ میرے قریب
اہل عقل و فہم کھڑے ہوا کریں (تاکہ اگر کوئی بات پیش آجائے تو نماز کو فساد سے

بچلنے میں سہولت رہے) یلینی منکو اولو الاعلام والنهی الا شافعی تھے۔ مسلمانوں میں دینی انحطاط بڑھتا جا رہا ہے، امامت کے اوصاف بھی کم ہوتے جا رہے ہیں، ایک مسئلہ بیان کرتے ہوئے فقیر ابواللیث سمرقندی رحمۃ اللہ کو لکھنا پڑا الجمل فی القراء غالب الخ۔ شافعی تھے۔ امامت کو بہت سے حضرات نے پیشہ معاش بنایا ہے متولی صاحبان بھی ان سے تابروں کی طرح معاملہ کرتے ہیں جو امام کم نرخ کا ملتا ہے اسکو رکھتے ہیں، مختلف علاقوں میں ااموں کی ذرا بھی عجیب عجیب دیکھنے میں آتی ہیں، اور ان کی امدنی کے شعبے بھی عجیب عجیب ہیں ایک امام صاحبؑ ملاقات کے لئے جانا ہوا ان کے مجرہ میں پانی کے متعدد گھڑے رکھے ہوئے تھے دریافت کرنے پر بتایا کہ محلہ کی مستورات جب ایام ماہواری سے فارغ ہوتی ہیں تو وہ پانی کا گھڑا امام صاحبؑ کے پاس بھیتی ہیں امام صاحب چند مخصوص آئیں اور سورتیں پڑھ کر اس پر دم کرتے ہیں۔ اس پانی سے مستورات غسل کرتی ہیں تب پاک ہوتی ہیں ہر گھڑے پر دم کرنے کا معاوضہ بھی بتا ہے، اگر امام صاحب سفر میگے ہوں توجہ تک وہ واپس آگر پانی پر دم نہ کریں تو وہ پانی غسل کیلئے کار آمد ہو گا وہ ماڑھور نہ بنیگا امام صاحب کے دم کرنی سے اس میں طہوریت کی صفت آئے گی، اس دم کرنے میں امام صاحب کسی کو اپنانا بھی نہیں بناتے اسلئے مستورات کئی کئی روز بلا غسل اور بلا نماز رہتی ہیں انا شر وانا الیہ راجعون — اہل محلہ کی میت کو غسل دینا، اس کی نماز پڑھانا اسکو قبر میں رکھنا پھر سوئم و چیلم وغیرہ یہ سب چیزیں امام صاحب ہی سے متعلق رہتی ہیں اور ان میں ہر کام کا معاوضہ بھی ہوتا ہے، مرغی بکری وغیرہ

ذنک کی جائے تو وہ بھی امام صاحب ہی ذبح کریں گے اور اس کا معاوضہ لیں گے
عید الاضحیٰ میں چرم قربانی اور عید الفطر میں صدقۃ الفطر میں امام صاحب ہی کا حق
سمجھا جاتا ہے۔

فاسق کو امام بنانا مکروہ تحریک ہے و اما الفاسق فقد علواً اکراہة تقدیمه
بانہ لا یہم بامر دینہ و بان فتقدیمه تعظیمہ و قد وحی علیم اهانتہ شرعاً
و کا یخفی انه اذا اصحاب اعلم من غيرہ لاذوا لعلة فانہ لا يوم عملیہ ان يصلی
بپھر بغير طهارة فلهم بالبتدع تکرہ امامتہ بكل حال بل مشی فی شرح
الملنیۃ علی ان گلہتہ تقدیمه کراہتہ تحومیم ما ذکرنا قال ولذالوجہ الصلة
خلفاء صلیاً مسند مالک و روایۃ عن احمد ارشادی م ۲۱۶۔

اگر کوئی غیر متینی، بے عمل، فاسق امام مسلط ہو جس کو الگ کرنے پر قدرت نہ ہو
تو مجبوراً اسکے پیچے نماز ادا کریں گا تاکہ جاعت ترک نہ ہو فی حدیث ابی هریرۃ
والصلة واجبة علیکم خلف کل مسلمو بر ایکا ز او فاجروا ان عمل لکبائر
(مشکوہ شریف مت) بعض صحابہ کرام نے حاجج کے پیچے ایسی ہی مجبوری میں نماز
پڑھی ہے۔

(۱۰)

اگر مجلس شوریٰ میں امام اور ستم کے انتخاب یا اعزل کا مسئلہ پیش
ہو اور اس میں اختلاف رائے ہو تو شرعی دلائل سے ترجیح دی جائے اگر دلائل
متساوی ہوں تو قرم اندازی کر لی جائے یا اہل علم کی کثرت رائے کو ترجیح دی جائے
بے علم اور بے عمل عوام کی کثرت سے عبور نہیں فان استو وايقع بین المستويين

او اخْيَارِ الْقَوْمِ فَانْ اخْتَلَفُوا عَنْ بَرَائَةِ الْكَثِيرِ وَانْ قَدْ مَوَاعِدُ الْأَوَّلِيِّ اسَاوَابِلا
اَشْرَادِ دِرْخَلَمِ ۚ ۝، فَانْ اخْتَلَفُوا فَالْعِبْرَةُ بِمَا اخْتَارَهُ الْاَكْثَرُ۔ قال في شرح
المشکوٰ نعْلَمْ مَحْوِي عَلٰى الْاَكْثَرِ مِنَ الْعِلْمِ اَذَا وَجَدَ وَاوَالاً لِفَلَاغْلَاءِ عِبْرَةٍ بِكَثْرَةِ الْحَاهِلِينَ
قال اَللّٰهُ تَعَالٰى وَكَرَّا لِكَثِيرٍ هُوَ لَا يَعْلَمُونَ اَمْ مُحْطَاطِي اَسَتَ؟ حضرت عبد الرحمن بن عوف ر
نے خلافت کیلئے چند حضرات میں سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اکثریت کی عدائے کے پیش
نظر انتخاب کیا جس سے پھر سب ہی نے اتفاق کیا۔ شروع بخاری، فتح الباری،
عمدة القاری وغیرہ میں تفصیل مذکور ہے۔ نیز سوال مسکن کے جواب میں امام سلطان
کی رائے کے خلاف کرنے کی مانعت کے ذیل میں شامی کی عبارت نقل کی گئی
بے الا اذا اتفق اکثرانہ ضرر فیتبع اع.

کثرت رائے کو اگرچہ وہ اہل علم اور اہل تدین کی ہو با اکل ناقابل اعتبار
قرار دینا اور یہ کہنا کہ یہ غیر دینی طریقہ ہے۔ غلط ہے، ایک مسئلہ میں اگر فقہاء کرام
کا اختلاف ہو تو دیگر وجہ ترجیح کے علاوہ اس کو بھی میان کیا گیا ہو۔ علیہ الْاَكْثَرِ عَلَاشَانِي
نے رو المختار، تنقیح الفتاوی الحامدية شرح عقود رسم المفتی میں اسکی تصریح کی
ہے، حدود کے اندر رہتے ہوئے اس پر عمل کرنا گناہ نہیں اور للاکثر حکم الکل تو
ایسا مشہور ہے کہ فقہاء نے جگہ جگہ اس سے استدلال کیا ہے۔

(11)

حضرت سعد بن ابی و قاص رضی اللہ عنہ کے گورنر تھے، عشرہ مشہرہ میں تھے
بہت قدیم الاسلام تھے، مستجاب الدعوات تھے، جنہوں نے نماز براہ راست حضرت
رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھی تھی، جنہوں نے کسری کو شکست دی، ملک

فارس کو فتح کیا، ان کی تسلیت کی گئی جس میں تھا کہ یہ نماز ٹھیک نہیں پڑھاتے اذ لا عیسیٰ یصلیٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود ان سے نماز کی کیفیت کو دریافت کیا اور سن کر فرمایا کہ میرا بھی یہی خیال ہے کہ تم اسی طرح پڑھاتے ہو گے (یعنی تسلیت غلط ہے) پھر آدمی کو کوڈہ بھیگر تحقیق کی تو سب نے ان کی تعریف کی مگر ایک شخص نے تسلیت کی، حضرت سعد رضی نے دعا کی کہ یا اللہ اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو اس شخص کے ساتھ ایسا ایسا ہو، چنانچہ اس کا بہت برا حال ہوا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تسلیت غلط ہونے پر بھی حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو معزول فرما دیا اور ان کی بلگہ حضرت عمار رضی اللہ عنہ کو متعین فرما دی، بنی اسرائیل شریف م ۱۰۲ میں یہ واقعہ مذکور ہے اور بھی متعدد مقامات پر اپنی عادت کے موافق امام بن حارثی نے اس کو بیان فرمایا ہے، جس نے جو عہدہ دیا تھا اسی نے والپس لے لیا، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بد عادی زان سے نمازی ہوئے ز کوئی احتجاج کیا کہ مجھے بلا قصور علیحدہ کر دیا، نظم میں کوئی فرق آیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی برارت بھی فرمادی کہ ان کا قصور نہیں تھا بلکہ مصلحت و انتظاماً علیحدہ کیا ہے، ازالۃ الخفا، م ۲۵ میں یہ صاف صاف مذکور ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علیحدہ کرنے کے لئے قصوٰ وار ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ مصلحت و انتظاماً بھی علیحدہ کیا جا سکتا ہے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو معزول فرمایا جس کی تفصیل ازالۃ الخفا، م ۲۳ میں ہے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عہدہ سپاپاری سے علیحدہ ہو کر بھی ناخوشی کا انتہا نہیں کیا بلکہ یہ فرمادی کہ میرا مقصود عہدہ نہیں بلکہ خدمت اسلام ہے، اب پاہی

جو کر خدمت کروں گا، اب جواہر المفہیہ میں متعدد فقہاء و قضاۃ کے متعلق لکھا ہے کہ ان کو فلاں عہدہ دیا گیا پھر معزول کر دیا گیا پھر عہدہ دیا گی۔

جب کہ باہم ملے کیا گیا کہ عزل و نصب مجلس انتظامیہ کے اختیار میں ہے تو جس طرح مجلس انتظامیہ نے امام صاحب، ستم صاحب، مدرس صاحب، ملازم مقام کو عہدہ دیا ان کے لئے تشوہ مقرر کی، کام پر کیا، اسی طرح مجلس انتظامیہ کو عہدہ واپس لینے اور معزول کر دینے کا بھی حق ہے مگر اس میں نفاذیت نہ ہو لٹیست ہوان کی خدمات اور وقار کا لحاظ رکھا جائے تذیل و تحریر ہرگز نہ کی جائے امام صاحب و ستم صاحب وغیرہ کو خود بھی علیحدہ ہو جانے کا اختیار ہے وہ بھی مجلس انتظامیہ کی تذیل و تحریر پر پورا پرہیز کریں، اجارہ کا معاملہ طرفین کی رضامندی پر ہوتا ہے ابتداء بھی بقاہ بھی اگر ماہن پر معاملہ ہوا ہے تو جو اس معاملہ کو ختم کرنا چاہے وہ ایک ماہ قبل اطلاع کر دے تاکہ طرف ثانی اپنا دوسرہ انتظام اگر لے، معاملہ ملازمت ختم ہو جانے پر بھی تعلقات میں ناگواری اور کشیدگی نہ ہونے پائے۔

اگر آپ پورا نفاذ ارسال کر دیتے تو ممکن ہے معلومات میں اضافہ ہوتا اور جواب کیلئے مزید بصیرت حاصل ہوتی۔

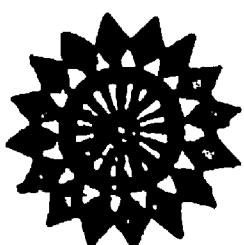
الیقاظ

جو شخص امارۃ کی حرص یا طلب کرے وہ اس کا مستحق نہیں عن ابی هریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ عن النبی صلوا اللہ علیہ وسلم قال

انکو ستر حرون علی الامارة وستکون ندامة یوہ القيمة فنعدت
المرضعة وبُست الفاطمة ام

عن ابی موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ قال دخلت علی النبی صلی اللہ علیہ وسلوٰنا و رحیلین من قومی فقال احمد الرجاین امرنا یا رسول اللہ و قال
الآخر مثلہ فقال انالا نولی هذامن سماںہا و کامن حرص علیہ اخ
(بغذری شریف ص ۱۰۵) امارت کی حرص و طلب کو ناپسند فرمایا اور اس کا
انجام قیامت میں خراب بتایا گیا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو عہدہ قضا
پیش کیا گیا مگر انھوں نے انکار فرمایا، اس کی سزا میں دس کوڑے روزانہ
لگتے تھے اور جیل میں ڈال کر زہر دے کر ان کو ختم کر دیا گیا مگر وہ اپنے
استقلال پر قائم رہے، عہدہ قضا قبول نہیں کیا رحمۃ اللہ تعالیٰ و رفع درجتہ
آمین فقط واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم۔

جرہ العبد محمود عفی عن
درسہ جامع العلوم کا پنور
باز جلوی اثنانیہ ۱۴۲۵ھ



مکارہ و مراجع

نمبر	اسم کتب	اسماء مصنفین	ولادت	وفات
۱	قرآن مجید	حضرت مولانا عبد اللہ سندي	۱۳۶۴ھ	.
۲	التمهید لآئۃ التجدید	حضرت مولانا عبد اللہ سندي	۱۳۶۵ھ	.
۳	اخبار الجمیعۃ اکتوبر ۱۹۲۹	حضرت مولانا عبد اللہ سندي	۱۳۶۵ھ	.
۴	احکام القرآن	ابو بکر احمد بن علی الجصاص رازی	۱۳۶۵ھ	۱۴۰۵ھ
۵	التفسیرات الاحمدیة	احمد بن شیخ ابو سعید معروف ملا جیون	۱۴۰۵ھ	۱۱۲۸ھ
۶	الاحکام السلطانیة	ابو الحسن علی بن محمد جیب البھری المادری	۱۴۰۵ھ	۱۳۶۵ھ
۷	اصول الفقہ	عبد الوہاب خلاف	۱۴۰۶ھ	۱۹۵۲ھ
۸	اصول الفقہ	شیخ محمد خضری بک	۱۴۰۶ھ	۱۹۲۶ھ
۹	احکام شرعیہ میں عالاً وزمانہ کی رعایت — مولانا تقی امینی ترکلہ العالی	ترکلہ	۱۴۰۶ھ	۱۴۰۶ھ
۱۰	الاعتصام	ابو اسحاق شافعی غزناوی	.	۱۴۰۶ھ
۱۱	البر الرائق	علاء مرذین العابدین ابن ابراہیم	.	۱۴۰۶ھ
۱۲	اصول الفقہ	المعروف به ابن نجم مصری	۱۴۰۶ھ	۱۴۰۶ھ
۱۳	البر الخیط	شیخ ابو زہرا مصری	۱۴۰۶ھ	۱۳۲۵ھ
۱۴	ابو داؤد شریف	ابو حیان الاندلسی	۱۴۰۶ھ	۱۴۰۶ھ
۱۵	ابو داؤد شریف	ابو داؤد سیمان بن اشعش سجستانی	۱۴۰۶ھ	۱۳۶۵ھ

نمبر	اسم کتب	اسم مصنفین	ولادت	وفات
۱۵	الاحن فی علوم القرآن	حضرت مولانا فتح محمد تائب لکھنویؒ	۱۲۳۵	۱۲۷۸
۱۶	المقدمة السنیة	مجد والف ثانی و شاہ ولی الشدید پلویؒ	۱۴۰۵	۱۱۶۷
۱۷	الواقفات	ابو اسحاق ابراهیم الشاطبی	۱۴۶۹	۱۴۶۹
۱۸	اعلام المؤقین	علام ابن قیم حنبعلؒ	۱۴۹۱	۱۴۵۱
۱۹	ازارۃ الحفاظ	شاہ ولی الشدید محدث دہلویؒ	۱۱۱۲	۱۱۶۴
۲۰	الفاروق	علامہ شبیلی نعماںؒ	۱۳۳۲	۱۳۳۲
۲۱	اسلامی مذہب	شیخ ابو زہرا، ترجمہ علام احمد حریری	۲۰۹	۲۶۳
۲۲	ابن ماجہ	ابو عبد الشہد محمد بن یزید ابن ماجہ قزوینیؒ	۱۳۸۷	۱۳۶۳
۲۳	الکرم الطیب	حضرت مولانا اشرف علی تحانویؒ	۹۲۶	۱۳۸۰
۲۴	الاشباء والمنظائر	علام زین العابدین ابن حییم مصری	۱۲۸۶	۹۲۶
۲۵	امداد القتاولی	حضرت مولانا اشرف علی تحانویؒ	۱۲۸۶	۱۳۶۳
۲۶	الاحکام السلطانية	قاضی ابو عیسیٰ الفرار	۱۳۸۷	۱۳۵۸
۲۷	بودار النواردر	حضرت مولانا اشرف علی تحانویؒ	۱۲۸۶	۱۳۶۳
۲۸	بيان القرآن	{	۱۲۸۶	۱۲۸۶
۲۹	بيان الشرفی	۰ ۰ ۰ ۰ ۰	۱۲۸۶	۱۲۸۶
۳۰	بخاری شریف	امام بخاری محمد بن اسْمَاعِيلؒ	۱۹۳	۲۵۶
۳۱	تفسیر بکیر	امام فخر الدین بخاریؒ	۵۳۶	۶۰۷
۳۲	تفسیر ابن کثیر	علوم الدین ابو الفداء اسماعیل بن عمر بن کثیرؒ	۶۰۰	۶۶۶

نمبر	اسائے کتب	اسائے مصنفین	ولادت وفات
۳۳	تفسیر الخاتم لاحکام القرآن	ابو عبد اللہ محمد الانصاری القرطبی	۱۹۴۱ء
۳۲	تفسیر النار	رشید رضا	۱۹۳۵ء
	و شیخ عبدہ		۱۹۰۵ء
۳۵	تفسیر الجواہر	اشیخ عبد الحکیم طنطاوی جوہری	۱۹۳۷ء
۳۶	تفسیر الکشاف	علام زمخشیری رابو القائم محمود بن عمر	۱۹۲۸ء
۳۷	تفسیر مظہری	محمد ث قاضی شاہ اشر پانی پی	۱۹۲۵ء
۳۸	تفسیر بیضاوی	عبداللہ ناصر الدین قاضی بیضاوی	۱۹۲۵ء
۳۹	تفسیر روح المکان	ابوفضل شہاب الدین سید محمد ناؤںی بندوقی	۱۹۲۶ء
۴۰	ترجمان السنۃ	علام بدرا عالم میر غوثی	۱۹۲۵ء
۴۱	تاریخ التشریع الاسلامی	علام خضری بک محمد بن عفیق	۱۹۲۴ء
۴۲	ترمذی شریف	امام ابو عیسیٰ ترمذی	۱۹۲۹ء
۴۳	تاریخ دارالعلوم	سید مجتبی رضوی	۱۹۶۹ء
۴۴	تاریخ الامم الاسلامیہ	محمد بن عفیق الخضری بک	۱۹۲۶ء
۴۵	تذکرة الرشید	مولانا عاشق الہی میر علی	۱۹۲۸ء
۴۶	جامع الرموز	شمس الدین محمد حراسانی فہستانی	۱۹۶۹ء
۴۷	حجۃ الشدابالغ	شاہ ولی الشہزادہ دہلوی	۱۹۶۷ء
۴۸	خلاصة الفتاویں	بحر العلوم فتح محمد لکھنؤی	۱۹۲۹ء
۴۹	دستور عیات	مولانا ابو الحسن علی ندوی مدظلہ	مذکوہ

نمبر شمار	اسم کتب	اسم مصنفین	ولادت وفات
۵۰	در رختر ار	علام محمد بن علی علاء الدین حسکفی دمشقی	۱۰۸۸ھ - ۱۰۲۵ھ
۵۱	زیل الجواہر	ملا علی قتاری	۱۰۱۲ھ
۵۲	رو المختار	سید محمد امین ابن عابدین	۱۲۹۷ھ
۵۳	رودار سال اول	دارالعلوم دیوبند	۱۳۸۳ھ
۵۴	سن المصطفیٰ	شیع ابو الحسن محمد بن عبد الهادی سندھی	۱۱۳۸ھ
۵۵	شیخ زادہ	غمی الدین محمد بن مصطفیٰ القوجی	۱۹۵۱ھ
۵۶	شرح عقود رسم لفتی	علامہ ابن عابدین دشائی	۱۲۵۲ھ
۵۷	شرح عفتائد	علام سعد الدین سعید بن عمر فضازان	۱۲۹۲ھ
۵۸	طبرانی	ابو اقسام سیدیمان بن احمد بن ایوب جمی طبرانی	۱۳۴۰ھ
۵۹	الطرق الحکیمة	علامہ ابن قیم	۱۲۵۱ھ
۶۰	عدۃ العفاری	علامہ بدر الدین عینی	۱۲۴۲ھ
۶۱	عطر پایہ	مولانا فتح محمد صاحب تائب لکھنؤی	۱۲۳۵ھ
۶۲	عنوان انقلاب	علامہ عبید اللہ سندھی	۱۳۴۳ھ
۶۳	فتاویٰ غلبیہ	حضرت مولانا خلیل احمد سہاپوری	۱۲۳۶ھ
۶۴	فتح الباری	علامہ حافظ الدین ابن حجر عسقلانی	۱۲۴۳ھ
۶۵	فیض الباری	علام سید محمد انور شاہ کشیری	۱۲۵۱ھ
۶۶	فتح الکریم	مولانا محمد شاہ صاحب سہنی	۱۲۹۲ھ

نمبر شمار	اسماً کے کتب	اسماً کے مصنفین	ولادت	وفات
۶۶	فوائد عثمانی	علامہ شبیر احمد عثمانی	۱۳۴۸ھ	۱۳۶۹ھ
۶۸	فتح القدر	علامہ ابن ہمام ^ر	۱۳۸۸ھ	۱۴۰۶ھ
۶۹	فتاویٰ عالمگیری	بادشاہ عالمگیر کے حکم سے مجلس اکابر		
۷۰	فتاویٰ وزار العلوم	علماء ہند نے اللہ عزیز مرتقب کیا		۱۴۱۸ھ
۷۱	فتاویٰ کفاية المفتی	معتوقیٰ دارالعلوم دیوبند	۱۳۶۲ھ	۱۳۷۲ھ
۷۲	قصص القرآن	معتوقیٰ کفاية المفتی	۱۳۸۲ھ	۱۳۸۲ھ
۷۳	قاسم العلوم	تعمیل انا حفظ الرحل بیو ہاروی ^ر	۱۳۹۶ھ	۱۳۹۶ھ
۷۴	کشف اصطلاحات الفنون الاسلامیة	تعمیل انا محمد قاسم نافوتی ^ر		
۷۵	کشف الاسرار	شیخ محمد علی تھانوی ^ر		
۷۶	کنز العمال	علامہ عبدالعزیز بخاری ^ر		
۷۷	كتاب الخزان	شیخ علی متقی		
۷۸	لمعات التنقیح	امام ابو یوسف یعقوب بن ابراهیم الکوفی ^ر		
۷۹	مشکوٰۃ شریف	شیخ عبد الحق محدث دہلوی	۱۰۵۲ھ	۱۱۸۲ھ
۸۰	موافق المسترشدین	شیخ ولی الدین غطیب عمری تبریزی ^ر	۱۳۴۳ھ	۱۳۴۳ھ
۸۱	سودہ دستور انسانی	علام عبد الشریعتی ^ر	۱۳۰۳ھ	۱۳۰۳ھ
۸۲	مقدمہ اعلاء اسنن	حضرت مولانا فاروقی محمد طیب صاحب ^ر	۱۳۱۰ھ	۱۳۹۵ھ

نمبر شمار	اسمائے کتب	اسمائے مصنفین	ولادت	وفات
۸۳	منهج السنۃ	علامہ ابن تیمیہ ر	۱۴۷۶ھ	۱۲۲۸ھ
۸۴	مناقب موفق	امام صدر الامر مکنی		
۸۵	مقام ابو ضیفہ	مولانا سر فراز خاں صدر پاکستان	۱۴۰۰ھ	۱۲۹۰ھ
۸۶	المبسوط	شمس الامر ابو بکر محمد بن احمد سرخسی	۱۴۲۵ھ	۱۳۰۰ھ
۸۷	جمع الزوائد	محمد علی بن ابی بکر بن سیدنا یحیی شافعی	۱۴۳۵ھ	۱۳۰۴ھ
۸۸	سنداحمد	امام احمد بن حنبل ر	۱۴۶۲ھ	۱۲۳۱ھ
۸۹	معارف القرآن	مولانا سعفی محمد شفیع صاحب	۱۴۳۶ھ	۱۳۱۴ھ
۹۰	ماہنامہ دارالعلوم دہلو	زیر ادارت مولانا جیب الرحمن ناسی	۱۴۷۶ھ	۱۳۷۰ھ
۹۱	محضر الوقایہ	تاج الشریعہ محمود ر		
۹۲	سنتہ المخلص	خاتم المحققین علامہ سید امین	۱۱۹۸ھ	۱۲۵۲ھ
		دابن عابدین (شای)		
۹۳	فاتی شریف	ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب خراسانی	۱۴۱۵ھ	۱۳۰۲ھ
۹۴	اسلام کاظم حکومت	مولانا حامد الانصاری غازی		مذکور
۹۵	ہرایہ اولین	امام ابو الحسن برہان الدین علی بن ابی بکر بن عبد الجلیل فرقانی ر	۱۴۵۵ھ	۱۴۹۳ھ

وَ الْحَمْدُ لِلّهِ أَكْلَدُوا خَرَا